قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in

اپریل 2014، قیمت -/15

ماہنامہ

اُردو دُنیا

دہلی

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

رسالوں کی دنیا اور اردو

ماہنامہ اردو دنیا دہلی

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:16، شمارہ:04، اپریل 2014

مدیر: ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین

نائب مدیر: ڈاکٹر عبدالحی

اعزازی مدیر: نصرت ظہیر

ناشر اور طابع:

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمہ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا

انڈسٹریل ایریا

فیز-II، نئی دہلی-110020

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ: محمد اکرام

ڈیزائننگ: منظر سبحانی

قیمت-/15 روپے، سالانہ -/150 روپے

■ اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

● ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغِ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا

جسولہ، نئی دہلی-110025

فون: 49539000

(شعبۂ ادارت: 49539009)

ویب سائٹ

http://www.urducouncil.nic.in

email: editor@ncpul.in

urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7

آر کے پورم، نئی دہلی۔110066

فون: 26109746

شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلیکس

بلاک نمبر5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002

فون: 24415194-040

مشمولات

اداریہ

ہماری بات 2

خطوط

آپ کی بات — قارئین کے خطوط 3

انٹرویو

نقش لائل پوری سے مکالمہ — اشتیاق سعید 5

کور اسٹوری

اردو رسالے اور اردو — نصرت ظہیر 8

رسالوں کی دنیا — سہیل انجم 11

ہندوستان میں غیرملکی اداروں کے اردو رسالے — شگفتہ یاسمین 15

ادب اطفال اور 'بچوں کی دنیا' — زرنگار 18

'بچوں کی دنیا' اور دوسرے رسالے — مشتاق کریمی 19

زبان و تعلیم

جامعاتی سطح پر اردو کی تدریس — صغیر افراہیم 20

جدید تکنیکی وسائل اور اردو زبان — مشتاق حیدر 23

ادبی مباحث

مثنوی اسرارِ محبت — سیدہ شان معراج 26

کنہیا لال کپور اور اردو زبان و ادب — سید عبدالکریم رضوان 28

امتیاز علی تاج کا ڈرامہ 'انارکلی' — عبدالسلام صدیقی 30

اردو میں طنزیہ ومزاحیہ کالم نگاری اور فکر تونسوی — محمد شمیم اختر 34

شخصیات

ارونا آصف علی: ایک عظیم شخصیت — شریف احمد قریشی 37

اختر اور ینوی کی افسانہ نگاری — شاہ نواز فیاض 39

خراج عقیدت

نصرت محی الدین — مسعود فضلی 41

خاموش طبیعت افسانہ نگار کی موت — رحمٰن عباس 43

مشاہیر ادب

علی جواد زیدی: فن اور شخصیت — ادارہ 45

انتخاب کلام علی جواد زیدی 47

ہماری مطبوعات

کیسے پڑھائیں اردو غیراردوداں طلبا کو — معین الدین 50

شہر بین

شہر آہن جمشید پور — نیاز احمد آسی 53

صحافت

تمل ناڈو میں اردو صحافت — سید سجاد حسین 57

صحت

خود کو صحت اور کامیابی سے ہمکنار کیجیے — شمس الاسلام فاروقی 61

کتابوں کی دنیا

تبصرہ وتعارف 63

قومی کونسل کی میٹنگ

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی XXI ویں میٹنگ کی روداد — ادارہ 72

خبرنامہ

اردو دنیا کی خبریں — ادارہ 77

ہماری بات

اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو رسالوں نے اردو زبان وادب کے ارتقا میں بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔ یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ اردو میں سیکڑوں کی تعداد میں رسائل شائع ہوتے ہیں جو فروغ اردو کی سمت میں اہم خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ملک کے مختلف علاقوں سے نکلنے والے رسالے مختلف نوعیت اور رنگ روپ کے ساتھ ادب وزبان کی خدمت کر رہے ہیں۔ ان میں کچھ رسالوں کی تعداد اشاعت کم ہے اور کچھ کی کافی زیادہ۔ کمپیوٹر، انٹرنیٹ اور موبائل جیسی جدید سہولتوں کی دستیابی کے بعد رسائل کی اشاعت پر اثر پڑا ہے لیکن آج بھی چھپے ہوئے الفاظ کی اہمیت ختم نہیں ہوئی ہے۔

آزادی سے قبل شائع ہونے والے رسائل میں سب رس، شاعر، اور آجکل اہم رسائل تھے جو آج بھی شائع ہو رہے ہیں۔ ملک کی آزادی کے بعد اردو ادب، نیا دور، کتاب نما، ذہن جدید، ایوان اردو جیسے رسالے منظر عام پر آئے جو آج بھی ادبی دنیا میں مقبول ومعروف ہیں۔ ان رسالوں میں وقت وحالات کے ساتھ ساتھ تبدیلیاں بھی آئی ہیں اور فروغ اردو کی تاریخ میں ان جیسے رسائل کا تذکرہ ناگزیر ہے۔ رسائل نے جہاں صحافت کی ترویج وترقی میں نمایاں کردار ادا کیا وہیں ان رسائل نے زبان وادب کے نمایاں فروغ میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے۔ رسائل وجرائد بھی اخبارات کی طرح ہی معاشرے کی سچی ترجمانی کرتے ہیں۔ اخبارات میں جہاں سیاست اور روزمرہ کی خبروں کو موضوع بنایا جاتا ہے وہیں رسائل میں ان خبروں پر تجزیے، عصری حالات وصورتِ حال سے متاثرہ ادب پیش کیا جاتا ہے اور قاری کی فکر کو کارآمد بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ آج بڑی تعداد میں رسائل واخبارات انٹرنیٹ پر آن لائن پڑھنے کے لیے موجود ہیں۔ جس سے ہزاروں لوگ گھر بیٹھے یا سفر کے دوران بھی مستفید ہوتے ہیں۔ موجودہ رسائل کو جدید ٹکنالوجی سے ہم آہنگ ہونے کی ضرورت ہے، اس کے علاوہ رسائل کی مارکیٹنگ پر بھی توجہ دی جائے تو ان کی تعداد اشاعت بڑھ سکتی ہے۔ اردو رسائل کے ساتھ یہ بڑا المیہ ہے کہ وہ قاری تک پہنچ ہی نہیں پاتے۔ کسی رسالے کی بہتر مارکیٹنگ کی تازہ مثال ہمارا رسالہ بچوں کی دنیا ہے۔ اس ماہنامہ نے پورے ملک کے اردو حلقوں کو نہیں خود ہمیں بھی حیران کر دیا ہے۔ بلکہ حیرانی سے بھی بڑھ کر ہمیں اس بات کی خوشی ہے کہ 'بچوں کی دنیا' کے ذریعے ہم اردو کو اپنے بچوں تک پہنچا پا رہے ہیں جو کسی زبان کو ایک نسل سے دوسری نسل تک پہنچانے کا اصل وسیلہ ہوتے ہیں۔

ایک اور حقیقت ہے جو 'اردو دنیا' اور 'بچوں کی دنیا' کی کامیابی سے سامنے آرہی ہے۔ اور وہ یہ نہیں ہے کہ 'ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی'۔ وہ حقیقت یہ ہے کہ مٹی تو نم ہے، موسم بھی سازگار ہے اور ہوائیں بھی ٹھیک رخ پر چل رہی ہیں، مسئلہ یہ ہے کہ ان حالات میں اردو رسالوں کی فصل ٹھیک طرح سے صحیح لوازمات کے ساتھ جدید ترین طریقے بروئے کار لاکر نہیں بوئی جا رہی ہے۔ آج بھی جب اردو رسالے کی بات آتی ہے تو ہمارے ذہن میں صرف ادبی رسالہ ہوتا ہے۔ ایک ایسا اردو رسالہ جس میں ہمارا پورا سماج اور ہماری پوری زندگی موجود ہو، جس میں ادب کے علاوہ مذہب (صرف اسلام نہیں باقی مذہب بھی)، سیاست، حالات حاضرہ، سماج، معیشت، تعلیم، قانون، سائنس، فلم، انٹرنیٹ اور کھیل کود جیسے اہم شعبوں کے بارے میں بھی مضامین اور دیگر تحریریں شامل ہوں، ابھی تک ہمارا تصور ہی نہیں بن سکا ہے۔ ہم یہ دعویٰ تو نہیں کرتے کہ 'اردو دنیا' اس تصور پر پورا اترتا ہے لیکن یہ اس تصور کے کچھ قریب ضرور ہے اور ہمارے خیال سے یہی اس کی کامیابی کی خاص وجہ بھی ہے۔ ورنہ کم قیمت پر تو اردو کے اور بھی کئی سرکاری رسالے شائع ہوتے ہیں جو ابھی تک اردو خریداروں کی توجہ حاصل نہیں کر پائے ہیں۔

زیر نظر شمارے میں کور اسٹوری کے تحت مضمون نگاروں نے اردو رسائل کے مجموعی حالات وکیفیات کا احاطہ کرتے ہوئے ان کے مسئلوں کا جائزہ لیا ہے اور حل ڈھونڈنے کی کوشش کی ہے۔ پھر بھی ہوسکتا ہے آپ کو یہ لگے کہ کئی باتیں چھوٹ گئی ہیں اور کچھ معاملے بیان سے رہ گئے ہیں۔ آپ سے درخواست ہے کہ ایسے امور کی نشان دہی کریں اور اپنی رائے بھی دیں۔ قومی اردو کونسل اپنی مختلف اسکیموں کے تحت اردو رسالوں کی مدد کرتی آئی ہے۔ اگر آپ کے ذہن میں کوئی ایسی قابل عمل تجویز ہو جس سے اردو رسائل کے بنیادی مسائل کے حل میں اردو کونسل مزید تعاون دے سکتی ہے تو اس سے بھی ضرور مطلع کریں۔ ہمیں، اور خاص طور سے مجھے، آپ کی رائے کا انتظار رہے گا۔

(ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین)

آپ کی بات

رضوان الرضا رضوان علیگ

عبدالعلی طبیہ کالج کٹولی ملیح آباد لکھنؤ

’اردو دنیا‘ مارچ کا شمارہ بہت اہم ہے اس میں زبان وادب اور تہذیب وثقافت کی تاریخ مرتب ہوئی ہے۔ اداریے سے لے کر حضرت امیر خسرو، مولانا محمد حسین آزاد، ذوق دہلوی، قرۃ العین حیدر، امداد امام اثر اور رام لعل سے متعلق نقادوں کے تاثرات نے قدر وقیمت میں اضافہ کیا ہے بلکہ فروغِ اردو زبان کے تعلق سے ہمہ جہت سودمند اور روشن ترجیحات کی مثال بھی دیکھنے کو مل جاتی ہے۔ ٹائٹل کور اتنا خوبصورت ہے کہ اسے سونے کے فریم میں اگر لگا دیا جائے تو بھی فریم کی قیمت کم لگے گی۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے ’ہندوی کا نقاش اوّل‘ بڑے ہی مدلل انداز میں اشعار کی توضیح اور مثالوں کے حوالے سے تحریر فرمایا ہے جو تاریخ زبان وادب کے اعتبار سے اہم سرمایہ کے طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔ جناب کرشن بھاوک کے مضمون میں گل اور پھل، جاندار، ذی روح، مویشی اور طائر، جوگی ساحر حکمراں اور فنکار، دہلی سے لاانتہا محبت اور مختلف مضامین کی نیرنگیاں اپنا حسن بکھیر رہی ہیں۔ پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے قرۃ العین حیدر سے متعلق اپنی داستان میں جوان کی داستان رقم کی ہے وہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ جناب امتیاز عالم نے کاشف الحقائق کے مصنف امداد امام اثر کے تعلق سے تحقیقی کام نہایت محنت، لگن اور صدق دلی کے ساتھ کیا ہے۔ مقالہ ’امداد امام اثر کی انگریزی شاعری‘ یقیناً ایک اہم بازیافت ہے جسے کئی خطوط، تذکرے اور نظم کے ترجمے سے مثال دے کر مدلل بنایا گیا ہے اور مزید تلاش وجستجو اور تحقیق کی طرف صاحبانِ زبان وادب اور اربابِ فکر ونظر کو متوجہ کرتا ہے۔ رام لعل اردو کے نامور افسانہ نگاروں میں تھے۔ ان کی زندگی کی حقیقی تصویر جتنے پراثر اور دردمند لہجے میں پیش کر کے ان کے حالات بیان کیے گئے ہیں اس کے لیے محترمہ صبیحہ انور صاحبہ کے ساتھ ساتھ رام لعل کے بیٹے ویرونود چھابڑا بھی قابلِ مبارکباد ہیں۔

ڈاکٹر سید احمد خاں

قومی سینئر نائب صدر، اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن، نئی دہلی

’اردو دنیا‘ معیاری طباعت کے ساتھ وقت مقررہ

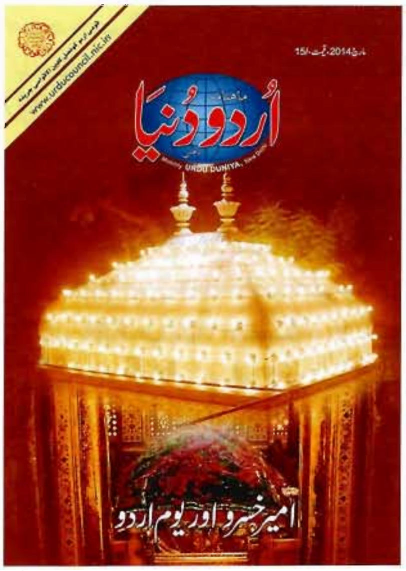

پر پابندی سے موصول ہورہا ہے۔ حقیقت میں اردو دنیا کی پوری ٹیم اس کے لیے مبارکباد کی مستحق ہے اور اس کا سہرا آپ کے سر جاتا ہے۔ تازہ شمارہ مارچ 2014 بھی موصول ہوا۔ سرورق پر حضرت امیر خسروؒ اور یوم اردو کے ساتھ ٹائٹل بھی بہت پرکشش ہے۔ اس شمارے کا اداریہ پڑھنے پر محسوس ہوا کہ دیر آید درست آید کے مصداق حضرت امیر خسروؒ کو یاد کرنے کی ایک اچھی شروعات تو کی جارہی ہے۔ یوں بھی میرے خیال سے آج ملک میں سنت کبیر اور حضرت امیر خسرو کے نظریات کو آگے بڑھانے کی شدید ضرورت ہے۔ ان کے یوم پیدائش کو یوم اردو منانا محض رسم ادائیگی ہوگی۔ لیکن جس اردو کو گزشتہ 65 سال سے بے دریغ موت کے گھاٹ اتارنے کی ہر ممکن کوشش کی گئی وہ اب بھی زندہ اور تابندہ ہے، اس لیے یوم اردو کی جگہ جشن اردو منانا زیادہ بہتر ہوگا اور اس کا اہتمام قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی جانب سے (یوم پیدائش سرسید احمد خاں، 17 اکتوبر) سرسید ڈنر کے طرز پر ہونا چاہیے اور ہمارے جیسے لوگوں کو بھی اہمیت ملنی چاہیے کیونکہ اردو ہماری مادری زبان ہے اور یہی وہ پاکیزہ رشتہ ہے جو اردو کی بقا، فروغ اور ترویج وترقی کے لیے تحریک دیتا رہتا ہے، جس کی وجہ سے اردو کے خادموں میں ہم بھی شمار کیے جاتے ہیں۔ جس طرح سرسید کے شیدائی تعلیم کو عام کرنے کے لیے بے داری مہم چلاتے ہیں، ایسے ہی اردو کو عام کرنے اور امیر خسرو کے پیغامِ انسانیت کو عام کرنے کی مہم چلائی جائے۔ شاید یہ بڑا خراجِ تحسین حضرت امیر خسرو کے حق میں ثابت ہو۔

ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی

سابق ممبر راجیہ سبھا، نئی دہلی

’اردو دنیا‘ فروری 2014 کا شمارہ پیش نظر ہے۔ یہ شمارہ بھی اپنی امتیازی خصوصیتوں یعنی حسن طباعت وکتابت کے ساتھ ساتھ گراں قدر اور معلوماتی اور بصیرت افروز مضامین کا مجموعہ ہے۔ مندرجہ ذیل مضامین بہت زیادہ پسند آئے اور ان کے ذریعے اپنے محدود علم میں اضافہ ہوا۔ دو صدی ایک شاعر، خراجِ عقیدت کے تحت: آفتاب تنقید کی تخلیقی ضیا: وارث علوی، ایک ستارہ جو بحرِ نیلگوں میں ڈوب گیا، اردو صحافت کا عظیم ستون عشرت علی صدیقی، اردو کا تخلیقی ترجمہ نگار مظہر الحق علوی اور تبصرے۔ مالیگاؤں میں منعقدہ کل ہند اردو میلہ کی روداد پڑھ کر بہت زیادہ خوشی ہوئی۔ خاص طور سے اس لیے کہ 87 لاکھ سے اوپر کی اردو کتابیں فروخت ہوئیں۔ جامع کمالات کمال احمد صدیقی اور آسمان صحافت کے مہتاب عشرت علی صدیقی مرحوم سے راقم الحروف کے خاصے مراسم تھے۔

کرشن بھاوک

کوٹھی نمبر A-201، گورونانک نگر، گلی نمبر K-18، پٹیالہ پنجاب

مارچ میں اپنے مضمون کی اشاعت کے لیے آپ کا شکرگزار ہوں۔ میں نے تو ایک سال قبل اپنے خط میں امیر خسرو کی تصویر شائع کرنے کی تجویز پیش کی تھی، آپ نے تو مارچ کے شمارے کا پورا سرورق ہی خسرو کی مزار کا بنوا ڈالا ہے، جو کہ اس ادنیٰ قاری ومصنف کے لیے ایک بہت بڑا اعزاز ہے۔ ”مارچ کے اداریہ ’ہماری بات‘ سے اطلاع ملی کہ امیر خسرو کے یوم پیدائش 3 مارچ کو بطور ’یوم اردو‘ منانے کی قومی اردو کونسل کی تجویز کی حکومت ہند نے پذیرائی کی ہے۔ اس کے لیے کونسل مبارکباد کی مستحق ہے!!

اس شمارے میں گوپی چند نارنگ کا تحقیقی مضمون حاصلِ شمارہ ہے۔ اگرچہ ان کے اس مقالے کی بابت کچھ بھی کہنا گویا آفتاب کو چراغ دکھانا ہے، تاہم اس میں چند اغلاط ملحوظِ خاطر ہیں۔ خسرو کے محولہ دوہے ’گوری سووے سیج پر....‘ کے اول مصرعہ میں ’اور‘ لفظ کی جگہ نارنگ

صاحب نے ہی اپنی دیگر ہندی کتاب 'امیر خسرو کا ہندی کاویہ' میں اول مصرعے میں 'اور' لفظ کی بجائے 'اُردو' لفظ کا تصرف درج کیا ہے (ص 34) اور بطور حوالہ کتاب 'جواہرِ خسروی، مقدمۂ چیستاں'، ص 157 دیا ہے۔ اسی دوہے کا دوسرا مصرعہ ڈاکٹر وحید مرزا نے یوں دیا ہے: ''چل خسرو گھر اپنے، رین بہی سب دیس۔'' (کتاب 'امیر خسرو: سوانحِ عمری'، 186) نارنگ صاحب کے اسی مضمون میں 'رین' لفظ کی جگہ 'رپن' لفظ غلط چھپائی (Printer's Devil) کا ہی ثبوت ہے۔ اسی طرح خاکسار کے مضمون کے آخر میں بھی 'بیل' کا اصلی نام 'تندی' (ص 21) کی بجائے 'نندی' (بیل) درکار تھا۔ اسی شمارے میں 'کتاب 'خسرو شناسی' سے محولہ مرتب ظ۔ انصاری کے مضمون میں بھی خسرو کی پیدائش کا سال 1253 کی بجائے 1252 (ص 9) چلا گیا ہے۔ اسی صفحے پر خسرو کے اول دیوان کے نام میں 'تحفۃ' لفظ کے بعد شائع 'الصفر' کی بجائے 'الصغر' لفظ درکار تھا۔ شمارے میں صفحہ 22 پر یہی نام صحیح چھپا ہے۔ اس شمارے میں ذوق کا یہ شعر دیا گیا ہے: ''اب تو گھبرا کے...'' (ص 48) میں دوئم مصرعہ محمد طیب شمس نے یہ دیا ہے۔ ''مر کے بھی چین نہ پایا...''۔ لیکن آگے 'انتخابِ کلام' کے تحت 'مر گئے پر نہ لگا جی...' (ص 51 کالم) شائع ہوا ہے۔ فاروق ارگلی کا مضمون مخمور دہلوی جیسے عہد ساز شاعر کے فن اور شخصیت کی بابت از حد معلوماتی، معیاری اور مفید ثابت ہوا ہے۔ 'ای اردو بکس' پر مبنی مقالہ بھی تمام محبانِ اردو کے لیے ایک بیش بہا تخلیق ہے۔ شمارہ ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔

محمد جلال الدین عبدالمتین

23 فرنگی محل، لکھنؤ (یوپی)

فروری 2014 کا شمارہ 'اردو دنیا' پڑھا۔ صفحہ نمبر 67 پر تبصرہ و تعارف کے کالم میں قاضی محمد عدیل عباسی مرحوم کی مشہور کتاب 'تحریک خلافت' کی چوتھی طباعت سنہ 2013 ناشر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی پر محمد عارف اقبال، ایڈیٹر اردو بک ریویو کا اچھا تبصرہ پڑھنے کو ملا۔ اس میں ہمارے نانا مولانا سلامت اللہؒ فرنگی محلی اور دادا مولانا عبدالباریؒ فرنگی محلی کا کئی جگہ تذکرہ ہے۔ زیر نظر تبصرے میں دو جگہ مولانا عبدالباری فرنگی محلی کی جگہ مولانا عبدالباریؒ ندوی چھپ گیا ہے۔ عرض یہ کرنا ہے کہ تحریک خلافت میں مولانا عبدالباریؒ فرنگی محلی تھے شاید غلط فہمی سے یا پھر کتابت میں کچھ سہو ہو گیا ہے۔ جہاں تک میرے علم میں ہے مولانا عبدالباری ندویؒ تحریک خلافت یا تحریک آزادی میں شامل نہیں تھے۔ ہمارے پیش نظر 'تحریک خلافت' کا نسخہ مطبوعہ ترقی اردو بورڈ وزارت تعلیم اور سماجی بہبود حکومت ہند نئی دہلی سنہ 1978 ہے۔ یہ چند سطریں اس وجہ سے سپرد قلم کر رہا ہوں کہ یہ تاریخی معاملہ ہے تاکہ آئندہ ایڈیشن میں اس کا خیال رکھا جائے۔ مولانا سلامت اللہ فرنگی محلی مولانا عبدالباریؒ فرنگی محلی کے مرید اور دست راست تھے جن کو مولانا عبدالباریؒ اپنا نفس و عین کہا کرتے تھے۔ اسی طرح 'ترک موالات' کے فتوے پر علمائے فرنگی محل میں سے صرف دو نے دستخط کیے تھے جن میں مولانا عبدالباریؒ فرنگی محلی اور مولانا سلامت اللہ فرنگی محلی تھے۔

ارشد قمر

لال کوٹھا روڈ، مسلم نگر، ڈالٹن گنج، ضلع پلاموں

'اردو دنیا' فروری 2014 کا شمارہ موصول ہوا۔ اس بار کا شمارہ سابقہ شماروں پر یقیناً سبقت لے گیا ہے۔ آپ نے ایک ساتھ اتنی معلومات یکجا کر دی ہیں جس کی حیثیت دستاویزی ہو گئی ہے۔ آپ کا اداریہ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی پُر مغز اور بے مثال ہے۔ شبنم گورکھپوری صاحب سے لیا گیا انٹرویو بہت پسند آیا۔ اس میں دو رائے نہیں کہ شبنم صاحب جیسے بہت کم مترجم ہوئے ہیں جنھوں نے مترجم ہونے کا حق ادا کیا ہے۔ انگریزی شاعر کولرج کے شعر کا واقعی جو ترجمہ انھوں نے پیش کیا ہے شاید اس سے بہتر دوسرا ترجمہ پیش نہیں کیا جا سکتا۔ عبدالحلیم صدیقی کا مضمون 'سرزمین ہند کا اردوستاں: مہاراشٹر' ایک تاریخی مضمون ہے۔ انھوں نے اس صوبے کے جو اعداد و شمار پیش کیے ہیں۔ وہ بے حد معلوماتی ہیں۔ دیگر صوبے کی طرح مہاراشٹر کو بھی مرکزیت حال ہے جہاں اردو کی ترویج و اشاعت کا کام زور و شور سے جاری ہے جس کی مثال مالیگاؤں کا اردو میلہ ہے۔ جاں نثار اختر اور غلام ربانی تاباں پر لکھے گئے تمام مضامین بہت ہی معلوماتی اور معیاری ہیں۔ جن کے مطالعے سے ان کی زندگی کے بہت سارے گم شدہ پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔ اس کے علاوہ وارث علوی، کمال احمد صدیقی، بلراج کومل، مظہر الحق علوی، عشرت علی صدیقی، ظفر عدیم اور فاروق شیخ کو بہترین خراجِ عقیدت پیش کیے گئے ہیں۔

محمد شکیل خاں

یو ایس بی ایل سی، پٹنہ

فروری 2014 کا اردو دنیا ہمدست ہوا۔ بیک کور پر ولی رحمانی صاحب کی تصویر دیکھ کر خوشی ہوئی۔ اگر موصوف کی طرح اور شخصیتیں پیدا ہو جائیں تو ملک و ملت کی تقدیر قابل رشک ہو جائے۔ مالیگاؤں اردو کتاب میلے کی جتنی تعریف کی جائے کم ہوگی۔ اردو کتاب میلے کی تفاصیل با تصاویر نے دل کو باغ باغ کر دیا۔ 87 لاکھ کی کتاب کا ایک میلے میں فروخت ہو جانا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ آپ لوگوں نے 12 دنوں کی روداد مع تصویر دے کر ہم قارئین پر احسان جمیل کیا ہے اس کے لیے میں ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین صاحب اور ان کے محنتی رفقائے کار کا بہت بہت شکریہ ادا کرتا ہوں۔ 12 دن 12 صفحات کے لیے میں امتیاز وحید صاحب کی محنت کو سلام کرتا ہوں۔ میں ان لوگوں کو بھی سلام پیش کرتا ہوں اور دل سے دعائیں دیتا ہوں جن لوگوں نے دل کھول کر کتابوں کی خریداری کی۔ صفحہ نمبر 46-47 کی پیش کش بہت اچھی لگی۔ اگر پورے رسالے کے قرطاس کی زمین اس رنگ کی ہو جائے تو بہتر ہوگا۔ اس طرح کے رنگ پر نظر ٹھہرتی ہے۔ تاباں صاحب کے بارے میں پڑھ کر مجھے وہ زمانہ یاد آ گیا جب ترقی پسند مصنّفین نے ٹاؤن ہائی اسکول سہسرام میں ایک مشاعرہ منعقد کرایا تھا۔ صفحہ نمبر 81 کی تصویر کے نیچے فروغ کی جگہ فروخ ہو گیا ہے۔ یہ رسالہ اردو زبان کی بقا کے لیے معجون مرکب ہے جس سے اردو کی صحت انشاء اللہ ہمیشہ اچھی رہے گی۔

معین الدین شمسی

حاجی جمیل احمد روڈ، بھنڈاری ڈیہہ، گریڈیہہ

ماہنامہ 'اردو دنیا' جنوری 14 کے سرورق پر چھپی الیکشن کمیشن آف انڈیا کی شاندار عمارت پر جلی حرفوں میں لکھا 'ہمارا آئین ہماری جمہوریت' اشوک چکر کے ساتھ بار بار دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ ویسے اردو دنیا کا شمارہ بہترین اور معیاری ہوتا ہے۔ مضمون کا انتخاب طباعت، کاغذ، پیش کرنے کا سلیقہ خوب ہے۔ آپ کی بات کا کیا کہنا سب کے دل کی بات ہوتی ہے۔ 'ہماری بات' میں ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین نے دور حاضر کی ساری برائیاں، سماج کی کمزوریوں نیز سیاست کی گلیارے کی باتیں رائے دہندگان کی لاپرواہی، خواتین پر مظالم وغیرہ کا تذکرہ کماحقہ کیا ہے۔ بلاشبہ بھارت کے آئین کے مطابق ہندوستان کے تمام بالغ شہریوں کی خواہ مرد ہوں یا عورت جن کی عمر 18 سال ہو چکی ہے۔ ووٹ ڈالنے کا حق ہے۔ ہمیں اس طرف دھیان دینا چاہیے۔ اپنے حلقے کے BLO سے مل کر شناختی کارڈ بنوالینا ضروری ہے تاکہ الیکشن میں کام آئے۔ کور اسٹوری کے تحت خواجہ عبدالمنتقم اور عبدالحی خاں نے بڑی وضاحت سے ووٹروں کو سمجھایا ہے۔ 'نرواچن سدن' سے بوتھ تک اردو دنیا کے اس شمارہ نے رہبری کی ہے۔ اردو دنیا کی ترقی و ترویج میں قومی اردو کونسل کا کلیدی کردار ہے اور انشاء اللہ رہے گا۔ ہمیں صرف پابندی سے اردو دنیا خرید کر پڑھتے رہنے کی ضرورت ہے۔

■

نقش لائل پوری سے مکالمہ

اشتیاق سعید

تقسیم سے قبل پنجاب کے ضلع لائل پور (موجودہ فیصل آباد، پاکستان) کے ایک گاؤں چک نمبر 118، گوگیرہ برانچ میں نقش لائل پور ی کی ولادت 24 فروری 1928 کو ہوئی۔ ان کا اصل نام جسونت رائے ہے۔ تقسیمِ وطن کے بعد آپ نئے ہندوستان میں نوابین کے شہر لکھنؤ کو اپنا وطنِ ثانی بنایا اور مسلسل چار برس تک یہاں معاشی چکر ویو میں اُلجھے رہے، آخر جب حالات نے یہ باور کرادیا کہ یہاں باعزّت طور پر زندگی کرنے کا کوئی ٹھوس ذریعہ نہیں ہے تو لکھنؤ کو خیر باد کہہ کر بمبئی کی سمت کوچ کیا۔ یہ 1951 کا زمانہ تھا۔

1951 کے اواخر میں انھوں نے ایک ڈرامہ لکھا جس کا ہیرو رام موہن تھا۔ اُن دنوں رام موہن ڈائریکٹر جگدیش سیٹھی کا اسسٹنٹ ہوا کرتا تھا۔ اُس نے نقش کو بطور نغمہ نگار جگدیش سیٹھی سے متعارف کرایا۔ یہاں آٹھ شاعروں کے مقابلے میں نقش کاگیت چُن لیا گیا۔ اس طرح یہ محض اتفاقیہ فلم انڈسٹری کی پتلی گلی میں گھُس آئے۔ یہ گلی واقعی اس قدر تنگ تھی کہ ان کے لیے پلٹنا محال ہوگیا اور وہ باہر آنے کی دُھن میں اندر اور اندر گھُستے چلے گئے۔ جبکہ ان کے نغمے باہر کی دُنیا میں ان کی شناخت بن کر گونج رہے تھے۔ پھر پے در پے سرفروش، گُلِ بکاؤلی، انصاف کا مندر، دیوالی کی رات، کال گرل، مان جائیے، پربھات، گھروندہ، خاندان، چیتنا، تمھارے لیے، دِل کی راھیں، آہستہ آہستہ، دِل ناداں، مِلاپ، پھر بہار آئی، آئی تیری یاد، یاری دوستی، وہی بات، حِنا، بیٹا، درد، جینا تیری گلی میں، فرض کی جنگ اور تاج محل جیسی فلموں کے نغمے تحریر کیے۔ علاوہ ازیں امانت، دراڑ، وراثت، بسیرا، آشیرواد، ادھیکار، سویرا ،شکوہ، ملن، ھرے کانچ کی چوڑیاں، سرکار، اَن کھی اورخوشی جیسے مقبول سیریلوں کے لیے بھی نغمے تحریر کیے۔ لاھور میں قیام کے دوران انھوں نے آنرز اِن پنجابی کا کورس کرکے پنجابی ادب سے روشناس ھوچُکے تھے۔ غالباًاسی سبب اب تک قریباً چالیس پنجابی فلموں کے بھی گیت لکھے ہیں۔ جن میں سے بہت سے گیت پنجاب میں آج بھی مقبول ہیں۔ انھوں نے کم و بیش پانچ سو سے زائد نغمے ہندوستانی سنیما کو دیے ہیں باوجود اس کے انھیں ہمیشہ نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔ جب بھی نغمہ نگاروں کی فہرست ترتیب دی جاتی ہے نقش لائل پوری کا نام حاشیے پر ڈال دیا جاتا ہے، حالانکہ اُن کے نغموں کو نوشاد، خیام، مدن موہن، روی، جئے دیو، رویندر جین وغیرہ جیسے اُستاد موسیقاروں نے اپنے سُرعطا کیے ہیں اور محمد رفیع، کشور کمار، مکیش، طلعت محمود، لتا منگیشکر، آشا بھونسلے جیسے عظیم گلوکاروں نے اپنی آوازیں دی ہیں۔ نقش صاحب کو نغمہ نگاری میں جہاں غزل کی ہیئت کی سہولت نصیب ہوئی وھاں اُنھوں نے تغزّل کا بھر پور جادو جگا کر اپنے ادبی ذوق کو مہمیز کیاھے۔ نقش لائل پوری فلموں سے وابستگی کے باوجود بھی کبھی فلمی نہ ہوسکے کیونکہ یہ خالص شعر وادب کے آدمی ہیں، انھوں نے فلموں میں معیار سے کبھی بھی سمجھوتہ نہیں کیااور نہ ہی فلمی مصروفیت کو عُذر بنا کر شعر وادب سے بیگانگی برتی۔ ایک ادبی انجمن 'بزمِ فکر و فن' جس کے عرصۂ دراز تک نہ صرف صدر رہے بلکہ اُس کی ماھانہ نشستوں میں پابندی سے شرکت بھی کیا کرتے تھے۔ نقش لائل پوری خالص پنجابی ہونے کے باوجود اُردو بالکل صاف بولتے ہیں کہ ان کے پنجابی ہونے کا گمان ہی نہیں گُزرتا، لوگ باگ اس کا سبب اُن کے قیامِ لکھنؤ کو سمجھتے ہوں گے لیکن یہ سچ نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اُنھوں نے لاھور کے قیام کے دوران منٹو کا ایک جملہ کہیں پڑھ لیا تھا کہ ''جب کوئی پنجابی اُردو بولتا ہے تو ایسا لگتا ہے جیسے جھوٹ بول رہا ہو''۔ اس جملے نے اُن کے دِل و ذہن کو جھنجوڑ دیا تھا اور انھوں نے اُسی دم تہیہ کر لیا تھاکہ وہ کبھی جھوٹ نہیں بولیں گے۔ نقش لائل پوری سے اشتیاق سعید کی بات چیت ملاحظہ فرمائیں:

اشتیاق سعید: نقش صاحب جیسا کہ ہم سبھی جانتے ہیں کہ آپ فلمی دنیا کے ساتھ ساتھ ادبی دنیا میں بھی ایک کہنہ مشق شاعر کے طور پر جانے اور پہچانے جاتے ہیں۔ آپ کی غزلوں کا مجموعہ 'تیری گلی کی طرف' مقبول ہو چکا ہے۔اب آپ سے یہ جاننا چاہتے ہیں کہ آپ پر یہ انکشاف کب اور کیسے ہوا کہ آپ میں ایک شاعر پوشیدہ ہے؟

نقش لائل پوری: یہ ایک واقعہ ہے۔ میں جب ساتویں جماعت میں زیرِ تعلیم تھا تو اُردو کے اُستاد میرے مضمون لکھنے کے انداز سے بے حد متاثر تھے۔ ایک روز

انھوں نے مجھ سے کہا کہ تمھیں لٹریچر کی طرف توجہ دینی چاہیے، اس میں تمھیں کامیابی مِل سکتی ہے۔ یہیں سے مجھ میں ادب سے دلچسپی پیدا ہوئی اور میں اساتذہ کے کلام کا مطالعہ کرنے لگا اور پھر دھیرے دھیرے اشعار کی باریکیاں بھی سمجھنے لگا۔ اسی طرح شعر بھی کہنے لگا۔

ا س: پہلا شعر کیا تھا اور کس عمر میں کہا تھا؟

نقش لائل پوری:

کلیوں کے لب کُھلے بھی تو فریاد کے لیے
دامن چھڑا لیا جو چمن سے بہار نے

یہ میری پہلی غزل کا شعر ہے جسے میں نے 17 سال کی عمر میں کہا تھا۔

ا س: آپ کی شعر گوئی پر والدین کی طرف سے کوئی ردِّعمل ہوا؟

نقش لائل پوری: والد بے حد ناراض تھے کیونکہ وہ انجینئر تھے اور مجھے بھی انجینئر بنانا چاہتے تھے۔ F.S.C میں مجھے تمام مضامین میں اچھے نمبر مِلے تھے لیکن سائنس میں محض پاسنگ مارک مِلا تھا۔ اُنھوں نے اس کی وجہ پوچھی تو میں نے صاف صاف کہہ دیا کہ میری سائنس میں دلچسپی نہیں ہے۔ اس پر انھوں نے خفا ہو کر کہا، تو پھر مجھے بھی تمھیں آگے پڑھانے میں دلچسپی نہیں ہے۔ فلم لائن جوائن کرنے پر بھی بہت خفا ہوئے تھے حتیٰ کہ تین سال تک مجھ سے خط و کتابت تک نہیں کی۔

ا س: بمبئ آنے کے بعد کن حالات سے نبرد آزما ہونا پڑا تھا؟

نقش لائل پوری: کئی دنوں کی بیکاری کے بعد پوسٹ اینڈ ٹیلی گراف میں ملازمت مِل گئی، لیکن میں اس ملازمت سے قطعی خوش نہیں تھا اس لیے کچھ دنوں بعد استعفیٰ دے دیا۔ پھر ٹائمز آف انڈیا میں بطور پروف ریڈر لگ گیا، یہاں بھی جی نہ لگا، اس کے بعد فائر اسٹون میں عارضی طور پر ملازمت مِلی۔

ا س: فلموں میں نغمہ نگاری کا خیال کیسے آیا؟

نقش لائل پوری: فائر اسٹون میں ملازمت کے دوران شاعری کے شوقین کچھ امیر زادے وقت گزاری کے لیے آتے تھے۔ ایک دن انھوں نے میرے سامنے ڈرامے کی تجویز رکھی۔ جسے میں نے خوشی خوشی قبول کر لیا اور دو ہی دن میں ایک ڈرامہ لکھ دیا۔ ڈرامے کا ہیرو رام موہن تھا جو فلم ڈائریکٹر جگدیش سیٹھی کا اسسٹنٹ بھی تھا۔ وہ میرے اسکرپٹ سے کافی متاثر ہوا تھا بالخصوص ڈرامے میں شامل نغمے اُسے پسند آئے تھے۔ ایک دن اُس نے مجھ سے کہا کہ آپ فلموں کے لیے نغمے کیوں نہیں لکھتے؟ میں نے کہا موقع مِلے گا تو ضرور لکھوں گا۔ پھر اُس نے جگدیش سیٹھی سے بات کی۔ اُن کے یہاں ایک گیت سات شاعروں کو لکھنے کے لیے دیا گیا تھا، آٹھواں مجھے بھی شامل کر لیا گیا۔ خدا کی قدرت کہ وہ گیت میرے ہی حصّے میں آیا۔ فلم لائن میں آنے کے لیے کافی جد و جہد کرنی پڑتی ہے، مجھے بھی کافی مشکلات پیش آئیں۔ حالانکہ میں نے کام کے لیے کبھی کسی دروازے پر دستک نہیں دی بلکہ میرا کام ہی دوسرا کام لاتا رہا۔ آپ کو ایک بات یہ بھی بتا دوں کہ میں نے بمبئ آنے سے پہلے خدا سے دو دعائیں کی تھیں۔ ایک یہ کہ رزق کے لیے مجھے کسی کے دروازے پر کھڑا نہ کرنا اور دوسری یہ کہ میری جائز ضروریات کو کبھی نہ روکنا۔

ا س: ادبی شاعری اور فلمی شاعری میں کیا فرق ہے؟

نقش لائل پوری: ادبی شاعری میں جیسا چاہتا ہوں، جو چاہتا ہوں کہتا ہوں، جبکہ فلمی شاعری میں ڈائریکٹر کے علاوہ موسیقار اور پروڈیوسر بھی دخل دیتا ہے۔ ایسے حالات میں ہم اپنی مرضی سے نہیں لکھ سکتے۔ باوجود اس کے مجھ سے جس قدر بھی ممکن ہوا میں نے فلمی شاعری میں بھی ادب کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ میرے بہت سے فلمی نغمے ایسے ہیں جنھیں ادبی نشستوں میں بھی پڑھا جا سکتا ہے۔

ا س: کیا فلمی شاعری سے آپ کی ادبی شاعری متاثر ہوئی؟

نقش لائل پوری: ہاں! بہت زیادہ... فلم میں آنے کے بعد میرا ذہن ایسے شعر کہنے میں لگا رہتا تھا جسے آسانی سے فلموں میں بیچ سکوں۔ ہر طرح کی شاعری میں بس معمولی سا فرق ہوتا ہے۔ فلموں کی شاعری الگ ہے، البم کی شاعری الگ ہے، ٹی وی سیریل کی شاعری الگ ہے۔ جب تک کہ ان تینوں کے درمیان کے فرق کو شاعر سمجھ نہیں سکے گا وہ کامیاب نہیں ہو سکے گا۔

ا س: آپ کا گیت لکھنے کا طریقۂ کار کیا ہے؟

نقش لائل پوری: میری کوشش یہ ہوتی ہے کہ گیت کا پہلا مصرعہ ایسا ہو کہ جسے جو بھی سُنے وہ کہے کہ یہ تو میں بھی کہہ سکتا ہوں، لیکن دوسرا مصرعہ ایسا ہو کہ جو صرف ایک شاعر ہی کہہ سکتا ہے۔ بالکل عام بول چال کی شاعری!... جیسے :

یہ ملاقات ایک بہانہ ہے
پیار کا سلسلہ پُرانا ہے
رسم اُلفت کو نبھائیں تو نبھائیں کیسے
ہر طَرف آگ ہے دامن کو بچائیں کیسے

ا س: آپ نے غزلیں تو کہی ہیں، کیا نظمیں بھی کہی ہیں؟

نقش لائل پوری: بالکل کہی ہیں... لیکن ان کی تعداد بہت کم ہے۔ طبیعت میں زیادہ رچاؤ غزل کا ہے، میں خود بھی سمجھتا ہوں کہ غزل اچھی اور آسانی سے کہہ سکتا ہوں۔

ا س: ایک اچھا شاعر ہونے کے باوجود آپ نے اپنی تخلیقات کو رسائل و جرائد سے دور کیوں رکھا؟

نقش لائل پوری: سب سے اہم بات یہ تھی کہ رسائل سے کچھ مِلتا نہیں ہے، دوسرے یہ کہ آپ ان کے خریدار پہلے بنیے پھر آپ کی تخلیقات شائع کریں گے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ رسائل و جرائد میں شائع ہونے سے شہرت ملتی ہے لیکن مجھے تو فلموں سے شہرت مِل رہی تھی۔

ا س: آپ غزل کے اچھے شاعر ہیں باوجود اس کے جب شعرا کی فہرست مرتب کی جاتی ہے تو آپ کا نام رہ جاتا ہے؟

نقش لائل پوری: یہ تو فہرست مرتب کرنے والوں کی صوابدید پر منحصر ہے۔ یوں بھی اِسے اپنی ہی کوتاہی سمجھوں گا کیونکہ میں نے رسائل و جرائد سے یکسر اجتناب کیا اور اپنا مجموعۂ کلام بھی خاصا تاخیر سے منظر عام پر لایا اور وسائل کے کمی کے سبب اہلِ علم و ادب تک پہنچا نہ سکا۔

ا س: فی زمانہ رسائل و جرائد کا مستقبل کیا ہے؟

نقش لائل پوری: ان دنوں تو کئی رسائل نکل رہے ہیں اور کئی دم بھی توڑ رہے ہیں۔ آج مارکیٹنگ کا دور ہے۔ اُردو والوں کے پاس اتنا سرمایہ کہاں کہ وہ مارکیٹنگ کر سکیں۔ علاوہ ازیں اُردو والوں میں خرید کر پڑھنے کا رجحان اب تک نہیں بنا ہے۔ رسائل و جرائد کو زندہ رکھنے کے لیے رقم لے کر گوشے نکالنے پڑ رہے ہیں۔ شمع جیسے اشاعتی ادارہ نے اپنا ادبی پرچہ 'آئینہ' جاری کیا تھا جو 26 شمارے کے بعد بند ہو گیا تھا۔

ا س: فی زمانہ ہونے والے مشاعروں سے آپ مطمئن ہیں؟

نقش لائل پوری: جی نہیں... سچ پوچھیے تو ان مشاعروں سے ادب کو بڑا نقصان پہنچا ہے۔ مشاعروں میں اب گلوکاری اور اداکاری کا چلن ہو گیا ہے۔ شاعری سے شعریت اور ادبیت جاتی رہی ہے اور تیسرے درجے کی شاعری رواج پا رہی ہے۔ اُستاد شعرا اپنے کلام خوبصورت لڑکیوں سے پڑھوا رہے ہیں۔

ا س: اردو کی موجودہ صورتِ حال پر کچھ کہیں۔

نقش لائل پوری: افسوس ناک ہے۔ میری دلی خواہش ہے کہ زبان خوب پھولے پھلے، اس سے مُنھ موڑنے والے اس کی طرف دیکھیں، اس کی ترقی کے لیے کچھ سوچیں، اس کے لیے کچھ کریں۔ ویسے زبان جو ایک دفعہ رائج ہو جاتی ہے وہ مٹتی نہیں اور پھر اُردو صرف زبان ہی نہیں ایک تہذیب بھی ہے۔

ا س: آپ اپنی چند قابلِ ذکر فلموں کے نام بتائیں۔

نقش لائل پوری: جگّو، گھروندہ، چیتنا، کاغذ کی ناؤ، نوری، ہِنا، درد اور آہستہ آہستہ۔ یہ فلمیں مجھے قدرے پسند ہیں اور ان میں میرے کام کو کافی سراہا بھی گیا ہے۔

اس: آپ اپنے چند وہ اشعار سنائیں جو آپ کو بے حد پسند ہیں؟

نقش لائل پوری: یوں تو مجھے اپنے کہے بیشتر اشعار پسند ہیں تاہم ان میں سے کچھ پیش خدمت ہیں ملاحظہ فرمائیں:

تمام عمر چلا ہوں مگر چلا نہ گیا
تیری گلی کی طرف کوئی راستہ نہ گیا

دردر کروں تلاش یہ فطرت نہیں مری
اپنے وجود ہی میں اُسے ڈھونڈتا ہوں میں

چھاؤں بھی دوں گا دواؤں کے بھی کام آؤں گا
نیم کا پودا ہوں آنگن میں لگا لو مجھ کو

تیرے خیال نے پہنا شفق کا پیراہن
مری نگاہ سے رنگوں کا سلسلہ نہ گیا

اس: جس دور میں آپ نے شاعری شروع کی وہ ادب میں ترقی پسندی اور جدیدیت کے رجحانات کے باہم تصادم کا زمانہ تھا۔ آپ کے ذہن نے کس رجحان کو قبول کیا؟

نقش لائل پوری: میرا تعلق آرزو لکھنوی اسکول سے ہے چنانچہ ترقی پسندی اور جدیدیت دونوں ہی سے مجھے شدید انحراف رہا ہے۔ باوجود اس کے میں اُن دنوں ترقی پسندوں کی میٹنگوں میں پابندی سے شرکت کرتا تھا پھر بھی اُس رجحان کو اپنا نہ سکا اور سکّہ بند رجحان پر تب بھی کاربند تھا اور آج بھی اسی رجحان کا حامل ہوں۔

اس: اپنے ہمعصر شاعروں میں آپ کس کس کو پسند کرتے ہیں۔ ادبی شاعروں اور فلمی شاعروں کے بارے میں الگ الگ پسند بتائیں تو بہتر ہوگا۔

نقش لائل پوری: ادبی شاعروں میں فیض احمد فیض اور فراق گورکھپوری کا دلدادہ رہا ہوں، اگرچہ دونوں ہی مجھ سے سینئر رہے ہیں۔ فلمی شاعروں میں ساحر لدھیانوی اور مجروح سلطان پوری میرے پسندیدہ رہے ہیں۔

اس: فلمی گیتوں کی کامیابی میں موسیقی مرتب کرنے والے کا بھی بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ اس بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

نقش لائل پوری: بالکل! اس معاملے میں موسیقار کو میں برابر کا درجہ دیتا ہوں، کیونکہ دُھن اچھی نہیں بنی تو گیت کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو کانوں کو بھلا نہیں لگے گا، لہٰذا لوگ سُننا پسند نہیں کریں گے اور گیت ناکام ہو جائے گا۔

اس: کچھ میوزک ڈائریکٹروں کے ساتھ آپ کی اچھی ٹیوننگ رہی۔ ان میں سپن جگ موہن اور مدن موہن کے نام خاص طور پر لیے جاسکتے ہیں۔ اس سلسلے میں کچھ بتائیے۔

نقش لائل پوری: سپن جگ موہن اور مدن موہن کا نام تو بعد میں آتا ہے میری ٹیوننگ زیادہ جےّ دیو اور خیام کے ساتھ رہی ہے، میرا زیادہ کام ان ہی کے ساتھ ہوا ہے۔ سپن جگ موہن تو بہت بعد میں موسیقار بنے، پہلے وہ کورس گایا کرتے تھے۔ اُس زمانے کے تمام بڑے موسیقاروں کے ساتھ اُنھوں نے کورس گایا ہے، اسی بات کا فائدہ اُٹھا کر انھوں نے ایک موسیقی گروپ تشکیل دیا اور موسیقار کی حیثیت سے جدوجہد کرنے لگے۔ اسی دوران مجھ سے ملے اور مدد کے طور پر مجھ سے کچھ گیتوں کی فرمائش کی جو میں نے بغیر کسی حیلہ و حجت کے انھیں دے دیا۔ ان ہی دنوں انھیں ایک پنجابی فلم 'جیجا جی' بطور موسیقار مل گئی۔ مجھے گیت لکھنے کے لیے کہا، میں شش و پنج میں پڑ گیا کیونکہ اُس وقت تک میں نے پنجابی میں ایک شعر تک نہیں کہا تھا اور میں ایسا کوئی کام کرنا نہیں چاہتا تھا جس پر مجھے کلّی طور پر اعتماد نہ ہو، لہٰذا میں نے انھیں صاف لفظوں میں منع کر دیا... میرے انکار سے وہ

نقش لائل پوری نے کم و بیش پانچ سو سے زائد نغمے ہندوستانی سنیما کو دیے ہیں باوجود اس کے انھیں ہمیشہ نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔ جب بھی نغمہ نگاروں کی فہرست ترتیب دی جاتی ہے نقش لائل پوری کا نام حاشیے پر ڈال دیا جاتا ہے، حالانکہ اُن کے نغموں کو نوشاد، خیام، مدن موہن، روی، جےّ دیو، رویندر جین وغیرہ جیسے اُستاد موسیقاروں نے اپنے سُر عطا کیے ہیں اور محمد رفیع، کشور کمار، مکیش، طلعت محمود، لتا منگیشکر، آشا بھونسلے جیسے عظیم گلوکاروں نے اپنی آوازیں دی ہیں۔

کبیدہ خاطر ہو گئے اور اُداس لہجے میں گویا ہوئے ''آپ گیت نہیں لکھیں گے تو میں بھی یہ فلم نہیں کروں گا'' اُن کے اس فیصلے نے مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا کہ کس قدر جدوجہد کے بعد انھیں یہ فلم ملی ہے اور وہ میری وجہ سے چھوڑے دے رہے ہیں لہٰذا میں نے گیت لکھنے کے لیے ہامی بھر لی۔ رہی بات مدن موہن کی تو میں جب اُن سے ملا بھی نہ تھا اُن کی موسیقی کو پسند کرتا تھا۔ اُنھی دنوں میں نے اپنے ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ اگر کوئی پروڈیوسر مجھے مدن موہن کے ساتھ گیت لکھنے کے لیے سائن کرے گا تو میں بغیر معاوضے کے گیت لکھوں گا۔ چونکہ اُن دنوں میں نیا تھا اس لیے میرے انٹرویو پر کسی نے توجہ نہ کی اور دھیرے دھیرے دو سال کا عرصہ گزر گیا۔ اچانک ایک روز ایک فون آیا کہ اگر آپ کو اپنی شرط یاد ہو تو میں آپ کو مدن موہن کے ساتھ کام دینے کے لیے تیار ہوں... یہ تھے پروڈیوسر رام دیال جو اُن دنوں فلم 'پربھات' بنانے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ اس طرح مجھے مدن موہن کے ساتھ کام کرنے کا موقع نصیب ہوا۔ اس کے بعد تو ساتھ میں کئی کام کیے۔ مدن موہن اپنے کام کے ماہر، وقت کے پابند، بااُصول اور خوددار آدمی تھے۔

اس: فلمی نغمہ لکھنے کے موٹے طور پر دو طریقے ہیں۔ ایک یہ کہ پہلے گیت لکھیے بعد میں اس کی دھن بنائی جائے۔ دوسرا یہ کہ پہلے دھن بنتی ہے پھر اُس پر گیت لکھا جاتا ہے۔ دونوں طریقوں کی اپنی الگ اہمیت ہے۔ آپ کو کون سا طریقہ زیادہ پسند ہے؟:

نقش لائل پوری: پہلے دونوں ہی طریقے رائج تھے جس طرح جنرل گیت جیسے مجرا، بھجن، تہواروں کے گیت اور عشقیہ گیت شاعر پہلے ہی سے لکھ کر رکھتے ہیں، اسی طرح موسیقار بھی کچھ مخصوص دھنیں پہلے ہی سے ترتیب دے کر رکھ لیتے ہیں اور موقع و محل کی مناسبت سے اُس پر گیت لکھواتے ہیں۔ مجھے ان دونوں ہی طریقوں پر گیت لکھنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی، ویسے گیت پہلے لکھا جائے اور دُھن بعد میں بنائی جائے تو زیادہ اچھا ہے۔ اس سے گیت میں کوئی خاص بات کہنی ہے تو شاعر کو اپنے طور پر کہنے کی پوری آزادی مل جاتی ہے۔

اس: وہ کون سے فلمی گیت ہیں جو آپ کو سب سے زیادہ پسند آئے اور جن کی مقبولیت سے آپ مطمئن رہے!

نقش لائل پوری: یوں تو میرے کئی گیت ہیں جو مجھے پسند بھی ہیں اور میں اُن کی مقبولیت سے مطمئن بھی ہوں بالخصوص مدن موہن کا یہ گیت: 'رسمِ اُلفت کو نبھائیں تو نبھائیں کیسے' اور فلم 'خاندان' کا گیت جسے موسیقار خیام نے اپنی دھن سے سنوارا ہے 'یہ ملاقات اک بہانہ ہے' مجھے بے حد پسند ہے۔

اس: آج کل آپ کے کیا مشاغل ہیں؟

نقش لائل پوری: ان دنوں دو تین چھوٹی چھوٹی فلمیں ہیں جن کے گیت لکھ رہا ہوں۔ اس کے علاوہ بھکتی گیتوں اور غزلوں کے البم پر کام کر رہا ہوں۔ حالانکہ اب چلنے پھرنے سے معذور ہوں تاہم ادبی محفلوں میں ضرور شرکت کرتا ہوں۔ ممبئی کی حد تک مشاعروں میں بھی چلا جاتا ہوں۔

اشتیاق: نقش صاحب شکریہ!

■

Ishtiyaque Saeed, 177/1A- Ayesha Manzil, Pipe Road, Kurla, Mumbai - 400 070.
Naqsh Layalpuri
B-401, Vaibhav Palace, Opp. Mega Mall, Oshiwara Link Road, Jogeshwari, Mumbai- 400102

اردو رسالے اور اردو

نصرت ظہیر

اردو زبان و ادب کے ارتقا اور فروغ میں اردو رسائل و جرائد نے جو اہم کردار ادا کیا ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ ٹاٹ پٹی والے پرائمری اسکولوں نے اگر تختی پر اردو لکھنا پڑھنا سکھایا تو یہ اردو کے رسالے اور جریدے ہی تھے جو لوگوں کو اردو میں سوچنا سکھاتے تھے اور اس سیکولر زبان کو ہماری تہذیبی و قومی شناخت بنائے رکھتے تھے۔

لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ رسالوں کی جو دنیا کبھی اردو کی ایک بڑی طاقت ہوا کرتی تھی آج خود اپنی بقا کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہی ہے۔ آج کی نسل کو مشکل سے یقین آئے گا کہ ایک زمانے میں ماہنامہ شمع، ماہنامہ بیسویں صدی، ماہنامہ خاتون مشرق، کھلونا، بانو، روبی، آستانہ، آج کل، نیا دور، آواز، شبستاں اور ہما جیسے رسالے گھر گھر پڑھے جاتے تھے اور ان میں سے کئی کی تعداد اشاعت ایک لاکھ سے بھی اوپر ہوا کرتی تھی۔ یہ رسالے زندگی اور سماج کے مختلف گوشوں سے اردو والوں کو جوڑے رکھتے تھے اور ان کے خریدنے اور پڑھنے کو صحت مند تفریح مانا جاتا تھا۔

لیکن حالات بدلے۔ وطن کی تقسیم کے مضر اثرات اردو پر فوراً تو نہیں لیکن رفتہ رفتہ دکھائی دینے لگے۔ اردو تعلیم کا دائرہ سمٹنا شروع ہو گیا۔ نئے اردو قارئین کا پیدا ہونا پوری طرح بند تو نہیں ہوا مگر ان میں کافی کمی ضرور آ گئی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اردو رسالوں کی تعداد اشاعت کم ہونے لگی۔ کاروباری منافع اتنا گھٹا کہ بیسویں صدی کے آخری عشروں میں اردو رسالوں کو جاری رکھنا گھاٹے کا سودا بن گیا۔ ایک ایک کر کے وہ سبھی رسالے بند ہوتے گئے جنھوں نے اردو میں سرکولیشن کے ریکارڈ قائم کیے تھے۔ کھلونا اور بانو بند ہوئے۔ شمع کو فلمی دنیا کی بجائے عصری سماجی سیاسی مسائل سے جوڑ کر جاری رکھنے کی کوشش کی گئی جو نا کام رہی اور یہ رسالہ بھی ایک دن بند ہو گیا۔ اسی طرح روبی اور دوسرے بہت سے فلمی اور نیم ادبی رسالے بھی ٹھکانے لگ گئے جو اَب تک عام اردو قاری کا اردو زبان سے رشتہ جوڑے ہوئے تھے۔ اردو زبان و ادب کو ایک بڑا نقصان 'بیسویں صدی' جیسے ماہنامے کی اشاعت منقطع ہونے سے بھی پہنچا جو اردو کا واحد ادبی رسالہ تھا جسے اردو کے عام قاری خرید کر پڑھتے تھے۔ کل ملا کر دیکھا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ ملک کی تقسیم نے اردو کی کمر توڑ کر رکھ دی اور اس کی وجہ سے اردو رسائل کی ایک سرسبز و شاداب دنیا بالکل اجڑ کر رہ گئی۔

اس تباہی سے پہلے کے حالات یہ تھے کہ اردو میں تقریباً ہر شعبے سے تعلق رکھنے والے رسالے چھپا کرتے تھے۔ فلمی رسالے تھے، بچوں کے رسالے تھے، خواتین کے رسالے تھے، سائنسی رسالے تھے، کھیلوں سے متعلق رسالے تھے، بلکہ جب عالمی کرکٹ کپ جیتنے کے بعد ہندوستان پاکستان میں کرکٹ کا شوق جنون کی حد کو پہنچ گیا تو صرف کرکٹ کے لیے مخصوص رسالے بھی اردو میں نکلنے لگے۔ رومانی اور طلسمی داستانوں پر مبنی ناول چھاپنے والے رسالے بھی نکل رہے تھے۔ جاسوسی ناول چھاپنے والے درجنوں ماہنامے تھے جو خوب چھپ رہے تھے اور خوب پڑھے جاتے تھے۔ اسی دوران ہما ڈائجسٹ اور شبستان ڈائجسٹ جیسے کتابی سائز کے رسالوں کا بھی دور آیا۔ یہ رسالے خوب ہاتھوں ہاتھ لیے گئے اور اردو کا قاری صحافت کے ایک نئے ذائقے سے روشناس ہوا۔

خالص ادبی صحافت کا حال اطمینان بخش نہ سہی لیکن زیادہ برا بھی نہیں تھا۔ شاعر، شب خون، تحریک، اور کتاب جیسے پرائیویٹ ادبی رسالوں کے ساتھ ساتھ آج کل، نیا دور اور آواز جیسے سرکاری رسالے قدم جمائے ہوئے تھے اور اردو زبان کے لیے اچھا ادب تخلیق کرانے کا فریضہ انجام رہے تھے۔

لیکن عین اس وقت جب کمپیوٹر کی ٹیکنالوجی اردو طباعت و اشاعت کی سب سے بڑی مددگار بن کر سامنے آنے والی تھی، اردو قارئین کی لگاتار گھٹتی ہوئی تعداد ایک ایسی ڈھلان پر پہنچی کہ رسالوں کی دنیا میں سب کچھ نیچے سرکنے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے، 80 کے عشرے سے لے کر 90 کا عشرہ ختم ہونے تک کے دس بارہ برسوں میں یہ دنیا ویران ہو گئی۔ نہ تماشا رہا نہ تماشائی۔

کچھ ملک کی بدلی ہوئی سیاسی فضا، کچھ سماج کے بدلتے ہوئے تقاضے، کچھ اردو والوں میں لگاتار پنپنے والا احساسِ محرومی و مجبوری — وجہ جو بھی کہہ لیجیے، اردو بڑی تیزی کے ساتھ ہماری ترجیحات کے خانوں سے باہر چلی گئی۔ نقصان تو جو ہونا تھا سو ہوا، سب سے خراب بات یہ ہوئی کہ احساسِ زیاں جاتا رہا۔ شادی کے دعوت ناموں

اور قبر کے کتبوں سے بھی اردو کو دور کیا جا رہا اور وہ بھی کسی اردو دشمن کی سازش کے تحت نہیں بلکہ خود اردو والوں کے ذریعے۔ مگر کسی کو صورت حال کی سنگینی نوعیت کا احساس نہیں تھا۔

وہ تو اتفاق کہہ لیجیے یا خوش قسمتی کہ اردو ہے ہی ایک سخت جان اور شاندار زبان جو ہندوستان کی تہذیبی اور ثقافتی روایتوں کے ساتھ رَل مِل کر وجود میں آئی ہے۔ ہندوستان اور ہندوستانیت کی بقا کے لیے جب تک اس ملی جلی تہذیب کی ضرورت اور افادیت باقی ہے اردو کی ضرورت اور افادیت بھی باقی رہے گی۔ یہی وجہ ہے کہ تعلیم گاہوں میں اردو بھلے ہی سمٹ کر رہ گئی تھی لیکن ہندوستانی فلموں میں، موسیقی میں، غزل گائیکی میں، میڈیا کے کاموں میں اور روزمرہ کی بول چال میں اردو بہر حال باقی رہی۔ ان سبھی شعبوں میں اردو کا جلوہ برقرار رہا۔ اور پھر جب انفارمیشن ٹیکنالوجی اور ٹیلی ویژن کی بے پناہ توسیع کا عمل شروع ہوا تو یہ اردو کے لیے نیک فال بن کر سامنے آیا۔ اکیسویں صدی کے آتے آتے، جسے شروعاتی ہفتوں میں ہی انٹرٹینمنٹ کی صدی قرار دے دیا گیا، کارپوریٹ سیکٹر اردو کی طرف متوجہ ہونے لگا۔ روزنامہ راشٹریہ سہارا کی صورت میں پہلی بار کسی کارپوریٹ گھرانے کی طرف سے اردو کے ملک گیر اخبار کی شروعات ہوئی جو اس وقت شمالی جنوبی، مغربی اور مشرقی ہندوستان کے دس شہروں سے ایک ساتھ شائع ہو رہا ہے۔ اس واقعے نے ملک میں اردو روزناموں کی تصویر اور تقدیر بدل کر رکھ دی۔ آج اخبار مشرق اور صحافت جیسے کئی اردو روزنامے ملک کے کئی شہروں سے نکلنے لگے ہیں۔ ممبئی کا انقلاب ایک اور کارپوریٹ گروپ کی تحویل میں آ کر مغربی ہندوستان کے بعد شمالی اور وسطی ہندوستان کا بھی ایک بڑا اردو اخبار بن گیا ہے۔ ایک اور تجارتی گروپ نے 'چوتھی دنیا' کے نام سے اردو ہفتہ وار شروع کیا ہے جو کامیابی کے ساتھ جاری ہے۔

نئی ٹیکنالوجی نے اردو کو ٹیلی ویژن کی دنیا میں بھی اہم مقام دلایا ہے۔ سب سے پہلے ملک کی پہلی پرائیویٹ ہندی چینل زی ٹی وی نے ہندی کی بجائے اردو اور انگریزی کے لفظوں کی ملاوٹ سے ایک ملی جلی زبان کے استعمال سے میڈیا کی عام زبان کا ایک لہجہ وضع کیا، جسے کچھ لوگوں نے 'ہنگلش' کا نام دیا تو کچھ نے ہندوستانی کہا۔ ادبی انداز کی ٹھیٹھ ہندی کے حامیوں نے اس پر سخت اعتراض کیا۔ لیکن نقار خانے میں مخالفت کی یہ آواز کہاں ٹھہر سکتی تھی۔ دوسری طرف نو بھارت ٹائمس اور دینک

ہندوستان جیسے ہندی اخباروں نے انگریزی اور اردو کے لفظوں کا بلا تکلف سرخیوں اور متن میں استعمال شروع کر دیا۔ لسانی سطح پر ہونے والی ان تبدیلیوں نے اردو زبان کے ساتھ تعصب کے اس قلعے کو مسمار کرنے میں اہم کردار کیا جو ملک کی تقسیم کی بنیادوں پر کھڑا کیا گیا تھا۔

اس بدلے ہوئے منظر نامے کے ساتھ آندھر پردیش کے ایک بڑے میڈیا گروپ نے ای ٹی وی اردو کے نام سے پہلی اردو ٹی وی چینل شروع کی جو آج اردو والوں کے گھروں میں سب سے زیادہ دیکھی جاتی ہے۔ دوردرشن کی اردو چینل ڈی ڈی اردو نے بھی آخر کامیابی کا راستہ پکڑ لیا ہے۔ زی ٹی وی نے زی سلام کے نام سے اردو چینلوں میں اپنی موجودگی درج کرادی ہے۔ ہندوستان کی پہلی اردو نیوز ٹی وی چینل عالمی سہارا کے نام سے شروع ہوئی ہے۔ اسی طرح حیدراباد کے مشہور اردو اخبار 'منصف' نے بھی اپنے نام سے ایک ٹی وی چینل شروع کی ہے۔

تاہم اردو رسالوں کی دنیا میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی رہی کہ الیکٹرانک میڈیا کی بے پناہ توسیع اور زندگی کی انتہائی تیز رفتار، اردو والوں کو اتنا وقت ہی نہیں دے رہی تھی کہ وہ رسالوں کی کمی کو محسوس کرتے۔ پھر یہ بھی ہے کہ اردو والوں میں اردو کے رسالے اور کتابیں خرید کر پڑھنے کا ذوق و شوق بھی پوری طرح نہیں پنپ سکا تھا۔

ان ہی حالات میں اگست 2011 میں ایک اہم واقعہ پیش آیا۔ قومی اردو کونسل پچھلے بارہ تیرہ برسوں سے اپنا ایک ماہ وار رسالہ 'اردو دنیا' کے نام سے شائع کرتی آرہی تھی۔ رسالے کی ابتدا اس طرح سے ہوئی تھی کہ اس میں اردو سے متعلق خبروں کے تراشے، زیروکس کر کے ہر صفحے کی کاپی پر گوند سے پیسٹ کر دیے جاتے تھے اور پھر ان ہی صفحوں کو عکس اٹھوا کر رسالے کی صورت میں چھاپ دیا جاتا تھا۔ مقصد تھا اردو والوں کو یہ بتانا کہ اردو زبان کے تعلق سے ملک کے اخباروں میں کیا کچھ چھپ رہا۔ اس کی طباعت اور پیش کش اس وقت کے غیر معیاری اردو رسالوں سے بھی کم درجہ اور گھٹیا تھی۔ پھر اس کے چھپنے کا بھی کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ کبھی چھ مہینوں میں چھپ رہا ہے کبھی چار مہینوں میں۔ آخر رسالے کو باقاعدہ شکل دی گئی۔ اور جب مرحوم مخمور سعیدی کو اس کی اعزازی ادارت سونپی گئی تو 'اردو دنیا' سچ مچ ایک ڈھنگ کے رسالے کی صورت میں آیا اور باقاعدگی سے ہر ماہ چھپنے لگا۔ لیکن رسالے کی خریداری کا وہی عالم رہا جو عام ادبی

मुलांचे उर्दू मासिक; औरंगाबादेत ५० हजार वाचक

वाचन संस्कृती 'बच्चों की दुनिया'च्या विक्रीचा देशातील उच्चांक; जळगाव, सोलापुरातही नोंदणी; वार्षिक वर्गणी १०० रुपये

महेश जोशी | औरंगाबाद

टीव्ही, इंटरनेट आणि कॉम्प्युटर गेम्समुळे मुलांचे वाचन कमी झाले, अशी चिंता सातत्याने व्यक्त केली जाते. पण दिल्लीहून प्रकाशित होणारे उर्दूतील 'बच्चों की दुनिया' मासिकाने औरंगाबादेत ५० हजारांवर वाचक जमवून ही चिंता व्यर्थ असल्याचे दाखवून दिले आहे. या मासिकाच्या देशभरातील सर्वाधिक विक्रीचा असा विक्रम औरंगाबादेत नोंदला गेला.

मुस्लिम समाजात वाचन संस्कृती रुजावी यासाठी मनुष्यबळ विकास मंत्रालयाअंतर्गत उच्च शिक्षण विभागाच्या राष्ट्रीय उर्दू भाषा विकास परिषदेने 'बच्चों की दुनिया' हे उर्दू मासिक काढले आहे. रंगीत गुळगुळीत कागदावरील छपाई, आकर्षक छायाचित्रे, विज्ञान-तंत्रज्ञान, स्वातंत्र्यलढा, वैज्ञानिक आणि महापुरुषांच्या गौरवगाथा, भारतीय सणवार, चांगल्या सवयी, नागरिकांची कर्तव्ये आणि देश-विदेशातील ताज्या घडामोडींची माहिती यात असते. सोबतीला वॉल्ट डिस्नेची कार्टून्स, चित्र रंगवा, कोडी, जोक्स अशी मेजवाणी येथे आहे. एका अंकाचे मूल्य १० रुपये तर वार्षिक वर्गणी अवघी १०० रुपये आहे. उर्वरित. पान २

योग्य वयात वाचन संस्कार

आवडणारे साहित्य उपलब्ध करून दिले तर मुले वाचतात. असा आमचा अनुभव आहे. शालेय जीवनात वाचनाचे संस्कार झाले तर ते आयुष्यभर टिकतील. [illegible] ५० हजार [illegible] आहेत. ते आणखी वाढायला हवेत.

मिर्झा अब्दुल कय्युम बेग नदवी, [illegible]

अभ्यासात मदत होते

मासिकात गोष्टींसोबतच शाळेसाठी उपयुक्त [illegible] आहे. यामुळे आम्हाला शाळेच्या अभ्यासात मदत होते. निबंध लेखन, [illegible] उपयोगी ठरते. म्हणून आम्हाला हे पुस्तक आवडते.

- शेख [illegible]

दिल्ली येथून प्रकाशित होणाऱ्या 'बच्चों की दुनिया' या मासिकाचा एक अंक.

رسالوں کا رہتا ہے۔ مخمور صاحب کے انتقال کے بعد راقم کو یہ ذمہ داری دی گئی تو سبھی رفقائے کار کے تعاون سے، 'اردو دنیا' کو مزید بہتر بنانے کی کوشش کی گئی۔ رسالے کا فارمیٹ بدلا، متنی اور موضوعاتی پہلو سے اسے مزید متنوع بنایا گیا پیشکش کا انداز بدلا گیا اور صفحوں کی تعداد بڑھائی گئی۔

مگر اصل انقلابی تبدیلی آئی 2011 میں جب قومی اردو کونسل نے اسے عالمی معیار کے مطابق نئے گٹ اپ میں شائع کرنے کا فیصلہ کیا اور طے کیا گیا کہ اسے اچھے کاغذ پر مکمل رنگین چھاپا جائے گا۔ ستمبر 2011 میں جب اس وقت کے وزیر برائے فروغ انسانی وسائل جناب کپل سبل نے، اس طرز پر چھاپے گئے 'اردو دنیا' کے پہلے شمارے کا اجرا کیا تو جس نے بھی رسالہ دیکھا خوشی سے اچھل پڑا۔ جامع مسجد دہلی کے علاقے میں کئی دوکاندار 'اردو دنیا' کو اس کی طے شدہ قیمت سے زیادہ قیمت پر بیچتے پائے گئے۔ اردو رسالوں میں عوامی دل چسپی کی تھوڑی بہت جھلک ملنے لگی۔ ہندوستانی سنیما کے سو سال پورے ہونے پر شائع کیا گیا 'اردو دنیا' کا پہلا خاص نمبر ہاتھوں ہاتھ بک گیا۔ کئی مقامات پر اسے بلیک میں بیچے جانے کی خبریں ملیں۔ برسوں بعد یہ پہلا موقع تھا جب اردو کے کسی رسالے کی اور وہ بھی سرکاری اردو رسالے کی یہ پذیرائی دیکھنے میں آئی۔ خود اردو کونسل کے ڈائریکٹر خواجہ محمد اکرام الدین یہ دیکھ کر حیران تھے کہ انھوں نے خاص نمبر نکالنے کا جو فیصلہ کافی جھجکتے ہوئے لیا تھا وہ کامیابی کے ایسے خوش کن نتائج سامنے لے کر آرہا تھا۔

'اردو دنیا' کی اس کامیابی نے اردو رسائل کی دنیا میں یہ پیغام پہنچا دیا کہ سماج کے بدلتے ہوئے تقاضوں اور نئی ضرورتوں کی مطابقت میں ملی جلی نوعیت کے ادبی اور نیم ادبی قسم کے اردو رسالے شائع کیے جائیں تو لوگ انھیں شوق سے پڑھیں گے۔

لیکن اس سے بھی بڑا واقعہ 2013 کے نصف آخر میں پیش آیا۔ خواجہ اکرام الدین نے اردو کونسل کے وائس چیئر مین پروفیسر وسیم بریلوی کے مشورے پر ایک اور جوکھم بھرا فیصلہ کیا۔ فیصلہ یہ تھا کہ اردو کونسل بچوں کے لیے ایک رسالہ شروع کرے گی۔ یوں تو اس کی تجویزیں پہلے سے آرہی تھیں۔ کچھ دفتری کام بھی اس سلسلے میں ہوا تھا۔ لیکن یہ سب فائلوں میں تھا۔ کونسل کے وسائل ایسے رسالے کو شائع کرنے کے متحمل نہیں تھے۔ مگر ایک تعلیم داں منتظم اور ایک شاعر کی اس جوڑی نے وہ کر کے دکھا دیا جو سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ شاعر نے اپنے اثر ورسوخ کا استعمال کرتے ہوئے حکومت سے کونسل کا بجٹ بڑھوایا اور منتظم اعلیٰ نے 'بچوں کی دنیا' کے نام سے جون 2013 میں ایک اتنا خوب صورت رسالہ جاری کر دیا

جس کا خواب تک اردو والوں نے نہیں دیکھا تھا۔ 'بچوں کی دنیا' نے خاص طور سے بچوں میں وہ ہلچل مچائی کہ اردو والوں کو سچ مچ اپنی زبان پر فخر ہونے لگا۔

ایک دن اخباروں نے خبر چھاپی کہ 'بچوں کی دنیا' کے پانچ ہزار شمارے ایک ہی دن میں ایک ہی شہر میں فروخت ہوگئے جو ایک عالمی اردو ریکارڈ ہے۔ یہ واقعہ مالیگاؤں میں پیش آیا۔ کسی نے بتایا کہ 'بچوں کی دنیا' کی ایک لاکھ سے زیادہ کاپیاں صرف ساٹھ دنوں میں فروخت ہوئی ہیں اور یہ بھی اردو رسالوں کا ایک ورلڈ ریکارڈ ہے۔ اس کے بعد یہ خبر آنے میں بھی زیادہ وقت نہیں لگا کہ 'بچوں کی دنیا' کی تعداد اشاعت 67 ہزار تک پہنچ چکی ہے اور یہ اردو کے کسی بھی جریدے کی سب سے زیادہ اشاعت کا ہندوستانی ریکارڈ ہے۔ ہندی اور مراٹھی کے اخباروں میں بھی اس رسالے کا تذکرہ سامنے آیا۔

مگر یہ بھی سچ ہے کہ یہ صورت حال صرف مہاراشٹر کی بدولت ہے جہاں بچوں کے اردو رسالے اسکولوں میں اردو پڑھنے والے بچوں کو مہیا کرانے کا ایک مربوط نظام پہلے سے موجود ہے۔ قومی اردو کونسل کی خواہش ہے کہ ملک کے دوسرے علاقوں میں بھی اس طرح کے نظام تشکیل دینے کی مہم چلائی جائے تاکہ سبھی علاقوں کے بچوں میں جو کہ کسی بھی زبان کی ترقی و توسیع کی بنیاد ہوتے ہیں، اردو زبان کا ذوق وشوق پیدا ہو سکے۔

کونسل کے رسالوں 'اردو دنیا' اور 'بچوں کی دنیا' کی عوامی سطح پر سامنے آنے والی اس کامیابی نے ثابت کر دیا ہے کہ اردو سے محبت کا جذبہ ہمارے ملک میں پوری توانائی کے ساتھ موجود ہے۔ تقسیم وطن کا ڈسکورس پیچھے چھوٹ چکا ہے۔ تعصب کے بتوں کا بڑی حد تک صفایا ہو گیا ہے۔ اور ناامیدی کے بادل رفتہ رفتہ چھٹ رہے ہیں۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو کی توانائی کے تمام پہلوؤں کو ابھارا جائے، زبان کی ترقی کے لیے سب کی مدد لی جائے، اردو کو صرف مسلمانوں کی زبان اور اردو کے ہر رسالے کو محض اسلامی رسالہ بنانے کی ہر کوشش کو ناکام کیا جائے، سرکاری سطحوں پر اردو زبان کو ترقی اور فروغ دینے کے جتنے بھی موقعے موجود ہیں ان کا اردو کے فائدے کے لیے ہر ممکنہ حد تک استعمال کیا جائے، اور ہر دم اس زبان کا مرثیہ پڑھتے رہنے اور اردو کے لیے اٹھائے جانے والے ہر قدم پر شک کرنے کی عادت سے بچا جائے۔

آئندہ صفحات پر آپ زیر نظر کور اسٹوری کے تحت اردو رسالوں کی دنیا کا حال احوال کسی قدر تفصیل سے ملاحظہ فرمائیں گے۔ ہمیں یقین ہے کہ یہ سب پڑھ کر آپ بھی مجموعی طور سے اسی نتیجے پر پہنچیں گے کہ اردو رسالوں کا مستقبل اب ہم اردو والوں کے رویّے پر منحصر ہے۔

□

Nusrat Zaheer, NCPUL, New Delhi

رسالوں کی دنیا

ہندوستان میں ادبی رسائل کی ایک بھرپور تاریخ موجود ہے۔ یہاں صحافت کے آغاز کے ساتھ ہی اخباروں میں ادبی نگارشات بھی شائع ہونے لگیں۔ رفتہ رفتہ ادبی جریدوں نے جنم لیا اور انھی جریدوں کی گود میں ادب پارے پرورش پانے لگے۔ آج صورت حال یہ ہے کہ ملک کا کوئی بھی قابل ذکر شہر ایسا نہیں ہے جہاں سے رسالے شائع نہ ہوتے ہوں۔ ماضی کی خاک چھانیں تو نگار، شاہراہ، مخزن، ساقی اور اس نوع کے دیگر بہت سے رسائل نظر آئیں گے جنھوں نے اپنے عہد کو بڑی حد تک متاثر کیا اور ایک سے بڑھ کر ایک اچھے ادیب پیدا کیے۔ آگے چل کر 'بیسویں صدی' اور 'شب خون' جیسے رسالوں نے ایک طویل عرصے تک اہل ذوق افراد کی ذہنی آبیاری کی۔

لیکن آج پہلے کے مقابلے میں حالات بدل گئے ہیں۔ پہلے ذہنی تفریح کا ذریعہ صرف اخبارات و رسائل ہی ہوا کرتے تھے۔ مگر آج صورت حال میں انقلابی تبدیلی آگئی ہے۔ یہ انٹرنیٹ اور سائبر کا دور ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ یہ صارفیت کا بھی عہد ہے۔ بدلے ہوئے حالات نے جہاں بہت سی چیزیں بدل دی ہیں وہیں رسائل و جرائد پر بھی اثر پڑا ہے۔ اس عہد میں سب سے بڑا سوال یہی ہے کہ کیا آج بھی رسالوں کی وہی معنویت اور اہمیت ہے جو پہلے تھی اور اسی کے ساتھ یہ سوال بھی اہم ہے کہ جو رسالے نکل رہے ہیں ان کا مستقبل کیا ہے؟ جہاں تک پہلے سوال کا تعلق ہے تو زمانہ خواہ کتنی ہی ترقی کیوں نہ کر لے اور انفارمیشن ٹیکنالوجی سماجی ارتقا کی شہ رگ ہی کیوں نہ بن جائے رسائل اور بالخصوص ادبی رسائل کی اہمیت اور معنویت ہمیشہ باقی رہے گی۔ یہ بات الگ ہے کہ ان کی تعداد اشاعت میں تخفیف ہو جائے لیکن بہر حال اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ادبی ذوق کی پرورش میں ان کا رول ہر دور میں مسلم رہے گا۔ کیونکہ انسان کے، مادی ضرورتوں کے حصار میں جکڑے رہنے کے باوجود اس کو ذہنی غذا کی بھی ضرورت ہوگی اور اس غذا کی فراہمی میں رسالے سب سے تیز اور موثر ذریعہ ہیں۔ جہاں تک مطبوعہ رسائل کی بات ہے تو انٹرنیٹ کے اس عہد میں ان کی تعداد کم ہوتی جا رہی ہے۔ لیکن اس معاملے کو ہم دوسرے نظریے سے بھی دیکھ سکتے ہیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ حالات کے بدلنے کے ساتھ ساتھ رسائل نے اپنا قالب بدلنا شروع کر دیا ہے اور اب پرنٹ رسائل کے مقابلے میں نیٹ رسائل کی تعداد میں نسبتاً زیادہ اضافہ ہو رہا ہے۔ گویا مطبوعہ شکل ڈیجیٹل شکل اختیار کرتی جا رہی ہے۔ تاہم اس سے کوئی بھی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ مطبوعہ دور ہمیشہ باقی رہنے والا ہے۔ گو کہ تعلیم یافتہ طبقے کی انٹرنیٹ تک رسائی کا فیصد بڑھتا جا رہا ہے پھر بھی ایسے لوگ ہمیشہ موجود رہیں گے جو ڈیجیٹل کے مقابلے میں پرنٹ کو ترجیح دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ نیٹ ایڈیشن سے دلچسپی رکھنے والے بھی مطبوعہ ایڈیشن کو پسند کرتے ہیں۔ اس لیے یہ کہنا کہ پرنٹ رسائل کا دور ختم ہو جائے گا زیادہ قرین حقیقت نہیں لگتا۔

انفارمیشن ٹیکنالوجی کے اس انقلاب آفریں دور میں بھی شائع ہونے والے رسالوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ جن میں سرکاری اور غیر سرکاری دونوں شامل ہیں۔ سرکاری رسائل کی تعداد کم ہے اور نجی رسائل کی تعداد کہیں زیادہ ہے۔ سرکاری ادبی رسالوں میں آجکل، اردو دنیا، ایوان اردو، ہماری زبان، اردو ادب، فکر و تحقیق، کتاب نما، بچوں کی دنیا، امنگ (نئی دہلی)۔ نیا دور (لکھنؤ) زبان و ادب (پٹنہ) اور جمنا تٹ (چنڈی گڑھ) شامل ہیں۔ غیر ادبی سرکاری رسالوں میں یوجنا، سائنس کی دنیا اور سینک سماچار نئی دہلی سے نکلتے ہیں۔ بیشتر سرکاری ادبی رسائل و جرائد ریاستی اردو اکیڈمیوں اور دوسرے سرکاری اداروں سے شائع ہوتے ہیں۔ جبکہ پرائیویٹ رسائل و جرائد کی تعداد اس سے کئی گنا زیادہ ہے۔ ایک اندازے کے مطابق ان کی تعداد ڈیڑھ دو سو سے کم نہیں ہوگی۔ جن میں ذہن جدید، ادب ساز، جہان غالب، عالمی اردو ادب، بک ریویو، نئی کتاب، پیش رفت، رہنمائے تعلیم (دہلی) شاعر، اثبات، نیا ورق، تکبیر، اور تحریر نو (ممبئی)، اسباق (پونہ)، فنون (اورنگ آباد)، امکان، گلبن اور لاریب (لکھنؤ)، تمثیل نو اور جہان اردو (دربھنگہ)، انتخاب (گیا)، رنگ (دھنباد)، ثالث (مونگیر)، آمد (پٹنہ)، احساس (مالیگاؤں)، بزم ادب (علیگڑھ)، جوش بانی (الہ آباد)، مژگاں (کلکتہ)، انتساب (سرونج)، سرسبز (دھرم شالا ہماچل پردیش) ترویج (کٹک)، خوشبو کا سفر (حیدرآباد) تمثیل (بھوپال)، ادا کار (بنگلور)، نئی صدی (بنارس)، کہسار (بھاگلپور)، روزن (اڑیسہ)، ابجد (ارریا)، ادیب انٹرنیشنل (لدھیانہ)، دبستان (کڈپہ)، عالمی ادبی گزٹ (مئوناتھ بھنجن) اور صدا (جموں و کشمیر) قابل ذکر ہیں۔

رسائل کی یہ فہرست مکمل نہیں ہے۔ تاہم یہ تعداد اس حقیقت کے اظہار کے لیے کافی ہے کہ انٹرنیٹ کے اس دور میں بھی رسالوں اور جریدوں کی اہمیت باقی ہے اور آئندہ بھی باقی رہے گی۔ البتہ ادبی رسائل کے بارے میں بعض ادیبوں اور نقادوں کی رائیں بدل رہی ہیں۔ کچھ لوگ اس رائے کے حامی نظر آتے ہیں کہ موجودہ عہد میں جو کہ صارفیت کا عہد ہے مطبوعہ رسائل کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ان کے خیال میں مستقبل انٹرنیٹ کا ہے اس لیے وہی رسالہ زندہ رہے گا جس کی رگوں میں 'سائبر لہو' دوڑ رہا ہوگا۔ لیکن ایسے بھی لوگ ہیں جو اس بات سے اتفاق نہیں رکھتے۔ البتہ وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ اگر ادبی رسالوں کو بھی

عہدِ صارفیت کے تقاضوں سے ہم آہنگ کر دیا جائے تو ان کی بقا کا انتظام کیا جا سکتا ہے۔ آج کے دور میں صارفیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ جو اس کے دوش بہ دوش چلے گا وہی کامیاب ہوگا۔

یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ بہت سے پرانے اور اچھے رسائل بند ہو گئے ہیں یا بند ہوتے جا رہے ہیں۔ لیکن اس کے متوازی یہ بھی ایک سچائی ہے کہ بہت سے نئے نئے رسالے جنم بھی لے رہے ہیں۔ ہاں وہ رسالے ضرور بہت جلد دم توڑ دیتے ہیں جو یا تو سرمائے کی آکسیجن کے بغیر نکلتے ہیں یا جن کی سوچ فرسودہ ہوتی ہے اور جو زمانے کے تقاضے کے مطابق نئے نئے تجربات سے گزرنے سے خوف کھاتے ہیں۔ جو رسائل سماج کی بدلتی سوچ اور بدلتے معیار کو سامنے رکھتے ہیں اور اس کے مطابق اپنی روش طے کرتے ہیں ان کے لیے بقا کا مسئلہ اتنا سنگین نہیں ہے جتنا کہ منجمد اور فرسودہ سوچ والے رسائل کا ہے۔ جو رسائل ادب میں نئے نئے مباحث کے دروازے کھولتے ہیں اور نئے ادبی ڈسکورس سے قارئین کو متعارف کراتے ہیں وہ تادیر زندہ رہتے ہیں۔ آج ایسے بہت سے رسالے ہیں جو اپنے زندہ ہونے کا ثبوت دینے کے لیے عالمی ادب کی نمائندہ تحریروں کو اپنے صفحات پر جگہ دے رہے ہیں اور اپنے قارئین کی ذہنی آبیاری کے لیے جدید انداز اختیار کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے رسالے اپنی موت کے باوجود زندہ رہتے ہیں اور ایسے بھی بہت سے رسالے ہیں جو زندہ ہونے کے باوجود مردہ سمجھے جاتے ہیں۔ وہ رسالے بھی تادیر زندگی کی حرارت سے ہم آغوش رہتے ہیں جو نئے نئے مگر اچھے ادیبوں کی کھیپ تیار کرتے ہیں۔ آخر انھی رسائل کے صفحات پر کرشن چندر، عصمت چغتائی، سعادت حسن منٹو اور دوسرے بہت سے ادیبوں اور شاعروں نے اپنے بال و پر کھولے اور وہی صفحات ان کے لیے نئی دنیاؤں میں پرواز کرنے کے لانچنگ پیڈ ثابت ہوئے۔ آج اس قسم کے رسالے بھی بند ہونے کے باوجود زندہ ہیں اور وہ ادیب و شاعر بھی دنیا سے چلے جانے کے باوجود سماج کے ذہنوں میں اپنی زندگی کا ثبوت دے رہے ہیں۔

اس تعلق سے ماہنامہ 'رہنمائے تعلیم آف لاہور' کا ذکر ضروری ہے کہ اس نے 105 سال کی عمر پائی۔ اسے سردار جگت سنگھ نے 1905 میں پاکستان کے پنڈی کھیپ سے شروع کیا تھا۔ یہ 1947 تک لاہور سے نکلتا رہا۔ تقسیم وطن کے بعد سردار جگت سنگھ اپنے اہل خاندان کے ساتھ دہلی آگئے اور یہاں سے انھوں نے اسے 1947 سے نکالنا شروع کیا۔ 1962 میں ان کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے سردار ہربھجن سنگھ تھاپر اسے نکالتے رہے۔ انھوں نے اس رسالے کی عمر ایک صدی سے اوپر پہنچا دی۔ وہ آخر وقت تک اس کے مدیر رہے۔ 2006 میں ان کے انتقال کے تین مہینے بعد یہ رسالہ بند ہو گیا۔ البتہ اسی نام سے ملتا جلتا ایک دوسرا رسالہ ابونعمان 2006 سے نکال رہے ہیں۔ وہ رہنمائے تعلیم آف لاہور سے 1967 سے وابستہ رہے ہیں۔ اس رسالے کی ایک شاندار روایت رہی ہے جس کا اعتراف اردو کے انتہائی جید قلمکاروں، شاعروں اور ادیبوں نے کیا ہے۔ جن میں علامہ اقبال، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، ناخدائے سخن نوح ناروی، جوش ملسیانی، ملا رموزی، عبد الرؤف عشرت، خواجہ حسن نظامی اور بیشتر وزرا، سیاستداں اور انگریزی روز نامہ مسلم آؤٹ لک لاہور، زمانہ کانپور، زمیندار لاہور، معارف اور دیگر بے شمار ادبا شعرا علما وفضلا شامل ہیں۔ اس پرچے نے چند بہت اچھے اور معیاری خصوصی شمارے شائع کیے تھے۔

مرکزی حکومت کے ادارے پبلی کیشن ڈویژن دہلی سے شائع ہونے والے ماہنامہ 'آجکل' کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہ پرچہ 72 برسوں سے نکل رہا ہے اور اس سے جوش ملیح آبادی، معین احسن جذبی، جگن ناتھ آزاد اور دوسرے بہت سے قد آور ادیب و شاعر وابستہ رہے ہیں۔ اس نے بھی بہت سے خصوصی شمارے شائع کیے ہیں جو اردو ادب کی تاریخ میں سنگ میل کا درجہ رکھتے ہیں۔ جن میں اقبال، میر، غالب، نظیر اکبرآبادی، مولانا آزاد، منٹو، جاں نثار اختر، غلام ربانی تاباں وغیرہ پر خصوصی شماروں کے علاوہ 1857 کی پہلی جنگ آزادی کی ڈیڑھ سو سالہ تقریب کی مناسبت سے خصوصی شمارہ اور ہندوستانی فلم انڈسٹری کے سو سال پورے ہونے پر خصوصی شمارہ قابل ذکر ہیں۔

حکومت اتر پردیش کے محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ لکھنؤ سے شائع ہونے والے ماہنامہ 'نیا دور' کی بھی اپنی ایک تاریخ ہے۔ یہ پرچہ کم وبیش 68 برسوں سے نکل رہا ہے۔ اس نے بہت سے خصوصی شمارے شائع کیے ہیں جو اپنی مثال آپ ہیں۔ جن میں نصف صدی نمبر، اودھ نمبر، منشی نولکشور نمبر، بہادر شاہ ظفر نمبر وغیرہ۔ اس کے علاوہ اس نے فراق گورکھپوری، مسعود حسن، عبدالماجد دریابادی، مہاتما گاندھی، جمہوریت، اندرا گاندھی، فیض احمد فیض، قرۃ العین حیدر، مجاز وغیرہ پر خصوصی شماروں کے علاوہ اردو صحافت نمبر بھی شائع کیا ہے۔ مذکورہ رسالوں نے اردو معاشرے کو ایسا معیاری ادب پیش کیا ہے اور آج بھی پیش کر رہے ہیں جو اس کے اعلا ذوق کو جلا بخشتے ہیں اور اسے تہذیبی وثقافتی طور پر مالا مال کرتے ہیں۔

لیکن آج کے بدلتے ہوئے ماحول میں یہ سوال اٹھتا ہے کہ قارئین کو کس قسم کی تخلیقات دی جائیں اور وہ کیسا ادب پسند کرتے ہیں۔ دراصل یہ سوال ان لوگوں کے سامنے زیادہ شدت سے کھڑا ہو رہا ہے جو عصری تقاضوں کو سمجھنے سے قاصر ہیں اور جن کا وژن محدود ہے۔ جو مدیر حضرات قارئین کی نبض پہچانتے ہیں وہ ان کی پسند کا خیال اور لحاظ بھی رکھتے ہیں۔ لیکن ایسے بھی مدیر حضرات ہیں جو اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر اپنی پسند کی چیزیں پیش کرتے ہیں اور قارئین ان کو پسند بھی کرتے ہیں۔ ماضی میں 'جاسوسی دنیا' کی مثال پیش کی جا سکتی ہے جسے خریدنے کے لیے قارئین لائن لگائے رہتے تھے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ مدیر حضرات میں اس کی صلاحیت ہو کہ وہ اپنی پسند کی چیزیں قاری کو پڑھوا سکیں۔ ظاہر ہے یہ کام وہی کر سکتا ہے جس کی نہ صرف قومی ادب پر بلکہ عالمی ادب پر بھی گہری نظر ہو اور جو بدلتے ہوئے رجحانات و میلانات کو سامنے رکھ کر اور نئی نئی چیزوں کو

سلیقے کے ساتھ پیش کرنے کی اہلیت بھی رکھتا ہو۔

رسالوں میں مواد کے ساتھ ساتھ ترسیل اور مالی منافع کا بھی مسئلہ ہوتا ہے۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ آج رسالوں اور جریدوں کے مالکوں اور مدیروں کے سامنے ترسیل کا مسئلہ نہیں ہے۔ آج پرچے بھیجنے کی بہت سی سہولتیں پیدا ہوگئی ہیں جن سے لوگ استفادہ کر رہے ہیں۔ البتہ مارکیٹنگ کا مسئلہ ہے۔ جو پرچے اس فن سے واقف ہیں وہ اپنی تعداد اشاعت میں مسلسل اضافہ کر رہے ہیں۔ مثال کے طور پر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان سے شائع ہونے والا بچوں کا رسالہ 'بچوں کی دنیا' ہے۔ اس کے آغاز پر اس کی تعداد اشاعت بہت زیادہ حوصلہ افزا نہیں تھی۔ لیکن چند مہینوں کے اندر ہی اس کے سرکولیشن میں بے پناہ اضافہ ہوگیا۔ یہاں تک کہ بعض شہروں میں اس رسالے کی ہزاروں ہزار کاپیاں فروخت ہو رہی ہیں۔ اس کا سہرا بلا شبہ کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر خواجہ اکرام الدین اور اس کے اعزازی مدیر جناب نصرت ظہیر کے سر جاتا ہے جنھوں نے اس کو اتنا خوبصورت، متنوع اور معیاری بنایا ہے کہ وہ آج کے انٹرنیٹ کے عہد میں بھی بچوں کی ذہنی آبیاری کر رہا ہے۔ اس کے ساتھ ہی قومی کونسل کے مارکیٹنگ شعبے کو بھی اس کا کریڈٹ دینا ہوگا۔ اسی طرح ماہنامہ 'اردو دنیا' ہے جو اپنی خوبصورت چھپائی، کاغذ اور معیار کے لحاظ سے دوسرے رسائل سے کہیں آگے ہے۔ ان دونوں رسالوں کے سامنے نہ تو ترسیل کا مسئلہ ہے اور نہ ہی مارکیٹنگ کا۔ مارکیٹنگ کے مسائل سے دوسرے سرکاری پرچے زیادہ دوچار ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سرکاری محکموں میں موجود بعض افراد اس سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے۔ اگر وہ ان پرچوں کو اپنا پرچہ تصور کر کے ان کو بیچنے کے نئے نئے طریقے ڈھونڈھیں تو ان کے لیے بھی کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔ جیسے کہ 'آجکل' ہے۔ وہ ایک بہت اچھا پرچہ ہے اور اس سے بڑے بڑے ادیب اور انتہائی سرکردہ شخصیات وابستہ رہی ہیں۔ اس کے قارئین کا حلقہ بھی اہل ذوق افراد پر مشتمل ہے۔ اس میں فروخت ہونے کے بھی امکانات بھی ہیں اور اس کا ذوق بھی ادبی ہے۔ لیکن اس کا سرکولیشن حوصلہ شکن ہے۔

پرائیویٹ رسالوں نے اپنی بقا کے لیے بدرجہ مجبوری ایک ایسا راستہ اختیار کر لیا ہے جو زیادہ لوگوں کو پسند نہیں۔ وہ راستہ ہے گوشے نکالنے کا۔ اس کا آغاز 'شاعر' جیسے تاریخی پرچے نے کیا جسے حضرت سیماب اکبرآبادی نے شروع کیا تھا۔ کسی بھی رسالے کو زندہ رکھنے کے لیے صرف تخلیق کار اور قارئین ہی کافی نہیں بلکہ خطیر سرمائے کی بھی ضرورت پڑتی ہے۔ سرمائے کے بغیر کوئی رسالہ نہ تو چھپ سکتا ہے اور نہ ہی قارئین کے پاس بھیجا جا سکتا ہے۔ تو پھر اس صورت میں جبکہ پرچے منافع بخش نہ رہ جائیں اور ان کے سروں پر امراء اور اہل خیر حضرات کے دست شفقت نہ ہوں تو پھر ان کے زندہ رہنے کی کیا صورت ہو سکتی ہے۔ اسی لیے اب دوسرے نجی پرچوں نے بھی شاعر کی روش اختیار کر لی ہے اور اب وہ بھی گوشے نکالنے لگے ہیں۔ شروع میں تو لوگوں کی سمجھ میں نہیں آیا کہ دوسرے اور تیسرے درجے کے شعرا و ادبا پر گوشے کیوں نکالے جا رہے ہیں۔ لیکن اب کچھ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ لوگ گوشے دیکھ کر خود بخود سمجھ جاتے ہیں کہ فلاں شاعر یا ادیب پر اتنے صفحات کیوں صرف کیے گئے۔ ہاں کچھ پرچے ایسے بھی ہیں جو گوشے تو نکالتے ہیں لیکن اس بارے میں معیار کا خیال بھی رکھتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی وہ ایسی سربرآوردہ شخصیات پر گوشے شائع کرتے ہیں جن کے بارے میں یہ سوچا بھی نہیں جا سکتا کہ انھوں نے اس کے عوض پرچے کے اہتمام اور طباعت کی ذمے داری لی ہوگی۔ کیونکہ ان کو اس کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ ان کا قد ادب و شاعری میں اتنا بلند ہے کہ لوگ از خود ان پر مضامین شائع کر کے اپنے پرچوں کو وقیع اور معیاری بناتے ہیں۔ لیکن بہرحال اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ گوشوں کی اشاعت سے ان پرچوں نے اپنی بقا کا کسی نہ کسی طرح انتظام کر لیا ہے جن کے ایڈیٹر مالی اعتبار سے مستحکم نہیں ہیں۔ اسے پسند کیا جائے یا نہ کیا جائے۔

کچھ سیاسی پرچے بھی شائع ہوتے ہیں جن میں دہلی سے نکلنے والے ماہنامہ 'افکار ملی' اور ماہنامہ 'ملی اتحاد' کا نام لیا جا سکتا ہے۔ افکار ملی 29 برسوں سے اور ملی اتحاد 21 برسوں سے نکل رہا ہے۔

اوپر بچوں کے رسالہ 'بچوں کی دنیا' کا ذکر آیا ہے لہٰذا چند باتیں بچوں کے رسالوں پر بھی گوش گزار کی جا رہی ہیں۔ گوجراں والا پاکستان کے منشی محبوب عالم نے 1902 میں 'بچوں کا اخبار' نام سے بچوں کا رسالہ شروع کیا تھا جسے ادب اطفال میں اولین رسالے کا شرف حاصل ہے۔ وہ دس سال نکلا۔ اس کے بعد مولوی ممتاز علی نے 'پھول' نکالا جو 48 سال تک نکلنے کے بعد 1958 میں بند ہوا۔ مکتبہ جامعہ کا رسالہ 'پیام تعلیم' بھی اپنی ایک تاریخ رکھتا ہے۔ وہ 1926 میں شروع ہوا اور اب تک نکل رہا ہے۔ شمع گروپ کا رسالہ 'کھلونا' بھی بہت مقبول پرچہ تھا۔ اس کے علاوہ نور رامپور، غنچہ بجنور، بچوں کا اچھا ساتھی سرکڑہ بجنور، کلیاں لکھنؤ، ٹافی، اسکول ٹائم اور گل بوٹے ممبئی، امنگ نئی دہلی جیسے رسالوں کی بھی اپنی تاریخ ہے۔ اس کے علاوہ بنگلور سے غبارہ اور حیدرآباد سے فنکار نکل رہے ہیں یہ بھی بچوں کے رسالے ہیں۔ اب 'بچوں کی دنیا' نے ادب اطفال میں ایک نیا باب جوڑا ہے اور امید نہیں بلکہ یقین ہے کہ یہ پرچہ اس سلسلے میں سنگ میل کا درجہ حاصل کرے گا۔

البتہ آج کل طنز و مزاح کے پرچے کم نکلتے ہیں۔ پہلے کئی رسالے نکلتے رہے ہیں لیکن اس وقت ہندوستان اور پاکستان سے طنز و مزاح کا واحد معیاری رسالہ 'شگوفہ' ہے جو حیدرآباد سے نکلتا ہے۔ اس میدان میں اس نے جو تاریخ مرتب کی ہے وہ کسی بھی پرچے کے لیے باعث فخر ہو سکتی ہے۔ یوں تو جب بھی طنز و مزاح کی بات آتی ہے تو لکھنؤ کے 'اودھ پنچ' کا نام لیے بغیر بات مکمل نہیں ہوتی۔ اس رسالے نے طنز و مزاح کی صنف کے فروغ میں جو نمایاں رول ادا کیا ہے اسے اردو دنیا کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ لیکن معیار، سلیقہ، تعداد اشاعت اور تسلسل اشاعت کے سلسلے میں 'شگوفہ' نے بھی ایک تاریخ رقم کی ہے۔ یہاں تک کہ اس نے طنز و مزاح کے میدان میں اودھ پنچ کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ یہ

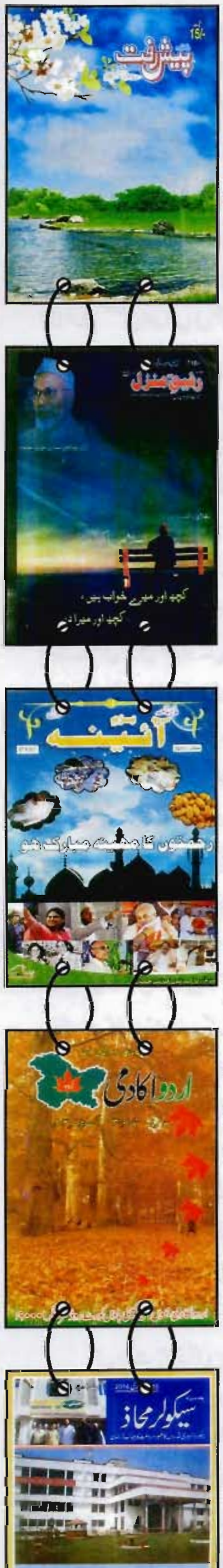

رسالہ 47 برسوں سے پابندی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔ اس کا ایک بھی شمارہ نہ تو ناغہ ہوا ہے اور نہ ہی ایک سے زائد شماروں پر مشتمل اس کا کوئی شمارہ نکلا ہے۔ اس کا سہرا بلا شبہ اس کے ایڈیٹر مصطفیٰ کمال کے سر جاتا ہے جو تقریباً نصف صدی سے مسلسل اسے نکال رہے ہیں۔ کسی بھی ایڈیٹر کے لیے اتنی لمبی مدت تک کسی رسالے کی ادارت کی ذمے داری سنبھالنا بھی فخر کی بات ہے۔ اس رسالے کی اشاعتِ مسلسل اور اس کی مقبولیت کی وجہ یہ ہے کہ اس کو زمانے کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہونے کا فن آتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس نے کبھی بھی معیار سے سمجھوتہ نہیں کیا۔ اس میں طنز و مزاح کے اعلیٰ نمونے شائع ہوتے ہیں چھچھورے اور مزاح کے نام پر بھانڈ پن والے مضامین نہیں۔ شگوفہ کے علاوہ بنگلور سے طنز و مزاح کا ایک رسالہ 'ظرافت' نکلتا ہے لیکن وہ ماہنامہ نہیں بلکہ سہ ماہی ہے۔

ادبی رسالوں کے مساوی ملک بھر سے مذہبی رسالے بھی بڑی تعداد میں شائع ہوتے ہیں۔ ہندوستان میں مذہبی صحافت کا آغاز انیسویں صدی میں عقائد کے تصادم کے نتیجے میں ہوا تھا۔ رفتہ رفتہ مذہبی رسالوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا اور آج بیشتر بڑے اور متوسط دینی مدارس اپنا پرچہ نکالتے ہیں۔ متعدد دینی و مذہبی تنظیمیں بھی اپنا رسالہ نکالتی ہیں۔ اگر ہم مواد اور مضامین کے اعتبار سے ان رسالوں کی زمرہ بندی کریں تو انھیں علمی و تحقیقی، مذہبی و مسلکی، نیم مذہبی نیم سیاسی اور عوامی زمروں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ لیکن جو رسالے اور جریدے اس وقت شائع ہو رہے ہیں ان میں اول الذکر قسم کی تعداد بہت کم ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر ان کا مزاج علمی اور تحقیقی رکھا جائے گا تو وہ اپنے 'مقصد' میں ناکام رہیں گے۔ البتہ کچھ پرچے ایسے بھی ہیں جن میں علمی و تحقیقی مضامین شائع ہوتے ہیں۔ جیسے کہ 'معارف' اعظم گڑھ، 'بحث و نظر' دہلی اور 'تحقیقات اسلامی' علی گڑھ۔

اس وقت جو مذہبی پرچے نکل رہے ہیں ان میں دہلی سے زندگی نو، التبیان، ماہ نور، جام نور، اللہ کی پکار، ذکریٰ، نوائے اسلام، الرسالہ، ہدیٰ اور ترجمان دار العلوم قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ معارف اعظم گڑھ، محدث بنارس، اشرفیہ مبارکپور، ضیائے وجیہ رامپور، الفرقان ڈومریا گنج، استدراک دریاباد، فکر اسلامی بستی، اصلاح اور شعائے عمل لکھنؤ اتر پردیش۔ (اصلاح نے ایک صدی سے بھی زیادہ عمر پالی ہے۔ اس کا صدی ایڈیشن 1999 میں شائع ہوا تھا اور یہ اب بھی نکل رہا ہے)۔ البلاغ صوت الحق ممبئی، سنی دعوت اسلامی اور صوت الحق مالیگاؤں مہاراشٹر۔ پیام توحید کشن گنج، ندائے پاسدار پٹنہ اور سہ ماہی جام شہود بہار۔ الفیصل، ردائے حرم، ضیائے علم اور بطحا حیدرآباد۔ دین مبین بھوپال، دار السلام مالیر کوٹلہ پنجاب، ہدایت جے پور، مجلہ اہلحدیث شکراوہ ہریانہ، راہ اعتدال چنئی، صوت القرآن احمدآباد، الحیات، حکیم الامت، فکر و نظر، النور اور المصباح جموں و کشمیر قابل ذکر ہیں۔ ملک بھر سے نکلنے والے دینی رسائل کی تعداد دو سو سے زائد ہے۔ لیکن ان میں سے بیشتر پرچے غیر معیاری ہیں اور ان کا سرکولیشن بھی بہت کم ہے۔ ان پرچوں میں مسلکی شدت بہت زیادہ ہوتی ہے اور کچھ رسالے تو ایسا لگتا ہے جیسے مناظرہ کر رہے ہوں۔ ان پرچوں کے غیر معیاری ہونے کی کئی وجہیں ہیں جن میں ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کے مدیر عام طور پر غیر صحافی ہوتے ہیں۔

مدارس میں تدریسی خدمات انجام دینے والوں میں سے کسی ایک کو اس کی ادارت کی ذمہ داری سونپ دی جاتی ہے جو ششم فششم اسے نکالتا رہتا ہے۔ اسی لیے ایسے بہت سے رسالے پابندی کے ساتھ نکل بھی نہیں پاتے۔ کبھی کوئی شمارہ ناغہ ہو گیا تو کبھی زائد از ایک شماروں پر مشتمل شمارہ نکال دیا گیا۔ لیکن بہرحال معاشرے پر ان رسالوں کے اثرات سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کسی زمانے میں دیوبند سے نکلنے والے مولانا عامر عثمانی کا رسالہ 'تجلی' کی مثال پیش کی جا سکتی ہے۔

اسی طرح طبی رسائل بھی خاطر خواہ تعداد میں نکلتے ہیں۔ جن میں حکومتی ادارے این سی آر یو ایم سے نکلنے والا پرچہ 'جہان طب' بھی ہے۔ اس کے علاوہ دہلی ہی سے 'الشفا' اور 'مسائل دین و دنیا اور طب' الہ آباد سے 'نوائے طب و صحت' اور ہمدرد سے پندرہ روزہ 'ہمدرد' بھی شائع ہوتے ہیں۔ ان میں جہان طب غالباً سب سے پرانا رسالہ ہے۔ اس کے بعد الشفا کا نمبر آتا ہے۔ یہ دونوں پرچے کافی معیاری ہیں اور ان کا سرکولیشن بھی خاصا ہے۔ ان پرچوں کے علاوہ مختلف دواساز کمپنیاں بھی اپنے پرچے نکالتی ہیں جو ادویات کی تشہیر کے لیے وقف ہیں۔ ان پرچوں کی اہمیت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔

اس طرح پورے ملک سے خاصی تعداد میں ادبی، سیاسی، طبی اور مذہبی رسالے نکلتے ہیں۔ لیکن اردو آبادی کے لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ تعداد بہت کم ہے۔ ابھی مزید رسالوں کی گنجائش ہے۔ یا جو رسالے شائع ہو رہے ہیں ان کا سرکولیشن بڑھ سکتا ہے، ان کے قارئین کی تعداد میں اضافہ ہو سکتا ہے۔ لیکن اس کے لیے اردو والوں کو سامنے آنا ہوگا۔ انھیں یہ ثابت کرنا ہوگا کہ انھیں اردو سے محبت ہے اور وہ اردو کو چاہتے ہیں۔ ابھی تک ہم ایسا کوئی بھی ثبوت دینے سے قاصر ہیں۔ ہم اردو کو دوسری زبان بنانے اور اس کو اس کا جائز حق دینے کی باتیں تو بہت کرتے ہیں اور اردو کے نام پر پروگرام بھی منعقد کرتے ہیں لیکن سچائی یہ ہے کہ یہ سب کچھ دکھاوا ہے ریاکاری ہے۔ ہمیں نہ تو اردو زبان سے کوئی لگاؤ ہے اور نہ ہی ہم اس کی قدر کرتے ہیں۔ ہم حکومتوں سے یہ مطالبہ تو کرتے ہیں کہ وہ اردو کو روزگار سے جوڑے لیکن ہم خود اس سلسلے میں کوئی کوشش کرنا نہیں چاہتے۔ یہ تو اردو زبان ہے جو اپنی سخت جانی کی وجہ سے زندہ ہے۔ ورنہ دوسروں کو کیا کہا جائے خود ہم اردو والوں نے اسے زندہ درگور کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑ رکھی ہے۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اردو کے اساتذہ ہوں یا اردو کے اخباروں میں کام کرنے والے لوگ ہوں، سب اردو کے مجرم ہیں۔ دہلی اور اتر پردیش سمیت پورا شمالی ہند کسی زمانے میں اردو کا مرکز ہوا کرتا تھا لیکن آج اسی مرکز سے اردو کا جنازہ بڑی دھوم دھام سے نکل رہا ہے اور وہ ہم ہی ہیں جو بڑھ چڑھ کر اس کو کاندھا دے رہے ہیں۔ اتر پردیش کو تو ہم نے اردو کی ایک وسیع قبرگاہ میں تبدیل کر دیا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنا محاسبہ کریں اور اردو زبان کی ترویج و اشاعت کے سلسلے میں کم از کم اردو رسائل و جرائد خرید کر پڑھیں تا کہ نہ صرف یہ کہ وہ زندہ رہیں بلکہ ہماری اور آنے والی نسلوں کی ذہنی نشوونما میں بھرپور کردار بھی ادا کریں۔

□

Suhail Anjum , 370/6A, Zakir Nagar
New Delhi-110025

شگفتہ یاسمین

ہندوستان میں غیر ملکی اداروں کے اردو رسالے

اردو کی شناخت محض ایک وسیع پیمانے پر بولی جانے والی عام فہم زبان کی نہیں ہے بلکہ یہ ایک ایسی زبان ہے جس کی ایک قابلِ توجہ ثقافتی اہمیت اور مقامی رنگ ہے۔ یہ زبان گزشتہ آٹھ سو برس کے ہندوستان کی عظیم وراثت اور ثقافت کی نمائندگی کرتی ہے۔

اردو کی اسی نمایاں حیثیت نے غیر اردو داں طبقے اور دیگر ممالک کے دانشوروں کو اپنی جانب متوجہ کیا اور اردو زبان جاننے اور سیکھنے کے لیے غیر ملکیوں کی دلچسپی بڑھی اور غیر ملکی اداروں نے صحافت کو میدان عمل بنا کر اردو داں طبقے تک اپنی بات پہنچائی۔ غیر ملکی اداروں کے ذریعے منظرِ عام پر آنے والے رسائل و جرائد کی حیثیت خالص ادبی نہیں بلکہ معلوماتی نوعیت کی ہے۔ یہ دو ملکوں کے باہمی روابط کو فروغ دینے والے پل کی مانند ہیں۔ ہندوستان سے شائع ہونے والے جرائد و رسائل غیر مقیم ہم وطنوں کی دلچسپیوں اور سرگرمیوں کے حوالے سے اکثر و بیشتر مضامین شائع کرتے رہتے ہیں لیکن اس سمت میں غیر معمولی کام غیر ملکی اداروں کے ذریعے شائع ہونے والے رسائل و جرائد نے انجام دیے ہیں۔ یہ رسائل و جرائد نہ صرف غیر مقیم ہندوستانیوں کی دلچسپیوں، سرگرمیوں اور وطن کے لیے ان کے جذبۂ تعمیر کے ترجمان ہیں بلکہ کبھی براہِ راست اور کبھی بالواسطہ طور پر اردو زبان و ادب کی توسیع و ترویج کا ذریعہ بھی ہیں۔

اس سلسلے میں اولیت کا شرف سابق سوویت یونین کو حاصل ہوا ہے۔ ستر کی دہائی میں متحدہ سوویت یونین کی راجدھانی ماسکو سے 'سوویت یونین' کے نام سے ایک اردو

> غیر ملکی اداروں کے ذریعے شائع ہونے والے رسائل و جرائد نہ صرف غیر مقیم ہندوستانیوں کی دلچسپیوں، سرگرمیوں اور وطن کے لیے ان کے جذبۂ تعمیر کے ترجمان ہیں بلکہ کبھی براہِ راست اور کبھی بالواسطہ طور پر اردو زبان و ادب کی توسیع و ترویج کا ذریعہ بھی ہیں

رسالہ شائع ہوتا تھا جب کہ ہندوستانی سفارت خانے سے 'سوویت لینڈ' کے نام سے اردو میں رسالہ نکلا کرتا تھا۔ آفسیٹ طباعت میں اس رسالے کا معیار ہندوستان سے شائع ہونے والے انگریزی رسالوں کے برابر نہیں بلکہ اس سے بھی بہتر ہوا کرتا تھا۔ خوبصورت سرورق، دیدہ زیب طباعت اور معلوماتی موضوعات پر مشتمل اس جریدے نے کئی برسوں تک اردو زبان کی خدمت انجام دی لیکن سوویت یونین کا شیرازہ بکھرتے ہی ان دونوں رسالوں کی اشاعت بھی موقوف ہوگئی۔

ہند ایران تعلقات بہت قدیم ہیں اور تاریخی و ثقافتی اعتبار سے بھی دونوں کے درمیان بہت سی قدریں مشترک ہیں اور انہی میں سے ایک اُردو زبان و ادب بھی ہے۔ حکومت ایران کے اردو رسالے 'راہِ اسلام' کا مقصد انقلابِ ایران کے بعد دنیا کے نقشے پر ابھر کر سامنے آنے والی اسلامی حکومت کی حقیقی شبیہ کو اجاگر کرنا تھا۔ اسی ضرورت کی تکمیل کے لیے ایرانی سفارت خانے کے توسط سے ایک مجلّے کا اجرا عمل میں آیا۔ چونکہ یہ مجلّہ دیگر ممالک میں موجود ایران کے تمام سفارت خانوں میں بھی ارسال کیا جاتا ہے۔ لہٰذا اپنے قومی و ملکی عقائد و نظریات اور پالیسیوں کی ترجمانی کے ساتھ ساتھ اُردو کے فروغ کا وسیلہ بھی بن جاتا ہے۔

ایران کے تمام سفارتی دفاتر جو دیگر ملکوں میں ہیں وہاں اس رسالے کی 10 کاپیاں ارسال کی جاتی ہیں اور وہاں رہنے والے اردو داں حضرات اس کا مطالعہ کرتے ہوئے اپنے تاثرات ادارے کو ارسال کرتے رہتے ہیں۔

ہند امریکی روابط بھی بہت قدیم ہیں اور وقت کے

ساتھ ساتھ ان روابط میں تجدید و اشتراک کی بہت سی مثالیں سامنے آئی ہیں۔ دو جمہوری ملک جو اب گلوبل پارٹنر بن گئے ہیں ان کے مابین مشترکہ دلچسپی کے کئی امور ہیں جن میں تعلیم، صحت، سائنس و ٹکنالوجی، خلائی تحقیق و ترقی اور تجارت و صنعت وغیرہ اہم شعبے ہیں اس کے علاوہ تعلیم اور سیاحت عوامی دلچسپی کے خاص موضوعات ہیں اور ان تمام شعبوں میں دونوں ممالک کی ساجھیداری اور مشترکہ عوامی امنگوں کا ترجمان ہے امریکن سینٹر سے شائع ہونے والا رسالہ ''SPAN''۔ ہندوستانی طلبا کی اچھی خاصی تعداد امریکہ میں زیر تعلیم ہے ایسے میں اپنی دلچسپی کے مدنظر تعلیمی اداروں کا انتخاب، تدریسی سہولیات کی جانکاری، ویزا سے متعلق معلومات وغیرہ کو SPAN کے مشمولات میں خاص طور پر شامل کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ کئی امریکی طلبا ایسے بھی ہیں جنھیں اُردو زبان سے لگاؤ، ہندوستانی تہذیب و ثقافت کی رنگارنگی یا فنون لطیفہ سے دلچسپی سرزمین ہند کا رخ کرنے کے لیے راغب کرتی ہے ان کی سرگرمیوں کا دلچسپ تذکرہ بھی SPAN کے صفحات میں بطور خاص جگہ پاتا رہتا ہے۔ سیاحت کے شائقین کے لیے بھی امریکہ ایک پسندیدہ مقام ہے ایسے میں سفر و سیاحت کا پروگرام بناتے وقت صحت افزا اور تفریحی مقامات کی جانکاری، قیام و طعام کی سہولیات سے متعلق واقفیت قارئین کو بہم پہنچانے کا خاص التزام نظر آتا ہے۔ امریکہ میں آباد غیر ملکی تارکین وطن میں قابلِ قدر تعداد ہندوستانیوں کی بھی ہے جو وہاں کی سماجی، تہذیبی اور سیاسی سرگرمیوں میں نہ صرف مؤثر رول ادا کرتے ہیں بلکہ اپنے مذہبی رسوم و رواج اور پرب تہواروں کے ذریعے ہندوستان کی نمائندگی بھی کرتے ہیں۔ خورد و نوش اور بود و باش کی اس گونا گونیت کو بھی SPAN اکثر و بیشتر منظر عام پر لاتا رہتا ہے۔ 2003 میں ''اسپین'' کے اردو اور ہندی اڈیشنوں کا اجرا عمل میں آیا۔

اس میں شک نہیں کہ بدلتے دور اور زمانے کے تقاضوں کے پیش نظر انگریزی زبان ایک عالمی زبان اور ذریعہ تعلیم کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ اور اس سے صرف نظر بھی ممکن نہیں لیکن اپنی زبان کو پست اور حقیر سمجھ کر اس کی ناقدری کرنا اس زبان کی موت کے مترادف ہے کیونکہ کوئی زبان اُسی وقت تک زندہ رہتی ہے جب تک وہ اظہار و ابلاغ کا ذریعہ بنتی ہے خواہ وہ تحریری ہو یا تقریری یا پھر گفت و شنید کی صورت میں رابطے کا ذریعہ ہو۔

غالب کو یہ شکوہ تھا کہ ان کی شاعری کو وہ مقام نہیں ملا جس کی وہ مستحق تھی لیکن آج کلامِ غالب کی مقبولیت کا عالم یہ ہے کہ اس کے مداح دنیا کے ہر گوشے میں ملیں گے۔ دیوانِ غالب آج نہ صرف مغرب کی یونیورسٹیوں میں تعلیم و تحقیق کا موضوع ہے بلکہ اس کے ایسے پرستار بھی موجود ہیں جنھوں نے اپنی پوری زندگی تفہیم غالب کے نام کردی۔ اسپین نے ایک مضمون میں غالب کی ایک ایسی ہی مداح فرانسس ڈبلیو پریچیٹ کے کارہائے نمایاں پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے جو نہ صرف غالب کے دیوان میں شامل ان کی شاعری کا انگریزی ترجمہ پیش کر رہی ہیں بلکہ غالب کی شخصیت، ان کی شاعری اور ان کے دور سے متعلق جس قدر اہم معلومات مہیا کرائی جاسکتی ہیں اسے ویب سائٹ کے ذریعے پوری دنیا کے سامنے پیش کر دینا چاہتی ہیں۔

برطانیہ میں اردو کی آمد تارکین وطن کی وجہ سے نہیں بلکہ ملکہ وکٹوریہ کی ذاتی دلچسپی کے سبب ہوئی۔ ملکہ خود اردو زبان سیکھنا چاہتی تھیں انھوں نے برصغیر سے مولوی عبدالکریم کو بلوایا اور انھیں بڑے احترام سے ونڈسر کاسل میں ٹھہرایا ملکہ معظمہ کے قریبی حلقے مفتی عبدالکریم کے اس احترام و تکریم پر خوش تو نہ تھے لیکن ملکہ کا اردو کے لیے ذوق و شوق اور استاد کا احترام اس قدر تھا کہ آج بھی شاہی محلات میں ان کے استاد کی پورٹریٹ دیکھی جاسکتی ہے

اسپین کی جانب سے ایک ہند امریکی اردو ہندی مشاعرے کا اہتمام کیا گیا جس میں ڈیجیٹل رابطے کے ذریعے واشنگٹن میں موجود اردو اور ہندی کے دو شاعروں کو اسٹیج پر لگی اسکرین کے ذریعے مشاعرے میں پیش کیا گیا۔

اپنی نوعیت کی اس پہلی کوشش میں بیک وقت واشنگٹن سے ستیہ پال آنند اور مدھو مہیشوری اور دہلی سے شہریار، فرحت احساس، اصغر وجاہت، گگن گل اور سندر چندر ٹھاکر ایک اسٹیج پر سامعین کے سامنے موجود اپنے کلام سے حاضرین کو لطف اندوز کر رہے تھے۔ اسپین کے جولائی اگست 2005 کے شمارے میں ڈیجیٹل لنک کے ذریعے 'ہند امریکی مشاعرہ' کے عنوان سے ایک مختصر مضمون پیش کیا گیا ہے جس میں مذکورہ بالا شعرا کے کلام کا نمونہ بھی پیش کیا گیا ہے۔

اسپین کی جانب سے اردو کی ترقی کے لیے کیے جانے والے کارہائے نمایاں میں اردو بک فیئر میں اسپین کی شمولیت بھی ہے۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی جانب سے منعقدہ بک فیئر میں دیگر اردو جرائد کے ساتھ اسپین کی شمولیت اور اس کے اسٹال پر طلباء اور نوجوانوں کی کثرت اس رسالے کی مقبولیت کی غماز ہے۔ اسپین نے مارچ اپریل 2005 کے شمارے میں ''اسپین اُردو بک فیئر'' کے عنوان کے تحت ایک چھوٹی سی باتصویر رپورٹ بھی شائع کی ہے جس میں لکھا ہے کہ گزشتہ دنوں میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے کیمپس میں قومی کونسل برائے فروغِ اُردو زبان کی جانب سے منعقدہ ہفت روزہ بک فیئر میں اسپین (اُردو) نے بھی حصہ لیا تھا۔ ویسے تو اُردو کے شائقین کے لیے پورا بک فیئر اہمیت کا حامل تھا لیکن اسپین کے اسٹال پر عام طور پر طلبا اور نوجوانوں کی کثرت نظر آتی تھی۔ اسپین کی جانب سے ہر روز کوئز مقابلے کا اہتمام اور بروقت کامیاب لوگوں کو انعامات پیش کرنے کی وجہ سے بک فیئر میں شرکت کرنے والوں کے لیے اسپین کا اسٹال خاص توجہ کا مرکز بنا رہا۔

ہند برطانوی تعلقات گزشتہ کئی صدیوں پر محیط ہیں اور بھارت کی وسیع اردو برادری کو ذہن میں رکھ کر 2005 میں برٹش ہائی کمیشن کے 'پریس اینڈ پبلک افیئرس

ڈپارٹمنٹ' کی جانب سے 'برٹش جائزہ' کا اجرا عمل میں آیا۔

برٹش جائزہ کی اشاعت کا فیصلہ بھارت کی وسیع اردو برادری کو ذہن میں رکھتے ہوئے کیا گیا۔ بنیادی اعتبار سے اس رسالے کا مقصد کئی ملین سے زائد اردو قارئین تک، برطانیہ سے متعلق خبروں اور دیگر معلومات کی فراہمی کو یقینی بنانا ہے۔

مثال کے طور پر یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

''برطانیہ میں اردو کی آمد تارکینِ وطن کی وجہ سے نہیں بلکہ ملکہ وکٹوریہ کی ذاتی دلچسپی کے سبب ہوئی۔ ملکہ خود اردو زبان سیکھنا چاہتی تھیں انھوں نے برصغیر سے مولوی عبدالکریم کو بلوایا اور انھیں بڑے احترام سے ونڈسر کاسل میں ٹھہرایا ملکہ معظّمہ کے قریبی حلقے مفتی عبدالکریم کے اس احترام وتکریم پر خوش تو نہ تھے لیکن ملکہ کا اردو کے لیے ذوق وشوق اور استاد کا احترام اس قدر تھا کہ آج بھی شاہی محلات میں ان کے استاد کی پورٹریٹ دیکھی جاسکتی ہے۔

فورٹ ولیم کالج سے لیسٹر اسکوائر لندن میں انڈین انسٹی ٹیوٹ کے قیام تک برطانیہ میں اردو زبان اور تعلیم کے فروغ کا ایک لمبا سلسلہ ہے۔ سرکاری اور نیم سرکاری کوششوں کے علاوہ اس میں عوامی حصہ داری بھی رہی ہے اور یہ حصہ داری ان تارکین وطن کی ہے جو برصغیر ہندوپاک سے کسبِ معاش کے سلسلے میں برطانیہ آئے۔ ان تارکینِ وطن نے غیرملکی سرزمین پر نہ صرف نئی بستیاں بسائیں بلکہ کسبِ معاش کی تگ ودو کے بعد باقی بچ جانے والے فرصت کے چند لمحات کو باہم مل بیٹھنے کا ذریعہ بنالیا۔ اس طرح ادبی مجالس اور مشاعروں کی روایت قائم ہوئی اور بعد میں عوامی سطح پر برطانیہ میں اردو کے فروغ کا سہرا اردوادب کی انجمنوں اور اداروں کے سر بندھا۔ آج بزمِ اقبال، اعجاز اکیڈمی اور ایشین لٹریری سرکل جیسے اداروں کی فعالیت کا یہ عالم ہے کہ لندن کو مغرب میں اردو کا مرکز کہا جاسکتا ہے۔

برطانیہ کے کثیر نسلی معاشرے میں غیرملکی زبانیں سیکھنے کا رجحان بڑھ رہا ہے۔ یوں تو برطانیہ کو سات سمندر پار اردو کی نئی آباد ہونے والی بستیوں میں کئی لحاظ سے ایک اہم اور امتیازی مقام حاصل ہے۔ یہ یورپ کا واحد ملک ہے جہاں حکومت کی سرپرستی میں یونیورسٹی سطح تک اردو زبان کی تعلیم کا نظم ہے۔

اس جریدے کا مرکز ومحور نوجوان نسل اور طلباء ہیں۔ لہٰذا اس کے مشمولات میں ان خاص موضوعات کا ہی احاطہ کیا جاتا ہے جن سے نوجوان نسل کو تحریک ملے اور

برطانیہ میں ان کے لیے موجود مواقع کی نشاندہی ہوسکے۔ اس جریدے کی جو خاص بات ہے وہ یہ ہے کہ اس میگزین کے عقبی صفحات کے ذریعے معلومات فراہم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ مثلاً برطانیہ میں ترقیاتی مواقع کے حصول کے لیے معلومات بہم پہنچانا یا بھارت کی ریاستوں میں ہمارے علاقائی دفاتر یا پھر برطانیہ میں کام کرنے والی NGOs کے بارے میں معلومات وغیرہ۔ اس کا مقصد یہی ہے کہ قاری کو معلومات حاصل کرنے کے لیے سرگرداں نہ ہونا پڑے اور متعلقہ جانکاری اسے آسانی کے ساتھ مل جائے۔

بعض وجوہات کی بنا پر فی الحال برٹش جائزہ کی اشاعت موقوف کردی گئی ہے۔

غیرملکی اداروں کے ذریعے شائع ہونے والے جرائد دراصل سفیر اردو کی حیثیت رکھتے ہیں لیکن آج سائبر دنیا انٹرنیٹ کے بڑھتے رواج نے دنیا کو گلوبل ولیج میں تبدیل کردیا ہے اور اب اظہار وابلاغ کے لیے پرنٹ میڈیا پر انحصار کم سے کم ہوتا جارہا ہے۔ اس کے علاوہ ان جرائد کی اشاعت کے لیے باقاعدہ ایک عملہ مقرر ہوتا ہے جن کے بڑھتے مصارف بھی ان جرائد کو جاری رکھنے میں مانع ہورہے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ سرزمین ہند سے ہر نوعیت کے ادبی جرائد شائع ہورہے ہیں ادبِ اطفال جس کے تئیں کافی تشنگی کا احساس ہوتا تھا۔ 'پیام تعلیم' اور 'امنگ' کے بعد قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ذریعے 'بچوں کی دنیا' جیسے خوبصورت اور معیاری رسالے کی اشاعت بچوں کو اردو زبان وادب سے جوڑنے کی نہایت عمدہ کوشش ہے یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کے ہر اُس گوشے میں جہاں اردو زبان بولنے والے لوگ موجود ہیں بڑے پیمانے پر اس رسالے کی پذیرائی ہورہی ہے اور اتنے قلیل عرصے میں ملنے والی بے پناہ مقبولیت اپنے آپ میں ایک ریکارڈ ہے۔

بچوں کی دنیا کے علاوہ ایک دنیا نوجوان کی بھی ہے جو نصابی کتابوں یا زبان وادب کے علاوہ کچھ معلوماتی مضامین بھی پڑھنا چاہتے ہیں خاص طور پر اگر یہ اردو زبان میں دستیاب ہو تو کیا کہنے۔ ہندوستان سے باہر دیگر ممالک کے لوگوں کا طرزِ فکر کیا ہے؟ وہاں تعلیم، روزگار، سیاحت وغیرہ کے لیے کیا مواقع ہیں؟ جدید سائنس وٹکنالوجی میں ان کی مہارتوں کا کیا عالم ہے؟ ہندوستانی ان سے کس طرح مستفید ہوسکتے ہیں؟ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ غیرملکی اداروں کے ذریعے شائع ہونے والے ان جرائد کی حیثیت دراصل ایک دریچے کی ہے جو انھیں جام جمشید کی طرح بیرونی دنیا کی سیر کراتا ہے اور قارئین خاص طور پر طلبا اور دانشوروں کے لیے متنوع معلومات کے ساتھ ساتھ ذہنی آسودگی بہم پہنچاتا ہے۔ اردوداں طبقے کا فرض ہے کہ وہ سفارت خانوں سے رابطہ کریں اور خطوط کے ذریعے یا میمورنڈم پیش کرکے ان جرائد کے دوبارہ اجرا پر زور دیں جو بند ہوچکے ہیں یا جن کے موقوف ہونے کی نوبت آگئی ہے۔ کیوں کہ ہر حال میں یہ خسارہ اردو والوں کا ہی ہے۔

◘

Dr. SHAGUFTA YASMIN, Flat No 24
SBI Officers Flat, G Block, East of Kailash
New Delhi

ادبِ اطفال اور 'بچوں کی دنیا'

ادب اطفال کی تاریخ کا بنظر غائر مطالعہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ تاریخ بھی تقریباً اتنی ہی پرانی ہے جتنی بحیثیت مجموعی تاریخ ادب اردو، اس لیے کہ اردو کے پہلے ہی شاعر امیر خسرو نے اپنے کلام میں دیگر موضوعات سخن کے ساتھ ساتھ بچوں کی دلچسپی کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے پہیلیوں، دوہوں اور گیتوں وغیرہ پر بھی خاص توجہ کی تھی اور تب ہی سے یہ سلسلہ جاری ہے۔

ادب اطفال کی ترقی و ترویج میں رسائل و جرائد کا بہت اہم رول رہا ہے۔ ہندوستان کے کئی رسالے اس صنف کی نمائندگی کرتے ہیں، جن میں مختلف شہروں سے نکلنے والے رسائل امنگ، پیام تعلیم، ہلال، نور، گل بوٹے، بچوں کا تحفہ، اچھا ساتھی وغیرہ بچوں میں خوب مقبول ہیں۔ اس راہ میں ایک مضبوط قدم اٹھایا ہے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے ماہنامہ 'بچوں کی دنیا' جاری کر کے، جس کا اجرا جون 2013 میں عمل میں آیا۔ ابھی اس کے نو دس شمارے ہی منظر عام پر آئے ہیں۔ 64 صفحات پر مشتمل اس رسالہ کا ہر صفحہ خوش رنگی کا آئینہ دار، بہترین ڈیزائنگ اور عمدہ طباعت میں لا ثانی حیثیت رکھتا ہے۔ ان سب کے باوجود اس کی قیمت محض 10 روپے ہے جس سے معاشرہ کے ہر طبقہ تک اس کی رسائی اور نتیجتاً اس کی پذیرائی اور مقبولیت کے امکانات قوی سے قوی تر ہوجاتے ہیں۔

مشمولات کے حوالے سے غور کیا جائے تو رسالہ کھولتے ہی مدیر ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین کا اداریہ نظر کے سامنے آتا ہے جس میں موصوف بچوں کے لیے علمی و معلوماتی مواد اور چند نصیحتیں بڑے ہی دل آویز انداز اور پدرانہ شفقت کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ مثلاً سالِ نو 2014 کے شمارہ کے آغاز میں بچوں سے اس طرح مخاطب ہیں: ''ہم اگر آنے والے ہر دن کو نئے سال کی شروعات کی طرح گلے سے لگائیں، اپنی اور ملک و قوم کی خوش حالی کے منصوبوں پر عمل کی رفتار کو تیز کریں، نئے خواب دیکھیں اور نئی تعبیریں ڈھونڈیں تو آنے والے ہر سال کے پورے وقت کا بہتر سے بہتر استعمال ہوسکتا ہے۔''

رسالہ میں اس کے بعد مختلف مضامین، نظمیں، کہانیاں، قسط وار ناول، رنگ برنگ محفلیں اور خود بچوں کی کاوشیں 'ننھے فنکار' کالم میں پوری آب و تاب کے ساتھ بچوں کی دلچسپی اور نظر کی کشش کا سبب ہوتی ہیں اور تمام قارئین کو محظوظ کرتی ہیں۔ یہ رسالہ کئی حیثیتوں سے انفرادیت کا حامل ہے۔ سب سے اہم خوبی یہ کہ اس میں دور جدید کے بچوں کے ذہنی تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے انھیں اپیل کرنے والے کارٹون، کامکس اور گرافکس کی کثرت ہے جو مواد کو مزین و دلکش بھی بناتی ہے اور اسے صفت مقناطیسیت بھی عطا کرتی ہے۔ مزید برآں کہانیوں کے موضوعات متنوع لیکن تعمیری ہیں، جن میں پیش کیے جانے والے کردار حیرت انگیز، واقعات مؤثر، مکالمے دلچسپ اور انجام سبق آموز ہوتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ پڑھتے پڑھتے رسالہ تو ختم ہوجاتا ہے لیکن اس کا اثر تادیر باقی رہتا ہے۔

دور حاضر میں ابلاغ و ترسیل کے ذرائع بہت تیزی سے فروغ پا رہے ہیں جس کی اہمیت کے پیش نظر اس ماہنامہ کے ذمہ داران نے رسالہ میں ایک کالم اردو SMS اور اردو FaceBook کا بھی مقرر کیا ہے، جس کے ذریعہ ننھے منھے قارئین کے تاثرات بآسانی اور براہ راست دستیاب ہوتے ہیں اور رسالہ میں شائع ہوجانے سے ان کی خوب حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔

موجودہ دور میں سائنس و ٹیکنولوجی کی برق رفتار ترقی کی وجہ سے ادب اطفال کی نمائندگی کرنے والے رسائل اور قلم کاروں کے سامنے مسائل روز بروز بڑھ رہے ہیں۔ بچوں کے پاس تفریح طبع اور دلچسپی کے لیے موبائل، ٹی وی اور انٹرنیٹ جیسی پرکشش سہولتیں ہمہ وقت دستیاب ہیں جن کے ذریعہ بچوں کو ان کا پسندیدہ اور نئے سے نیا مواد بنا کسی دشواری کے مل جاتا ہے۔ نتیجتاً نصابی کتب کے بعد رسالوں یا غیر نصابی کتابوں کو پڑھنے کے لیے کوئی محرک ہی نہیں بچتا۔ چنانچہ اب اگر ادب اطفال کے ذریعہ بچوں میں وہ تعمیری اور تخلیقی صلاحیتیں اجاگر کرنی ہیں جن کو پروان چڑھانے میں مذکورہ ماڈرن ایجادات ناکافی ثابت ہوئی ہیں تو پھر کچھ ایسا پیش کرنا ہوگا جو موبائل اور انٹرنیٹ سے زیادہ دلچسپ، معلوماتی اور ہمہ جہت ہو۔ اس حوالہ سے بھی ماہنامہ 'بچوں کی دنیا' خاص اہمیت رکھتا ہے۔ معلومات کا ایک بڑا خزانہ اس کے ہر شمارے میں محفوظ ہے۔ دو مستقل کالم 'مہینے کی باتیں' اور 'آپ کے سوال' اس سلسلہ کی بہت اہم کڑیاں ہیں۔ اول الذکر میں ہر ماہ کی مناسبت سے اس ماہ میں پیش آئے دنیا بھر کے اہم و مشہور واقعات کو یکجا کر دیا جاتا ہے اور مؤخر الذکر یعنی 'آپ کے سوال' کالم کے تحت قارئین کی جانب سے بھیجے گئے سوالوں کے معلوماتی جوابات انتہائی دلچسپ پیرائے میں افلاطون اور ڈاکٹر بقراط جیسے فرضی کرداروں کی زبانی شامل کر دیے جاتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ رسالہ کے اخیر میں بچوں اور بڑوں میں یکساں مقبول کالم دماغی ورزش بھی موجود ہے جو ادبا و شعرا کی تصاویر کے ذریعہ اور حروف کی ترتیب میں ردو بدل کے ذریعہ نام معلوم کرنے جیسی پہیلیوں پر مبنی ہوتا ہے۔

نوعمر بچوں میں کھیلوں کی طرف رغبت اور کھیلوں سے متعلق جانکاری حاصل کرنے کا بھی خوب تجسس ہوتا ہے جس کی تکمیل اس رسالے کے مستقل کالم 'کھیل کھلاڑی' کے ذریعہ ہوسکتی ہے۔ اس میں ہر ماہ کسی ایک کھیل سے متعلق تاریخی اور ترکیبی مکمل معلومات فراہم کی جاتی ہیں۔

مزید برآں ایک دیگر اہم خوبی جو اس رسالہ کے امتیاز و انفرادیت میں اضافہ کرتی ہے وہ ہے ہر ماہ کی مناسبت سے ایک یا ایک سے زائد مخصوص مضامین کی شمولیت اور اس مناسبت سے رسالہ میں ایک ذیلی عنوان مقرر کر دینا۔ جتنے شمارے میری نظر سے گزرے ان کے ذیلی عنوانات رمضان مبارک، حج مبارک، کرسمس، عید میلاد النبی اور طوطیٔ ہند امیر خسرو وغیرہ تھے۔ یہ ایک نفسیاتی اور عملی کاوش ہے کیونکہ اس طرح رسالہ کا وہ ذیلی عنوان غیر شعوری طور پر بچوں کے ذہنوں میں محفوظ ہوجاتا ہے اور اس سے متعلق مفصل معلومات اندرونی صفحات پر مل جاتی ہیں جس سے ان ننھے منھے قارئین کی معلومات میں نہ صرف اضافہ ہوتا ہے بلکہ یہ معلومات تادیر اُن کے ذہن و دل میں محفوظ بھی رہتی ہیں۔

لہٰذا اس رسالہ میں وہ سب کچھ ہے جس کی تلاش موجودہ دور کے کسی نوخیز ذہن کو ہوسکتی ہے۔ قومی کونسل کی ادب اطفال کے ضمن میں یہ ایک اہم اور قابل تعریف کوشش ہے جو طفلی ادب کے تمام تخلیق کاروں، اشاعتی اداروں اور اس صنف ادب کی تعمیر و ترقی میں کوشاں حضرات کے لیے مشعل راہ ہے۔

بچوں کی دنیا کو ملک کے بیشتر نامور قلم کاروں کا تعاون حاصل ہے مثلاً نصرت ظہیر (اعزازی مدیر)، رؤف خیر، شمیم احمد صدیقی، ڈاکٹر اطہر مسعود خاں، محبوب راہی، بانو سرتاج، رتن سنگھ، رئیس الدین رئیس، محمد خلیل اور مہدی پرتاب گڑھی وغیرہ۔ میری ادنیٰ رائے میں اب کونسل کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ نئے قلم کاروں کی بھی حوصلہ افزائی کرے۔ ■

Dr.Zar Nigar, Shahabad Gate, Rampur, 244901

مشتاق کریمی

قومی اردو کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی اردو کے فروغ وترویج کے لیے کوشاں نظر آتی ہے۔ کونسل نے پورے ہندوستان میں اپنی ایک شناخت قائم کررکھی ہے۔ یہ شناخت اسے اپنی جہد مسلسل اور کاوشوں کے سبب ملی ہے۔ یہ قومی ادارہ ایک جانب جہاں مسودوں کی اشاعت کے لیے سرمایہ فراہم کرتا ہے وہیں چھپی ہوئی کتابوں کو تھوک میں خریدنے کا بھی اہم فریضہ انجام دیتا ہے۔ اس کے علاوہ ملک کے طول وعرض میں علمی، ادبی سمیناروں کا انعقاد کرکے جہاں یہ لہو کو گرم رکھنے کا ذریعہ بنتا ہے وہیں اس کے ڈی ٹی پی سینٹرز سے استفادہ کرکے ہزاروں افراد نے اردو ٹائپ سیٹنگ اور دیگر امور سیکھے ہیں۔ اس کے علاوہ اردو کو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی بھی کونسل کو نہ صرف فکر ہے بلکہ وہ عملی اقدامات بھی اٹھارہی ہے۔ کونسل نے اردو کے جہاں 13 فانٹس کا اجرا کیا وہیں اردو پیڈیا کی بھی شروعات کی ہے۔ غرض یہ کہ حکومت کی سربراہی اور ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین اور ان کے کارکنوں کی نگرانی میں کونسل گیسوئے اردو کو سنوارنے کی ہر ممکن کاوشیں کررہی ہیں وہیں 'اردو دنیا'، 'فکر وتحقیق' اور 'بچوں کی دنیا' جیسے رسائل کی اشاعت نے اردو کو نیا وقار اور اعتبار عطا کیا ہے۔

بچوں کا رسالہ 'بچوں کی دنیا' کی عمر ابھی چند ماہ کی ہی ہے مگر اس کم عمری میں ہی اس پرچہ نے اپنی تعداد اشاعت کو صرف مہاراشٹر میں 50 ہزار تک پہنچا دیا ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ چکنا آرٹ پیپر، رنگین چھپائی اور صفحات 64 ہونے کے باوجود قیمت صرف 10 روپے ہے۔ ہم نے بذات خود یہ محسوس کیا کہ اسے دیکھتے ہی بچے اس کی جانب ایسے لپک جاتے ہیں جیسے وہ لذیذ مٹھائی یا اپنے محبوب کھلونے یا پسندیدہ ٹیلی ویژن پروگرام کی جانب متوجہ ہوتے ہیں۔ اس کا کریڈٹ جہاں رسالے کی خوبصورتی اور خوب سیرتی کو جاتا ہے وہیں مرزا ورلڈ بک ہاؤس اورنگ آباد کے روح رواں مرزا عبدالقیوم ندوی کو بھی دیا جانا چاہیے کہ وہ مہاراشٹر کے قصبے قصبے قریے قریے کی خاک چھان رہے ہیں اور رسالے کی اہمیت سے اردو داں طبقے کو باخبر کررہے ہیں۔ گویا وہ 'بچوں کی دنیا' کے برانڈ ایمبیسڈر بن گئے ہیں۔ یہ منظر دیکھتے ہی اردو سے محبت کرنے والے حساس دل شخص کی آنکھیں خوشی سے نم بھی ہوجاتی ہیں اور چہرہ تمتما بھی اٹھتا ہے۔ لیکن یہ بھی نوشتۂ دیوار ہے کہ بچے اب 'بچوں کی دنیا' میں ایسے محو ہوتے جارہے ہیں کہ دیگر غیر سرکاری اردو پرچوں سے منہ موڑ رہے ہیں۔

تغیر اور تبدل دراصل ہر زمانے میں رونما ہوتے ہیں، ہوتے رہیں گے۔ وقت کا پہیہ ہمیشہ آگے کی جانب گھومتا رہتا ہے، گھومتا رہے گا۔ اس لیے یہ مطالبہ کرنا کہ غیر سرکاری بچوں کے رسالوں کو زندہ رکھنے کے لیے 'بچوں کی دنیا' کا گلا گھونٹ دیا جائے ایک مفاد پرستانہ اور بے وقوفی کا مطالبہ ہوگا لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ بیس بیس سال سے جاری بچوں کے رسالے ایک ایک کرکے 'کھلونا' کی طرح دم توڑتے جائیں اور ہم تصویر بتاں بنے رہیں۔ اردو داں طبقے کی بھی یہ ذمے داری ہے کہ وہ اس جانب توجہ دیں۔

راقم الحروف نے بچوں کے رسالوں کے چند مدیران سے جب اس ضمن میں گفتگو کی تو سبھی کو پریشان اور مایوس پایا۔ ہر ایک نے یہی بتایا کہ مختلف علاقوں سے رسالے کی ترسیل بند کیے جانے کے فون کالس انھیں موصول ہورہے ہیں۔ ایک حساس دل شخص یہ محسوس کرسکتا ہے کہ پرچہ بند کرنے کے لیے ادا کیا جانے والا ہر لفظ کسی گولی کی طرح سینے میں پیوست ہوتا ہے۔ غیر سرکاری بچوں کے رسالے نیوز پرنٹ پر چھپتے ہیں۔ یہ کاغذ ناقص بھی ہوتا ہے اور غیر دیدہ زیب بھی۔ ان پرچوں کے ٹائٹل پیج تو رنگین ہوتے ہیں مگر اندرونی صفحات کی چھپائی یک رنگی ہی ہوتی ہے۔ پھر ان کی قیمت بھی قدرے زیادہ اس لیے بھی معلوم ہوتی ہے کہ 'بچوں کی دنیا' انگریزی میگزین کی طرح چھپے ہوئے چہار رنگی رسالے کی قیمت صرف 10 روپے ہے۔ اتنی کم قیمت میں غیر سرکاری رسالوں کو 'بچوں کی دنیا' کے کاغذ اور طرز پر شائع کرکے مارکیٹ میں بیچا ہی نہیں جاسکتا۔ یہ بھی ایک ٹھوس حقیقت ہی ہے کہ 'بچوں کی دنیا' کے ہر شمارے کی اشاعت پر کہیں زیادہ رقم خرچ ہوتی ہے تاہم ہر بچے کے ہاتھ میں اردو کا یہ رسالہ پہنچانے، بچوں کو اردو میں مطالعے کی عادت ڈالنے اور ان کی ذہنی پرورش کے لیے قومی اردو کونسل اتنی کم قیمت پر رسالہ فراہم کررہی ہے۔

یہ ایک لمحۂ فکریہ ہی ہے کہ پورے ہندوستان سے اردو زبان میں بچوں کے چند ہی رسالے شائع ہوتے ہیں۔ ان رسالوں کو زندہ رکھنے کے لیے ان کے مدیران کی زندگی اجیرن سی ہوجاتی ہے۔ یہ ایک کسی لمحہ ڈوبنے اور کسی لمحہ ابھرنے کا عمل ہوتا ہے تاہم اردو سے محبت اور اردو داں بچوں کی ذہنی پرورش کے لیے رسالوں کے مالکان و مدیران شبانہ روز دوڑ دھوپ کرتے نظر آتے ہیں۔ یہ پرچے جہاں ان کے لیے اولادوں کی طرح ہیں وہیں اردو داں طبقے کے لیے ان کی حیثیت تاریخی ہے۔ جس طرح حکومت تاریخی عمارتوں کے تحفظ کے لیے مٹھی بھر کاوشیں کرتی رہتی ہیں اسی طرح حکومت کو چاہیے کہ وہ اپنے پرچے کو جاری رکھتے ہوئے ان چند غیر سرکاری رسالوں کی بھی سرپرستی کرے۔

نوٹ: قومی اردو کونسل، بچوں کے اردو رسالوں کی معاونت کا فرض، 'بچوں کی دنیا' کے اجرا سے بھی پہلے سے ادا کرتی چلی آرہی ہے۔ انھیں نہ صرف اشتہار دیے جاتے ہیں بلکہ ان کے شمارے 'بلک پرچیز' اسکیم Bulk Purchase Scheme کے تحت خریدے بھی جاتے ہیں۔ یہ سلسلہ 'بچوں کی دنیا' کی بے پناہ مقبولیت کے باوجود جاری ہے اور مستقبل میں بھی اس امداد میں اضافہ تو ہوسکتا ہے کمی بالکل نہیں آنے والی ہے۔ ڈائریکٹر NCPUL۔

Mushtaque Karimi
342 Shani Peeth, Jalgaon (M.S.)

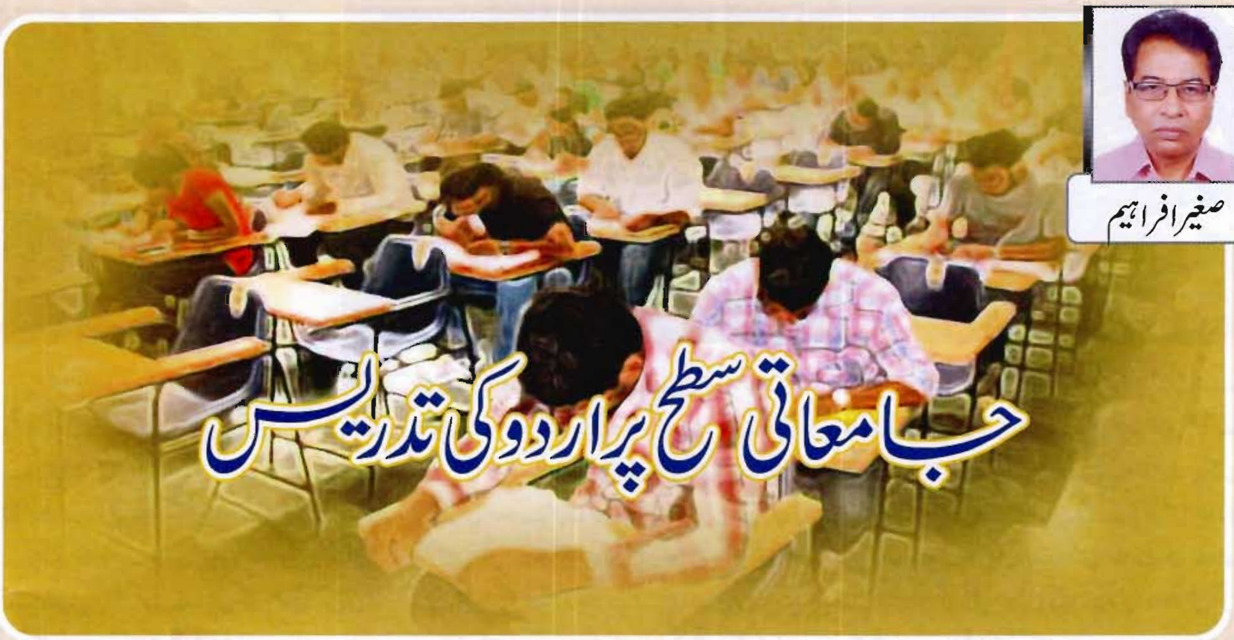

صغیر افراہیم

جامعاتی سطح پر اردو کی تدریس

جامعاتی سطح پر اردو کی تدریس کو بعض دشواریوں کا سامنا بھی ہے۔ یہ دشواریاں طلبا، اساتذہ، انتظامیہ تینوں سطحوں پر کسی نہ کسی شکل میں موجود ہیں۔ ہمارے ملک میں اعلیٰ تعلیم ایک قسم کی شے (Commodity) بن چکی ہے۔ امیر طلبا کے لیے یہ وقت گزاری، تفریح اور رُتبے کی علامت ہے۔ متوسط اور غریب گھرانے کے طلبا ملازمت اور اسکالرشپ کے حصول کے لیے اپنا قیمتی وقت صرف کرنے پر مجبور ہیں۔ وہ کلاس اٹینڈ کرتے ہیں مگر مالی دشواریوں کی بنا پر یکسوئی اور دلجمعی کے ساتھ پڑھ نہیں پاتے۔ ٹیچر کو بھی اس ماحول میں پڑھانے میں طمانیت و تشفی محسوس نہیں ہوتی۔ مالدار گھرانوں کے طلبا بہر صورت چند برس کالج یا یونیورسٹی میں گزار کر ڈگری حاصل کر لیتے ہیں لیکن ان ڈگریوں کی انھیں اتنی ضرورت نہیں ہوتی ہے جتنی متوسط اور غریب گھرانے کے طلبا کو ہوتی ہے۔ ادب اور زبان کو بازار اور ملازمت سے براہ راست طور پر منسلک ہونے یا نہ کرنے کی وجہ سے اردو کو معاشی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے جس کی وجہ سے موجودہ عہد کے طلبا یکسوئی کے ساتھ زبان و ادب سے انصاف نہیں کر پا رہے ہیں۔ مثال کے طور پر ہندوستان کے تمام سرکاری دفتروں میں ہندی اور انگریزی زبان کا چلن ہے لیکن اردو کے ساتھ جو سلوک ہوتا ہے وہ سب پر عیاں ہے۔

میری گفتگو کا محور وہ طلبا یا اساتذہ نہیں ہیں جن کا بیشتر وقت کیمپس کی نت نئی چہل قدمیوں، خوش گپیوں میں گزرتا ہے۔ وہ فضا کو خوشگوار تو بناتے ہیں مگر ادب کے طلبا کے لیے یہ ماحول بہت سازگار نہیں کہا جا سکتا خصوصاً اردو زبان کے طالب علم کو مقابلے کے اس دور میں ہر دم مستعد رہنے کی ضرورت ہے۔ ان کی دیگر مصروفیات ان کے لیے تو مضر ہیں ہی اُن اساتذہ کے لیے بھی خوش گواری کا سبب نہیں جو کلاس روم کی پابندی اور اسباق کی تیاری کرتے ہیں اور اپنے علم میں طلبا کو برابر کا شریک بنانا چاہتے ہیں۔ ایسے میں نہ صرف انتظامیہ کے غیر ضروری احکامات، تقریبات یا بے وقت مداخلت اساتذہ کے خیالات کو منتشر کرتے ہیں بلکہ کبھی کبھی انھیں ذہنی تناؤ میں مبتلا کرتے ہیں اور وہ پڑھنے اور پڑھانے، دونوں مرحلوں میں یکسوئی نہیں برت پاتے ہیں۔

ابھی چند ماہ قبل مہاتما گاندھی انٹرنیشنل ہندی یونیورسٹی، وردھا جانے کا اتفاق ہوا۔ وی این رائے صاحب ایم اے اور ایم فل کا اردو میں معیاری نصاب تیار کروا رہے تھے۔ تقریباً تمام جامعات کا نصاب سامنے تھا۔ سبھی کی یہ کوشش تھی کہ جدید سہولتوں اور ضرورتوں کے مطابق ایسا خاکہ تیار ہو جو تدریس میں ہر طرح معاون ہو۔ اس دوران مطالعہ و مشاہدہ، غور و فکر اور بحث و مباحثے کے بعد جو باتیں سامنے آئیں وہ یہ کہ پہلے ہمیں اپنے رائج نصاب پر بھی نظرِ ثانی کی ضرورت ہے تا کہ طلبا کی صحیح سمت میں، جدید تقاضوں کے مطابق ذہن سازی ہو سکے اور جو اندیشے ابھر رہے ہیں ان کا تدارک کیا جا سکے۔ مثال کے طور پر یو جی سی کے قوانین کے مطابق پورے ملک میں گریجویشن کی سطح پر شاملِ نصاب جو پرچے مشترک نظر آتے ہیں، وہ ہیں اردو زبان کی ابتدا و ارتقا... اہم ادبی اصناف کا تعارف... نظم کے تحت مثنوی، قصیدہ، غزل، مرثیہ، رباعی اور نظم کی تدریس لازمی قرار پاتی ہے۔ نثر میں قدیم اور جدید... افسانوی اور غیر افسانوی نثر... افسانوی ادب میں داستان، ناول، افسانہ اور ڈرامہ ہے۔ غیر افسانوی ادب میں تنقید، انشائیہ، سوانح، خاکہ، مقالہ، ترجمہ اور خطوط۔ دکن، دہلی اور لکھنؤ دبستان کے ساتھ تحریکات اور رجحانات ہیں۔ اختیاری مضامین میں عربی، فارسی، صحافت، ذرائع ابلاغ، صوتیات اور قواعد کے پرچے ہیں۔

ایم اے میں زبان و ادب اور اصناف کی تاریخ کے ساتھ ساتھ قدیم و جدید متن، مشرقی و مغربی ادبیات کو بھی لازمی پرچوں کی حیثیت سے شامل کر لیا گیا ہے۔ اختیاری پرچوں میں میر، غالب، سرسید، اقبال، پریم چند، ابوالکلام آزاد وغیرہ شاملِ نصاب ہیں۔ ان میں کسی ایک کا خصوصی مطالعہ کرنا ہوتا ہے۔ کچھ جگہ عملی اور کاروباری اردو کے پرچے بھی شامل کیے گئے ہیں۔ مگر اختیاری مضمون کی حیثیت سے گریجویشن کی سطح پر چونکہ طلبا کے پاس کئی مضامین ہوتے ہیں اس لیے وہ کسی بھی اسٹریم میں جانے کے لیے آزاد ہیں مگر پوسٹ گریجویٹ سطح پر تو مضمون مخصوص ہو جاتا ہے۔ رائج مضامین کی روشنی میں جامعاتی سطح پر اردو کی جو تدریس ہو رہی ہے اس سے طلبا محسوس کر رہے ہیں کہ مطلوبہ ڈگری کا کوئی خاص اسکوپ نہیں ہے۔ ہندی کے طلبا اور اساتذہ بھی ایسا ہی کہتے ہیں لیکن سچ تو یہ ہے کہ ہندی ہر چھوٹے بڑے اسکول، کالج، یونیورسٹی میں پڑھائی جاتی ہے جبکہ اردو کو یہ سہولت میسّر نہیں ہے اور نہ ہی اردو روزگار سے براہِ راست وابستہ

ہے۔ سبب کی وضاحت کی ضرورت نہیں۔ تگ و دو کے بعد یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اگر زبان و ادب کے ہی پرچوں میں جو چار یونٹ پر مشتمل ہوتا ہے اس کا ایک یونٹ اس کے لیے وقف ہو کہ طالب علم کو الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا کے تعارف کے ساتھ تجارتی اور دفتری خطوط کی مشق کرادی جائے، صحافتی اور غیر صحافتی تحریر کا فرق بتا دیا جائے۔ فلموں اور سیریلوں میں لکھی جانے والی کہانی، اسکرین پلے، اسکرپٹ، مکالموں وغیرہ سے بھی واقف کرا دیا جائے تو شاید صورتِ حال دوسری ہو۔ اسی طرح کاروباری یعنی فنکشنل اردو میں ایک یونٹ ایسا ہو جس کے توسط سے ادبی واقفیت ہو جائے تو عوام سے رابطہ بھی بڑھے گا اور ملازمت کے مواقع بھی دستیاب ہوں گے۔ مثلاً غالب خصوصی مطالعے کے طور پر ہر یونیورسٹی میں شاملِ نصاب ہے تو اس پرچے میں حیات و خدمات اور فکری و فنی اہمیت و افادیت کے ساتھ ساتھ غالب کی غزلوں کی قرأت کا بھی معقول بندوبست ہو۔ عروض کا پرچہ تو اب الگ سے شامل نہیں ہے البتہ اساتذہ اشعار پڑھاتے وقت ہی طلبا کو اوزان و بحور سے واقف کرا دیتے ہیں۔ جیسا کہ تعلیم میں آڈیو ویژول (Audio Visual) کی اہمیت اور افادیت سے آپ سبھی واقف ہیں تو کیوں نہ غلام علی، مہدی حسن، بیگم اختر، جگجیت سنگھ، طلعت عزیز وغیرہ کی آواز میں غالب کے کلام کو کلاس روم میں سنایا جائے۔ توقع ہے کہ کمزور طلبا کے لیے یہ بہت ہی مفید ثابت ہوگا۔ کلام جس لَے اور دُھن میں پڑھا گیا ہے اس کے نشیب و فراز سے واقف کرایا جائے بلکہ غالب پر بنی فلم، ٹی وی سیریل، ڈرامے وغیرہ بھی دکھائے جائیں۔

عصری تقاضوں کے تحت تدریسی عمل میں اگر اس طرح کی جزوی تبدیلیاں کی جائیں تو شاید کوئی منفی اثر نہ ہو، تاہم شوق اور دلچسپی ضرور بڑھے گی ورنہ تو صورتِ حال یہ ہے کہ نصاب میں شامل مثنویات اور داستانیں دُور کی بات، طلبا اپنے شوق سے ناول بھی نہیں پڑھتے ہیں تو قرأت کے ساتھ اُن کی فنی باریکیاں کیسے سمجھائی جائیں؟ خطباتِ آزاد کے صفحہ نمبر 311 پر درج ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے 1947 میں لکھنؤ میں منعقدہ نصاب کمیٹی کے جلسے میں کہا تھا:

''آپ جانتے ہیں کہ چند کتابوں کا علم حاصل کرنے اور نفسِ علم حاصل کرنے میں بڑا فرق ہوتا ہے۔''

نفسِ علم حاصل کرنے کی کاوش کا ذکر تو بہت دور کی بات، جب نصاب میں شامل کتابیں ہی نہ پڑھی جائیں اور نہ پڑھائی جائیں تو اس سے بڑھ کر ستم ظریفی اور کیا ہو سکتی ہے؟ ذوق و شوق کو کس طرح بیدار کیا جائے؟ غور طلب مسئلہ ہے۔ کیا نصاب سے مشکل، غیر دلچسپ متن کو ہٹا دیا جائے؟ اگر ایسا ہوا تو کیا ہم طلبا کو زبان و ادب کے ارتقائی مراحل سے واقف کرا سکیں گے؟ اسے بھی ذہن میں رکھنے کی ضرورت ہے۔ البتہ تنگ نظری، منافرت، نفرت آمیز اور گمراہ کن مواد کو نصاب میں جگہ نہیں دینی چاہیے۔

شعر و ادب کے طالب علم اور دوسرے علوم کے طلبا میں کوئی خاص فرق نہیں ہوتا ہے۔ اساتذہ، طلبا اور انتظامیہ کو نصاب اور تدریس کے اس باریک فرق کو محسوس کرنا چاہیے۔ ادب کی بہ نسبت دوسرے علوم میں تیزی سے بدلاؤ آ رہا ہے اس لیے وہ ماضی سے کم، حال سے زیادہ جڑے رہتے ہیں۔ جدید معلومات ان کے لیے بے حد

جامعاتی سطح پر اردو کی جو تدریس ہو رہی ہے اس سے طلبا محسوس کر رہے ہیں کہ مطلوبہ ڈگری کا کوئی خاص اسکوپ نہیں ہے۔ ہندی کے طلبا اور اساتذہ بھی ایسا ہی کہتے ہیں لیکن سچ تو یہ ہے کہ ہندی ہر چھوٹے بڑے اسکول، کالج، یونیورسٹی میں پڑھائی جاتی ہے جبکہ اردو کو یہ سہولت میسّر نہیں ہے اور نہ ہی اردو روزگار سے براہ راست وابستہ ہے۔

اہم ہیں مگر اس نوع کی تمام اطلاعات انٹرنیٹ پر مل جاتی ہیں۔ اس لیے دوسرے علوم کے طلبا کے یہاں ڈھیر ساری معلومات کا پتہ لگانے اور صحیح جواب دینے کے لیے معروضی سوالات اور معروضی تدریس بہت کارگر ہے۔ ادب میں یہ تبدیلی سماجی بدلاؤ اور تہذیبی رکھ رکھاؤ سے جڑی رہتی ہے۔ تخیل اور تصور کے ساتھ تاریخی اسباب اور اس کے نشیب و فراز کا علم بھی ضروری ہو جاتا ہے پھر اصناف، جن میں آہنگی سے بدلاؤ آتا ہے، اس کی رفتار و نوعیت کی بھرپور واقفیت بھی لازمی ہے۔ اسی لیے تفصیلی مطالعہ اور متن کی قرأت لازمی ہو جاتی ہے۔ یہاں کسی شاعر، ادیب یا نقاد کے فنی مطالعے کے ساتھ ساتھ اس کی فکر بلکہ کبھی کبھی سوانحی کوائف سے بھی واقفیت ضروری ہو جاتی ہے۔ فضا اور ماحول کا مطالعہ بھی کرنا ہوتا ہے اور اثرات کی نشاندہی بھی۔ اس لیے ادب میں دیانتدارانہ تدریس کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ یہاں یہ ذکر ضروری سمجھتا ہوں کہ ایم اے کے دونوں برسوں میں ہماری بیشتر توجہ ادب کی تدریس پر ہوتی ہے زبان پر کم۔ ہم ادب کو ملکی ہی نہیں بلکہ عالمی سطح پر پڑھاتے ہیں لیکن اتنی توجہ زبان پر نہیں دی جاتی۔ ہمہ جہت ترقی کے لیے یا طلبا کے مستقبل کو روشن بنانے کے لیے یہ وسیلہ کارگر ہو سکتا ہے کہ جن زبانوں کا زیادہ اسکوپ ہے ان میں سے کوئی ایک زبان لازمی قرار دی جائے البتہ لازمی پرچے میں یہ چھوٹ دی جا سکتی ہے کہ انگریزی، فرانسیسی، اسپینی، عربی یا چینی میں سے طالب علم کوئی ایک زبان اختیار کرے جسے وہ لکھ، پڑھ اور بول سکے۔ اس کے لیے طالب علم سے زیادہ استاد کو محنت و مشقت کرنی ہوگی، راہ ہموار کرنی ہوگی۔ ایسا اگر ممکن ہوا تو ایم اے اردو کے بعد طالب علم کے لیے ملازمت کے بہت سے دروازے کھل جائیں گے۔ جیسے وہ مترجم ہو کر نہ صرف آزادانہ طور پر اپنا معاشی وسیلہ قائم کرنے کے اہل ہوں گے بلکہ سرکاری دفاتر میں ملازمت حاصل کر سکتے ہیں، میڈیا سے جڑ سکتے ہیں، اشتہار و مارکیٹنگ میں جا سکتے ہیں۔

مادری زبان سے جذباتی لگاؤ ٹھیک ہے۔ گلوبلائیزیشن کے اس دور میں یہ ذریعۂ اظہار و ابلاغ ہی نہیں معاشی حصول کا وسیلہ بھی ہے۔ اس وسیلے کو عصر حاضر کے مطابق فعال بنانا ہے، مقناطیسی کشش پیدا کرنی ہے تاکہ 1947 کے بعد کی جو تعلیمی پالیسی سامنے آئی اور جس کی بنا پر شعوری یا لاشعوری طور پر اردو کا رشتہ معاشی حصول سے کٹتا چلا گیا، اس طویل خلا کو کسی حد تک پُر کرنے کے جتن کیے جا سکیں۔ جدید ترین ٹکنالوجی کے دور میں اردو کیا سرکاری زبان کو بھی انگریزی سے سخت مقابلہ درپیش ہے۔ اس فضا میں جامعاتی سطح پر اردو کا معیار گرتا چلا جا رہا ہے کیونکہ جو بچے اسکول یا مدرسے سے آ رہے ہیں وہ نفسیاتی طور پر کشمکش میں مبتلا ہیں اور دوسری زبانوں کے بچوں سے لاشعوری طور پر اپنے کو کمزور محسوس کر رہے ہیں۔ اس صورتِ حال میں بیشتر ذہن دوسری زبانوں کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔

اس پورے پس منظر میں اردو اساتذہ کی ذمے داریاں بہت بڑھ جاتی ہیں۔ عام طور سے گریجویٹ سطح پر جو نئی نسل آ رہی ہے وہ اردو بول اور سمجھ تو رہی ہے مگر رسم الخط سے بہت کم واقف ہے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ نے ایک بڑا قدم یہ اٹھایا ہے کہ گریجویشن کی

سطح پر اردو کو ایک لازمی مضمون کی حیثیت سے متعارف کرایا ہے، اور وہ بھی اس طرح کہ طلبا خصوصاً سائنس اور کامرس کے طلبا پر کوئی اضافی بوجھ نہ پڑھ سکے۔ اس لائحہ عمل کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

1. وہ طلبا جو باقاعدہ اردو ایک مضمون کی حیثیت سے پڑھ کر آرہے ہیں، اب ان کو ادب پڑھایا جا رہا ہے۔ (توجہ طلب بات یہ ہے کہ یہی طلبا اردو سے ایم اے کرتے ہیں اور عملی زندگی کی طرف قدم بڑھاتے ہیں)۔
2. وہ طلبا جو رسم الخط سے واقف نہیں ہیں، انھیں رسم الخط سے واقف کراتے ہوئے لکھنا اور پڑھنا سکھایا جاتا ہے۔
3. وہ طلبا جو غیر ممالک سے یا اس خطے سے آتے ہیں جہاں اردو ہندی کا عام رواج نہیں ہے۔ انھیں صوتیاتی نظام کی مدد سے زبان سکھائی جاتی ہے، الفاظ کے مراتب اور اس کے استعمال کے نشیب و فراز پر ممکنہ توجہ دلائی اور مشق کرائی جاتی ہے۔

اس گفتگو کا مرکز زبان کی تعلیم و تعلم ہے۔ بدلے ہوئے عالمی منظر میں بہت سے لوگوں کا یہ ماننا ہے کہ Language of Opportunity کو چھوڑ کر آج کا زمانہ زبان کا نہیں تکنیک کا ہے۔ اس سوچ کی بدولت عام زندگی سے لے کر روزگار کے مختلف شعبوں تک زبان کی اہمیت کم ہوئی ہے نتیجتاً اردو زبان و ادب کے علم سے سنجیدہ دلچسپی رکھنے والے طلبا اور اساتذہ کی تعداد گھٹتی جا رہی ہے۔

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد کے شعبۂ اردو کے تحقیقی و تنقیدی مجلّہ ''معیار'' کے شمارے 9 میں جامعات کے تدریسی مسائل پر ڈاکٹر ارشد محمود نے مدلل گفتگو کرتے ہوئے کچھ خدشات کی نشاندہی کی ہے:

''زندہ زبانیں ایک دوسرے سے اخذ و استفادہ کر کے ایک دوسرے کے لیے تقویت کا باعث بنتی ہیں۔ زبانوں کے اس اشتراکِ عمل سے لفظ و معنی کے نئے تناظر، تفہیم و تجزیہ کے تازہ پیکر اور اظہار و بیان کے جدید اسالیب ہاتھ آتے ہیں۔ جامد اور محدود زبانیں زیادہ دیر سماج کی ضرورت کو پورا نہیں کر سکتیں۔ وہ لوگوں کے درمیان رسمی مکالمے کا فریضہ تو کسی حد تک پورا کرتی رہتی ہیں مگر انسانوں کے جذبوں، خیالوں، خوابوں اور تمناؤں کو شعر و ادب کے لباس میں ڈھالنے اور انھیں نقشِ بقا بنانے سے قاصر و عاجز رہتی ہیں۔'' (ص 82)

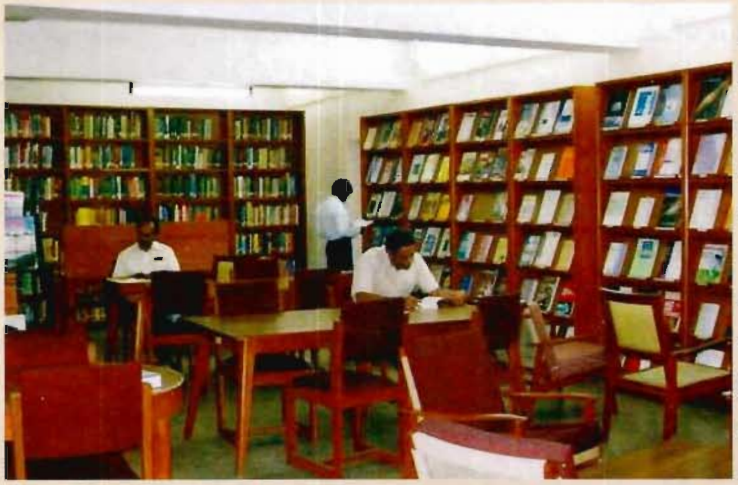

اردو کے ساتھ ایسا نہیں ہے، اور انشاء اللہ کبھی ہو بھی نہیں سکتا ہے پھر بھی چوکنا رہنے کی ضرورت ہے۔ ایسے میں جامعات جس حد تک اپنے نظام کو چست و درست رکھتے ہوئے، دور رس اور دور بینی کا ثبوت دیں گی، نظامِ تعلیم اتنا ہی مفید اور کارگر ہوگا۔ جب ہم اس جانب نگاہ ڈالتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ تدریسی عمل کے ساتھ ساتھ یونیورسٹی کے نظامِ امتحان میں آئی ہوئی تبدیلی پر بھی توجہ دینی ہوگی۔ جدید نظامِ تعلیم کے تحت بی اے اور ایم اے میں سوالات کا ایک حصہ معروضی ہوتا ہے، پھر مختصر جوابات والا اور آخری حصہ تفصیلی جوابات پر مشتمل ہوتا ہے۔ ان میں بھی کچھ جگہ تین تین بڑی اصناف یعنی مثنوی، مرثیہ اور قصیدے کو ایک پرچے میں شامل کر دیا گیا ہے۔ اسی طرح داستان، ناول اور افسانے کو بھی ایک ہی پرچے میں سمیٹ دیا گیا ہے۔ پھر دو دو نمبر کے دس یا پندرہ سوالات، آخر میں ایک حصہ تفصیلی جوابات کے لیے وقف ہے۔ ایم فل اور پی ایچ ڈی میں تو صرف معروضی سوالات ہی رکھے گئے ہیں۔

نئے تدریسی نظام سے واقفیت اور طلبا کی دلچسپی اور دلجمعی کو برقرار رکھنے بلکہ اسے جلا بخشنے کے لیے ضروری ہے کہ یوجی سی کے تحت ہونے والے ریفریشر کورسز میں اساتذہ شریک ہوں، شرکت محض خانہ پُری کے لیے یا جبراً نہیں بلکہ کچھ سیکھنے سکھانے کے جذبے اور بدلتے ہوئے تقاضوں اور نئے تحقیقی طریق کار (Research Method) کے مطابق اپنے کو ڈھالنے کے لیے ہوتاکہ بہتر طریقۂ تدریس کا ثبوت دیتے ہوئے اساتذہ طلبا کو مستفید کر سکیں

ادب میں چند تاریخیں، مصنّفین کے نام، تخلص، کتابوں، صنعتوں یا اداروں وغیرہ کے نام پوچھ کر ہم طلبا کی تحریری اور تخلیقی صلاحیتوں کا اندازہ نہیں کر سکتے کیوں کہ ہمیں تو سب سے زیادہ توجہ طلبا میں تخلیقی صلاحیت کی بیداری اور اس کے اظہار پر دینی ہوگی جو کلاس روم میں ہی جلا پاتی ہے۔ اسی لیے یہ بات اور بھی اہم ہے کہ کیا کلاس روم کا موجودہ نظام اور وہاں مہیا کرائی جانے والی چیزیں شعر و ادب کی تدریس کے لیے مناسب ہیں؟ کیا افسانوی ادب خصوصاً داستان کی قرأت پر کوئی توجہ دی جا رہی ہے؟ شاعری میں اوزان کے ساتھ تلفظ کی ادائیگی اور لہجے کے اتار چڑھاؤ پر کس حد تک دھیان ہے۔ درحقیقت یہ مرحلہ نہایت تشویش طلب ہے۔

جامعاتی سطح پر اردو کی تدریس کا معیار گرا ہو یا معیار کے تصور میں تبدیلی آئی ہو اس پر کوئی شدت پسندانہ رویہ اختیار کرنے کے بجائے موقع و محل کی مناسبت سے مثبت اور کارآمد حل نکالنے کی ضرورت ہے... ایک حل یہ بھی سمجھ میں آرہا ہے کہ نئے تدریسی نظام سے واقفیت اور طلبا کی دلچسپی اور دلجمعی کو برقرار رکھنے بلکہ اسے جلا بخشنے کے لیے ضروری ہے کہ یوجی سی کے تحت ہونے والے ریفریشر کورسز میں اساتذہ شریک ہوں، شرکت محض خانہ پُری کے لیے یا جبراً نہیں بلکہ کچھ سیکھنے سکھانے کے جذبے اور بدلتے ہوئے تقاضوں اور نئے تحقیقی طریقِ کار (Research Method) کے مطابق اپنے کو ڈھالنے کے لیے ہوتاکہ بہتر طریقۂ تدریس کا ثبوت دیتے ہوئے اساتذہ طلبا کو مستفید کر سکیں۔ سرِ دست یہ ایک خیال ذہن میں آیا ہے۔ ابھی بہت سے زاویوں پر از سرِ نو غور و فکر کی ضرورت ہے جس سے اردو کی تعلیم و تدریس کے نئے باب وا کیے جاسکیں۔

□

Prof. Saghir Afraheim, Deptt. of Urdu, AMU, Aligarh - 202002 (UP)

مشتاق حیدر

تمام دانشوروں کا ماننا ہے کہ بیسویں صدی کے وسط میں انسان نے ٹیکنالوجی میں ایسی مہارت حاصل کی، جس کی بدولت انسان اس کرۂ ارض کو چھوڑ کر خلاؤں کو تسخیر کرنے کے قابل بنا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ٹیکنالوجی کیا ہے۔ یہ سوال بظاہر جتنا سادہ نظر آتا ہے اتنے ہی پیچیدہ اس کے جوابات ہیں۔ عام فہم الفاظ میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ ٹیکنالوجی آلات، طریقۂ کار، صنعت گری اور انتظامی طریقۂ کار کی وہ علمیت اور ایسا استعمال ہے جس کی بدولت کسی مسئلے کا حل نکل آئے یا ایک ثمر آور نتیجہ ظاہر ہو۔

لفظ ٹیکنالوجی (Technology) یونانی لفظ Technologia سے مشتق ہے۔ جو خود دو حصوں پر مشتمل ہے اوّل Techne یعنی فن، ہنر یا صناعی۔ دوم logia جس کے معنیٰ ہیں کسی شعبۂ علم یا کسی شے کا مطالعہ۔ ٹیکنالوجی کی اصطلاح کو عمومی معنیٰ میں استعمال کرنے کے ساتھ ساتھ خصوصی معنیٰ میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ مثلاً طبی ٹیکنالوجی، جنگی ٹیکنالوجی اور انفارمیشن ٹیکنالوجی وغیرہ۔

ٹیکنالوجی انسانوں اور دیگر جانداروں کو قابلِ قدر حد تک متاثر کرتی ہے، اور انھیں اپنے اردگرد کے ماحول کو تبدیل کر کے اپنا مطیع کرنے اور اپنے قدرتی ماحول سے ہم آہنگ ہونے میں کلیدی رول ادا کرتی ہے۔

بنی نوع انسان نے قدرتی وسائل کو آسان اوزاروں کی شکل میں ڈھالنے کے ساتھ ہی ٹیکنالوجی کے استعمال کی شروعات کی ہے۔ ماقبل تاریخی ادوار میں آگ کی ایجاد نے خوراک کے مہیا وسائل میں اضافہ کیا یا ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ آگ کی ایجاد نے بہت سارے مہیا وسائل کو خوراک کی فہرست میں شامل کر دیا۔ اسی طرح پہیے کی ایجاد نے انسان کے لیے سفر کی آسانی پیدا کی۔ نتیجتاً انسان نے اپنے ماحول کو فعال طریقے سے اپنے بس میں کر لیا اور ماحول کی ستم ظریفیاں آرام و آسائش میں مبدل ہو گئیں۔

ماضی قریب میں چھاپہ خانہ، ٹیلی فون اور انٹرنیٹ کی ٹیکنالوجی نے ترسیل و ابلاغ کی راہ میں حائل ہونے والی طبعی رکاوٹوں کو کم کر کے انسانوں کے لیے عالمی سطح پر آزادی کی ساتھ افکار و خیالات کے تبادلے کی راہ ہموار کر دی ہے۔ تاہم سکے کا دوسرا پہلو بھی ہے، جو زیادہ خوش کن اور خوش نظر نہیں ہے۔ ٹیکنالوجی کو پُر امن اور تعمیری مقاصد کے لیے ہی نہیں بلکہ مہلک ہتھیاروں اور مخرب اخلاق اشیا کے پھیلاؤ کے لیے بھی بے دریغ استعمال کیا گیا اور کیا جارہا ہے۔ کلبوں سے لے کر ایٹمی ہتھیاروں کا وجود اسی کا شاخسانہ ہے۔

ٹیکنالوجی نے سماج اور اس کے گرد ونواح کو کئی طریقوں سے متاثر کیا ہے۔ کئی معاشروں نے ٹیکنالوجی کی بدولت معیشت کے میدان میں حیرت انگیز حد تک ترقی کی ہے (مثلاً امریکہ، جاپان اور چین)۔ جس کے نتیجے میں ایک نامصروف طبقہ (Leisure Class) وجود میں آیا ہے۔ کئی دفعہ ٹیکنالوجی کے طریقہ ہائے عمل کے بعد کچھ ان چاہی باقیات پیچھے رہ جاتی ہیں۔ جنھیں ہم متعفن اشیا (Pollutants) سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ متعفن اشیا قدرتی وسائل پر اثر انداز ہو کر زمین اور اس کے ماحول پر ناکارہ اثر ڈالتے ہیں۔

طرح طرح کی ٹیکنالوجی کے استعمال نے انسانی اقدار کو بھی متاثر کیا ہے۔ ایک نئی ٹیکنالوجی عموماً ضابطۂ حیات اور اخلاق سے متعلق نئے نئے سوالات کو جنم دیتی ہے۔ ٹیکنالوجی کے حال اور مستقبل کے استعمال پر انسانی سماج میں خصوصاً دانشور طبقے کے درمیان کئی طرح کے فلسفیانہ مباحث بھی جاری وساری ہیں۔ ٹیکنالوجی آدم کی انسانی حیثیت پر کس طرح اثر انداز ہو رہی ہے اس سلسلے میں دانشوروں کے درمیان متضاد آرا پائی جاتی ہیں۔ Neo-Ludism، Anarcho - Primitivsm اور ایسی کئی تحریکیں دور جدید میں ٹیکنالوجی کے بے تحاشا استعمال کے خلاف ردِعمل کے طور پر وجود میں آئی ہیں۔ ان تحریکوں کے علمبرداروں کا ماننا ہے کہ ٹیکنالوجی زمینی ماحول کو تباہ کرنے کے ساتھ ساتھ لوگوں کو ایک دوسرے سے دور کر کے سماج کے اندر ایک اجنبی پن کی تشکیل کر رہی ہے۔ دوسری طرف Transhumanism اور Techno-Progressivism جیسے نظریات کے حامی اس بات میں یقین رکھتے ہیں کہ ٹیکنالوجی کا ارتقا انسان اور انسانی سماج دونوں کے لیے ثمر آور ہے۔ ماضی قریب تک لوگوں کا یہی خیال تھا کہ ٹیکنالوجی کا استعمال اور وجود و ارتقا صرف نوعِ انسانی تک ہی محدود ہے لیکن جدید سائنسی تحقیق نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ انسان کے علاوہ دیگر حیوانِ رئیسہ اور خنزیرِ بحری (سنگ ماہی) کی کچھ اقسام نے نہ صرف کئی سادہ اوزار بنائے ہیں بلکہ ان سے متعلقہ علم اور جانکاری کو اپنی آنے والی نسلوں تک منتقل کرنا بھی سیکھ لیا ہے۔

گزشتہ دو سو برس کے عرصے میں ٹیکنالوجی کی اصطلاح کے معنی میں ممکنہ حد تک تبدیلی آئی ہے۔ بیسویں صدی سے پہلے یہ اصطلاح انگریزی میں کمیاب تھی۔ اس اصطلاح کا اطلاق عموماً نفع بخش فنون کے حوالے سے ہی ہوتا تھا لیکن دوسرے صنعتی انقلاب کے ساتھ ہی ٹیکنالوجی کی اصطلاح کے معنی میں ایک انقلابی تبدیلی رونما ہوئی۔ امریکی ماہرینِ سماجیات نے جرمن لفظ Technik کو اپنے معنی اور محل استعمال سمیت عام انگریزی میں ترجمہ کر کے برتنا شروع کر دیا۔ یہاں اس بات کا جاننا ضروری ہے کہ جرمن اور دیگر یورپی زبانوں میں لفظ Technik اور Technology کے درمیان ایک نمایاں فرق موجود ہے جو کہ انگریزی میں مفقود ہے۔ یہاں (انگریزی میں) ان

دونوں اصطلاحوں کے لیے لفظ Technology ہی مستعمل ہے۔ 1930 کے آس پاس لفظ ٹیکنالوجی کا استعمال صنعتی فنون کے جاننے کے عمل کے معنی میں ہی نہیں بلکہ بذات خود صنعتی فنون کے لیے ہونے لگا۔ امریکی ماہر سماجیات ریڈ بین نے 1930 کے آس پاس لکھا تھا کہ ٹیکنالوجی میں تمام اوزار، مشینیں، آلات، ہتھیار، برتن، رہنے اور پہننے کے کام آنے والی اشیا، ترسیل وابلاغ کے ذرائع اور ہنرمندی جس کی بدولت یہ چیزیں وجود میں آتی ہیں سب شامل ہیں۔ ریڈ بین کی یہ تعریف آج بھی دانشوروں خصوصاً ماہرین سماجیات کے یہاں اُسی طرح مقبول ہے جیسے اُس زمانے میں تھی۔ دوسری جانب ٹیکنالوجی کی تعریف بحیثیتِ ایک افادی سائنس کے بھی یکساں اہمیت کی حامل ہے اگر چہ ماہرین سماجیات اس کے حق میں نہیں ہیں۔

لغات اور دانشور حضرات لفظ ٹیکنالوجی کی طرح طرح کی تاویلیں اور تعریفیں پیش کرتے ہیں: مریم ویبسٹر ڈکشنری کے مطابق: ''کسی ایک شعبۂ علم میں جانکاری کا عملی استعمال ٹیکنالوجی کہلاتا ہے'' اور ''علم کے عملی استعمال سے پیدا ہونے والی صلاحیت ٹیکنالوجی کہلاتی ہے''۔ اُرسولا فرینکلن نے 1989 کے اپنے مشہور خطبے 'ٹیکنالوجی کی حقیقی دنیا' میں ٹیکنالوجی کی تعریف بیان کرتے ہوئے کہا تھا: ''کسی کام کے انجام دینے کے طریقۂ کار کو ہم ٹیکنالوجی کہتے ہیں۔'' برناڈ اسگلر اپنی مشہور زمانہ کتاب ''Technics and Time'' میں ٹیکنالوجی کی دوطرح کی تعریفیں پیش کرتے ہیں: اوّل 'زندگی کا حصول غیر زندگی کی وساطت سے'، دوم 'ضابطہ بند غیر نامیاتی مادّہ'۔

مذکورہ بالا حقائق کو سامنے رکھ کر ٹیکنالوجی کو دو بنیادی زمروں، مادّی اور غیر مادّی ٹیکنالوجی میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ٹیکنالوجی کی یہ دواقسام کسی طے شدہ مقصد کو پانے کی خاطر ذہنی، اور عملی کوششوں سے ملموسی یا غیرملموسی (Tangible or Intangible) آلات و طریقۂ کار کی ایجاد کا موجب بنتی ہیں۔ یہ ایک وسیع میدان ہے جس میں سادہ اوزار مثلاً بجوکا سے لے کر پیچیدہ ترین مشین خلائی اسٹیشن شامل ہے۔ واضح رہے کہ ٹیکنالوجی کا مادی یا ملموسی (Tangible) ہونا قطعی ضروری نہیں ہے۔ سافٹ وئیر، تجارتی طریقۂ کار، علوم کی ڈیجیٹل شکل وغیرہ، غیر مادّی یا غیر ملموسی ٹیکنالوجی (Intangible Virtual-Technology) کے زمرے میں آتی ہیں اور یہ ٹیکنالوجی دیگر اقسام سے زیادہ مؤثر اور مکمل ہے۔

آج کا دور غیر ملموسی ٹیکنالوجی کا دور کہلاتا ہے۔ روز بہ روز سامنے آنے والی نئی نئی آسائشیں اور ایجادات دراصل غیر ملموسی ٹیکنالوجی کے ہی مظاہر ہیں۔ مختلف اقسام کی غیر ملموسی ٹیکنالوجی نے ہی اس بات کو ممکن بنایا ہے کہ نئی نئی سہولیات کو پانے کے لیے نئے نئے آلات بنانے کی بجائے موجودہ آلات کو ہی ہمہ استعمال (Multi-Purpose) بنایا جائے۔ اس سلسلے میں موبائل فون کی مثال بہت ہی اہم ہے۔ جہاں ابتدا میں موبائل فون ہم سے دور بیٹھے شخص سے بات کرنے یا اُس کی بات سننے کے کام آتا تھا۔ آج غیر ملموسی ٹیکنالوجی (سافٹ وئیر، ڈیجیٹائزیش، انفراریڈ، بلیوٹوتھ، اور وائی فائی وغیرہ) کی بدولت اسی موبائل فون سے گھڑی، ریڈیو، ٹیلی ویژن، ویڈیو پلیئر، ویڈیو ریکارڈر، آڈیو پلیئر، آڈیو ریکارڈر، ویڈیو ایڈیٹر، آڈیو ایڈیٹر، امیج ایڈیٹر، انٹرنیٹ براؤزر، تھرمامیٹر، بلڈ شوگر اینلائزر، بلڈ پریشر ریڈر اور یہاں تک کہ بزنس مشین کا کام بھی لیا جاتا ہے۔ آپ اپنے اسی موبائل فون میں ایسا سافٹ وئیر بھی لوڈ کرسکتے ہیں جس کی بدولت آپ رات بھر مچھروں کو خود سے دور رکھ کر چین کی نیند سوسکتے ہیں۔

انفارمیشن ٹیکنالوجی، جس نے پوری دنیا میں انقلاب برپا کردیا ہے، غیر ملموسی ٹیکنالوجی کی ہی جدید تر شکل ہے۔ جس کی بدولت جانکاری اور علوم کا ایک خزانہ ایک یا چند چنندہ بڑے کمپیوٹروں (Servers) پر مہیا رکھا جاتا ہے اور دنیا بھر کے لوگ اس مشترکہ خزانے کا یکساں طور پر اپنی علمی یا تکنیکی بساط کے مطابق استعمال کرتے ہیں۔ اس خزانے سے مستفید ہونے کا بنیادی سم سم ایک کمپیوٹر یا کمپیوٹر کی جدید صورتیں ہیں۔ مگر افسوس کہ ہمارے ملک میں خصوصاً اردو داں طبقہ کمپیوٹر سے محض ایک ٹائپ رائٹر کا کام لیتا ہے۔ اردو والے کمپیوٹر پر زیادہ سے زیادہ ایک کتاب یا مضمون ٹائپ کرتے ہیں یا پھر کسی دوست کے نام ای میل بھیج دیتے ہیں۔ بات سے بات نکل کر اردو تک چلی آئی ہے تو میں اپنے قارئین تک جو الحمدللہ سبھی اردو داں ہوں گے (اس مضمون کو پڑھنے کے لیے ان کے لیے اردو کی جانکاری ہونا مجبوری بھی ہے) اپنے اس اندازہ کو بصورت دعویٰ پہنچانا چاہتا ہوں کہ علم کا کوئی بھی شعبہ جو انفارمیشن ٹیکنالوجی کے ساتھ آج ہم آہنگ نہیں ہوگا یا ہم آہنگ ہونے کی کوشش نہیں کرے گا (کوششیں بہرحال رنگ لاتی ہیں)۔ آج سے چالیس پچاس برس کے بعد قصۂ پارینہ ہوکر رہ جائے گا۔ چاہے وہ سائنسی، سماجی یا پھر لسانی علوم ہوں۔

انفارمیشن ٹیکنالوجی نے حقیقتاً دنیا کو ایک عالمی گاؤں میں تبدیل کردیا ہے۔ زیادہ تر لوگ آمدورفت کے تیز رفتار ذرائع کو گلوبل ولیج بننے کا باعث سمجھتے ہیں لیکن میں اس بات سے اتفاق نہیں کرتا۔ کیونکہ آمدورفت کے جدید ذرائع آنے جانے کی رفتار کو تیز کرتے ہیں نہ کہ فاصلوں کو مٹاتے ہیں۔ لیکن انفارمیشن ٹیکنالوجی نے فاصلوں کو نہ صرف کم کیا ہے بلکہ بہت حد تک مٹا دیا ہے۔ اب آپ کو بینک تک کا فاصلہ طے کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اپنے کمپیوٹر کے سامنے بیٹھ کر ہی آپ بنک سے پیسے نکال سکتے ہیں یا پھر دوسرے اکاؤنٹ میں جمع کرسکتے ہیں۔ کوئی چیز خریدنی ہوتو بازار جانے کی بجائے آن لائن خرید کر آن لائن ہی پیسوں کی ادائیگی بھی کرسکتے ہیں۔ وہ کون سا شعبہ ہے جس میں انفارمیشن ٹیکنالوجی نے حیرت انگیز تبدیلی نہ لائی ہو۔ انفارمیشن ٹیکنالوجی نے علم کے حصول، پھیلاؤ، ارتقا، تعلیم وتعلم غرض ہر جہت پر بالادستی قائم کرلی ہے اس لیے اس سے دامن چھڑانا یا کبوتر کی طرح آنکھیں بند کرکے خود کو تسلی دینا کہ کچھ نہیں ہورہا ہے، خود کو موت کے منہ میں ڈھکیلنے کے مترادف ہوگا۔

آج روایتی کلاس روم کی جگہ غیر ملموسی (Virtual) کلاس روم لے رہا ہے۔ اُستاد کی ابتدا میں آموزگار (Instructor) کے درجے پر تنزلی ہوئی اور اب آموزگار یا Instructor کی جگہ ملٹی میڈیا سافٹ وئیروں نے لی ہے۔ اس صورتِ حال میں زبان، ادب، اخلاقیات اور مذہبیات جیسے علوم کی بقا کا راز تیز رفتاری کے ساتھ سامنے آنے والی ٹیکنالوجی خصوصاً انفارمیشن ٹیکنالوجی کے قریب جانے اور اس سے ہم آہنگ ہونے میں چھپا ہے۔ ان علوم کے عاشق اگر اسے لگاتار شجر ممنوعہ سمجھتے رہے تو یقین جانیے وہ وقت (خدا نہ کرے) جلدی آئے گا کہ جب ایسے علوم کو خلدِ علوم سے بے آبرو ہوکر نکلنا پڑے گا۔

جیسا کہ میں نے پہلے ہی عرض کیا کہ آج کل نئے آلات کی ایجاد کے بجائے موجودہ آلات کو ہمہ استعمال (Multi-Purpose) بنانے کا رجحان ٹیکنالوجی سے وابستہ حلقوں میں زور وشور سے چھایا ہے۔ اس کے پس پشت جو طریقہ یا نظام کارفرما ہے اُسے Digitisation یا 'برقیانے' کا نام دیا جاتا ہے۔ چونکہ انفارمیشن ٹیکنالوجی کے مظاہر آلات برقی رو کی مدد سے کام کرتے ہیں اس لیے ان میں مستعمل علم یا جانکاری کا برقی صورت میں ہونا لازمی بن جاتا ہے۔ اس برقی صورت کو Binary Form یا ذوالجہت شکل کہتے ہیں۔ اب علوم یا جانکاری کو ان کی بقا کی خاطر اس برقی صورت میں ڈھالنا ناگزیر بن گیا ہے (طوالت سے بچنے کے لیے Binary Form کی

مثالوں کو شامل اشاعت نہیں کیا گیا ہے)۔ ہاں اس سلسلے میں لوگوں کو خصوصاً اردو والوں کو طرزِ کہن چھوڑنی پڑے گی اور آئینِ نو کے ساتھ نبھانے کی ثمر آور سعی بھی کرنی پڑے گی۔ جس کے لیے سائنسی سوچ اور طرزِ فکر کا اپنانا لازمی ہے۔ اردو دنیا کے بارے میں یہاں پر فکری اصلاح یا ذہنی نشاۃ الثانیہ کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ میں اپنی بات کو اس عملی مثال سے ثابت کرنے کی کوشش کروں گا۔

تمام اردو داں طبقہ اس بات پر بضد ہے کہ وہ اردو زبان کو نستعلیق فانٹ میں ہی لکھنا اور پڑھنا پسند کرتے ہیں۔ یہ طبقہ نسخ فانٹ کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتا ہے۔ لیکن نستعلیق فانٹ کی یہ خامی ہے کہ اسے Digitise کرنے یا برقیانے میں جسے ہم سافٹ ویئر کی زبان میں Universal Coding کہتے ہیں بڑی مشکلیں پیش آتی ہیں۔ اس ہٹ دھرمی کی وجہ سے اردو زبان و ادب کو برقیانے (Digitisation of Urdu) میں کم سے کم بیس سال کی دیری ہوئی۔ جب تک کہ سنہ 2006-07 میں پاکستان اور برطانیہ میں مقیم چند محبانِ اردو نے نستعلیق فانٹ کی Universal Coding کو ممکن نہ بنا دیا۔

یہ بات بھی صحیح ہے کہ یہ کام انفرادی سطح پر کرنا بڑا کار دارد والا معاملہ ہے۔ جس کے لیے اردو زباں کے تئیں عشقِ فرہاد دل میں ہونا ضروری ہے۔ اردو کی ترویج و بقا کے لیے قائم کیے گئے اداروں کو اس سلسلے میں آگے آنا چاہیے۔ لیکن عموماً دیکھنے میں آیا ہے کہ ان اداروں سے وابستہ افراد سستی شہرت اور تشہیر کے متوالے ہوتے ہیں۔ اس سلسلے میں میرا بڑا ہی تلخ تجربہ ہے۔ میں اور میرے فاضل دوست اختر رسول صاحب نے سنہ 2006 میں اردو زبان کے کئی Language Packs اور کچھ چھوٹی موٹی Data Bases تیار کی تھی۔ لیکن نہ ہی کسی اردو ادارے نے ہماری حوصلہ افزائی کی اور نہ ہی اس کام کو آگے لے جانے کی خاطر تعاون کے لیے تیار ہوئے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ جب میں نے نوکری کی خاطر ایک انٹرویو میں اردو کی اس صورت حال کے بارے میں بات کی تو کمیٹی کے ارکان میں ایک ریٹائر شدہ پروفیسر نے خفا ہو کر مجھ سے کہا کہ آپ کیا کہتے ہیں کہ اردو ابھی ڈیجیٹل ورلڈ کا حصہ نہیں بنی ہے میں تو روز ان پیج میں اردو رسم الخط میں ٹائپنگ کرتا ہوں۔ میں نے جواباً عرض کیا کہ اگر اردو زبان واقعتاً Digitise ہوئی ہے تو پھر آپ کے فون میں، انٹرنیٹ براؤزر یا گوگل سرچ انجن میں اردو کہیں نظر کیوں نہیں آ رہی ہے۔ یہ جواب سن کر مذکورہ ریٹائرڈ پروفیسر صاحب نے مجھے نوکری کے لیے نااہل قرار دیا۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو زبان سے محبت رکھنے والے اساتذہ اور دیگر افراد ایک عزمِ مصمم کے ساتھ آج ہی سے اردو کے برقیانے کے عمل میں اپنی بساط بھر کوشش کریں۔ اس سلسلے میں درج ذیل اقدامات بھی موثر ثابت ہو سکتے ہیں:

- اردو کے اساتذہ صاحبان کو چاہیے کہ پاور پوائنٹ پرزینٹیشن اور دیگر ملٹی میڈیا سافٹ ویئر و آلات کا تدریس اردو کے دوران ضرور استعمال کریں۔
- ابتدائی کلاسوں میں اردو پڑھانے کے لیے Animated اسباق تیار کیے جائیں۔
- بول چال کی اردو سکھانے کے لیے اسباق چھوٹے چھوٹے Flash Files کی شکل میں تیار کیے جانے چاہیے۔

ایم اے اردو اور ایسی دیگر اردو کی ڈگریوں میں ایک پرچہ لازماً کمپیوٹر کا رکھا جائے۔

- اپنے موبائل فون اور ڈیجیٹل ڈائری میں اردو زبان کے Plug Ins بھی انسٹال کرا کے استعمال کیے جائیں۔
- اردو کی ترقی اور بقا کے لیے بنائے اداروں کو اس بات کی کوشش کرنی چاہیے کہ Linux ،Mac ،Windows اور ایسے ہی دیگر Operating Systems کی یونی کوڈ پیکیج میں اردو کو بھی شامل کرایا جا سکے۔ ایسا کرنے کے لیے مذکورہ اداروں کو Unicode Consortium کی ممبر شپ حاصل کرنی چاہیے اور Consortium کو وقت وقت پر اردو زبان کے ماہرین کی خدمات مہیا کرانی چاہیے۔ یونی کوڈ کنسورٹیم ایک غیر منافع ادارہ ہے جس کا قیام عالمی معیار کے یونی کوڈ ورژن کی تیاری کے لیے عمل میں لایا گیا ہے تا کہ دنیا کی تمام زبانوں اور رسم الخطوں کو صحیح صورت میں برقیایا جا سکے۔ اس کنسورٹیم کے ممبران میں تمام دنیا کے انفارمیشن پروسسنگ اور کمپیوٹر سے وابستہ ادارے ہیں جن میں:

Adobe Systems, Apple, Google, IBM, Microsoft, Monotype Imaging, Oracle, SAP, The Society for Natural Language Technology Research, The University of California (Berkeley), The University of California (Santa Cruz), Yahoo!, plus حکومتِ بنگلہ دیش، حکومتِ ہندوستان اور سیکڑوں ادارے اور افراد شامل ہیں۔

- صوتی پہچان والے سافٹ ویئر Speech Recognition Softwares اور پلگ انز بنانے کے لیے اردو اکادمیوں اور ایسے دیگر اداروں کو چھوٹے چھوٹے منصوبے ترتیب دینے چاہیے۔

حکومت ہندوستان نے ہندوستان کے آئین میں شامل 22 زبانوں اور ان کے ادب کو برقیانے کے لیے ایک جامع ادارہ TDIL (Technology Development For Indian Languages) کے نام سے قائم کیا ہے۔ جس پر ہر سال کروڑوں روپے خرچ کیے جاتے ہیں۔ لیکن یہاں دیگر زبانوں کی بہ نسبت اردو زبان پر بہت ہی کم کام ہوا ہے۔ چونکہ اردو والے شاید ابھی ڈیجیٹل ٹیکنالوجی کے تئیں اتنے حساس نہیں ہیں۔ اس لیے ایسے اداروں کے کام کاج پر نظر رکھنے والا یا ان سے کام کروانے والا کوئی پریشر گروپ موجود نہیں ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ایسے اداروں کو تعاون بھی دیا جائے اور ان سے کام بھی کروایا جائے۔

مجھے اُمید ہے کہ مذکورہ بالا اور ایسے ہی دیگر اقدامات اُٹھانے سے اردو زبان عالمی جانکاری سمندر Information Sea کا حصہ بہت جلد بن جائے گی۔ مگر ضرورت ہے خلوص اور جذبے کے ساتھ کام کرنے کی۔

اے کاش اردو والے جاگ جائیں!!

ماخذ:

1. "Definition of technology". Merriam-Webster. http://mw1.merriam-webster.com/dictionary/technology.
2. George Crabb, Universal Technological Dictionary, (London:Baldwin, Cradock and Joy, 1823)
3. Read Bain, "Technology and State Government," American Sociological Review 2 (December 1937): 860.
4. Franklin, Ursula. "Real World of Technology". House of Anansi Press.
5. Haviland, William A. (2004). Cultural Anthropology: The Human Challenge. The Thomson Corporation. p. 77. ISBN 0534624871.
6. Oakley, K. P. (1976). Man the Tool-Maker. University of Chicago Press. ISBN 978-0226612706 .

Dr. Mushtaque Hyder, Asst. Prof. Dept of Urdu, Kashmir University, Srinagar (J&K)

سیدہ شانِ معراج

مثنوی اسرارِ محبت

تاریخ ادب میں اردو مثنویوں کا صحیح مقام جاننے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ان کا جائزہ تاریخی و معاشرتی پس منظر میں لیا جائے۔ اردو ادب نے فارسی سے بہت کچھ لیا ہے۔ اس میں ایرانی اور اسلامی روایات کا رنگ بہت گہرا ہے۔ لیکن یہ ہندوستان سے بیگانہ نہیں اس لیے یہاں کے ماحول، معاشرت، اور تہذیب و تمدن کے اثرات بھی قبول کیے۔ قدیم مثنویوں میں قصے کہانیاں بیان کی جاتی تھیں جن کا قومی روایات اور مذہب و معاشرت سے گہرا تعلق ہوتا تھا۔ رفتہ رفتہ مثنویاں مشترکہ تہذیب اور ملی جلی معاشرت کے زیر اثر لکھی جانے لگیں اس لیے ان میں اسلامی قصے، کہانیوں کے علاوہ ہندوستانی لوک کتھاؤں، نیم تاریخی اور عوامی روایتوں سے متاثر ہونے کا رجحان پایا جاتا ہے۔

نیم تاریخی قصے پر مبنی مثنوی 'اسرارِ محبت' کی وقعت اور اہمیت اس لیے اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ یہ ایسے دور میں لکھی گئی جو مثنوی کا دور نہیں تھا۔ میر حسن کی مثنوی کو مستثنیٰ کر دیجیے تو مثنوی اس دور کی چیز نہیں۔ نظم و نثر میں اردو فارسی کے جتنے مصنفوں نے 'سسی پنوں' کے قصے کو لکھا ہے، ان میں سے اکثر مشہور و مقبول ہوئے۔ اس قصے کا صحیح عہد اب تک دریافت نہیں ہوسکا۔ بعض محققین اسے زمانۂ اسلام سے پہلے کا بتاتے ہیں۔ 'سسی' سنسکرت لفظ ششی (چاند) اور 'پنوں' پورن سے لسانی مشابہت رکھتے ہیں۔ اس قصے کے ہندوستانی ہونے کے بارے میں ایک دلیل یہ بھی ہے کہ اس میں اظہارِ محبت عورت کی طرف سے ہوتا ہے جو خالص ہندی انداز ہے۔ یہ قصہ محبت خاں نے 1782 میں مسٹر جانسن کی فرمائش پر منظوم کیا۔ قدیم تذکرہ نگاروں، منشی عبدالکریم، مرزا علی لطف، گارساں دتاسی، میر حسن، اور نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ نے اپنے تذکروں میں اس مثنوی کا ذکر کیا ہے۔ محبت کی عشقیہ مثنوی بھی اسی نظریے کے تحت لکھی گئی یہ میر اور اس دور کے دوسرے لوگوں کا یہ نظریہ تھا۔ میر اور محبت ہمعصر تھے۔ محبت بھی میر کی طرح جذبۂ عشق کو بڑی متبرک شے سمجھتے تھے۔

محبت کی مثنوی اپنی ادبی خصوصیات کی بنا پر اردو کی ممتاز مثنویوں میں شمار کی جاتی ہے لیکن اہم تاریخی قصے پر مبنی مثنوی 'اسرارِ محبت' کو دہلی اور لکھنؤ کے شعرا خاطر میں نہ لاسکے اس کی وجہ یہ بھی رہی کہ یہ قصہ پنجاب کی سرزمین کے باعث مروّج نہ ہوسکا۔ یہ قصہ کسی طور پر بھی ہندوستانی پسند نہ بن سکا۔ اس کا سبب تاریخی اور جغرافیائی رہا۔ اس قصے کی جائے وقوع سندھ اور مغربی پنجاب بتائی جاتی ہے اور ان مقامات کو ماورائے ہندوستان سمجھنے کی روایت عرصے سے چلی آرہی ہے۔

محبت کا زمانہ (1782) وہ زمانہ تھا جب اردو شاعری دہلی سے اپنا ڈیرا اٹھا رہی تھی اور دوسرے مقامات لکھنؤ وغیرہ کو اپنا مسکن بنا رہی تھی۔ لکھنؤ کو دہلی کے بعد مرکزی حیثیت حاصل رہی ہے۔ اردو شاعری یہیں پروان چڑھی۔ جو شاعری دہلی کے فقیروں کی محفلوں میں پرورش پا رہی تھی وہ اب لکھنؤ کے نوابوں اور امیروں کی سرپرستی میں پروان چڑھنے لگی اور رفتہ رفتہ خلوص و صداقت سے عاری ہوتی گئی لیکن محبت کی شاعری میں ابھی دہلوی تہذیب و تمدن کے آثار نمایاں تھے۔ یہی وجہ ہے کہ محبت کی مثنوی میں وہ بے اعتدالیاں برائے نام ہیں جنھوں نے لکھنؤ کی شاعری کو قالب بے جان بنا کر رکھ دیا۔

نواب محبت خاں، حافظ الملک نواب رحمت خاں، والیِ بریلی کے فرزند تھے۔ وہ جنگ روہیلہ کے بعد الٰہ آباد میں قید رہے۔ آصف الدولہ کے زمانے میں رہائی پا کر لکھنؤ آئے۔ پہلے خواجہ میر درد سے تلمذ تھا۔ لکھنؤ آنے پر مرزا جعفر علی حسرت سے اصلاح لینے لگے۔ آدمی خوش رو اور خوش خصال تھے۔ میر حسن بھی ان کی موزونیِ طبع کے قائل تھے۔ شیفتہ ان کو خداوند فہم و فراست مانتے تھے۔ گارساں دتاسی بھی ان کی پارسائی اور ذہانت کے معترف تھے۔

مثنوی 'اسرارِ محبت' کے متعدد نسخے ہیں لیکن یہ قصہ تمام قصوں میں یکساں ہے۔ 'سسی پنوں' اور 'ہیر رانجھا' کے قصوں میں اتنی مماثلت ہے کہ سسی، ہیر کی بھتیجی تھی اور حسن و جمال میں اپنا ثانی نہیں رکھتی تھی۔ ایک دفعہ سسی کی سہیلی نے بتایا کہ بلوچیوں کا ایک قافلہ اس کے باغ میں اُترا، اس میں 'پنوں' نام کا نوجوان نہایت حسین و دلکش ہے۔ سسی پہلی نظر میں ہی گرفتارِ محبت ہوجاتی ہے۔ آدھی رات کو باغ میں آتی ہے۔ دونوں بادۂ وصل سے سرشار رہتے ہیں۔ اسی عالم کیف و سرور میں دونوں محوِ خواب ہوجاتے ہیں۔ یہ مثنوی کا عروج ہے۔ اس کے بعد زوال شروع ہوجاتا ہے۔ پنوں کے رفیقوں کو اس بات کی خبر لگ جاتی ہے۔ رسوائی کے ڈر سے رات میں کوچ کر جاتے ہیں۔ صبح آنکھ کھلنے پر سسی، پنّوں کو نہ پا کر اس کی تلاش میں نکل کھڑی ہوتی ہے اور پنوں کے شہر جنگ سیال میں پہنچتی ہے۔ قاصد کے ہاتھ انگوٹھی بھیجتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ پنوں کی شادی اس کی ہم قوم عورت سے ہورہی ہے۔ سسی کا سارا طلسم ٹوٹ جاتا ہے اور اس خبر کی تاب نہ لا کر حرکتِ قلب بند ہوجاتی ہے۔ پنوں کو جب پتہ لگتا ہے تو وہ اس کی لاش پر آ کر جاں بحق ہوجاتا ہے۔ اسی طرح پنوں کی منگیتر اس حادثۂ جانکاہ کی تاب نہ لاسکی اور اس نے بھی جان شہیدانِ محبت پر قربان کردی۔

محبت نے اصلی پلاٹ کو بہت کم کردیا ہے۔ کئی واقعات حذف کردیے ہیں۔ سسی کے پنوں کے شہر پہنچنے، انگوٹھی بھجوانے اور اس کی شادی کی خبر سن کر ہلاک ہونے کا ذکر کسی قصہ نگار نے نہیں کیا ہے۔ یہ محبت کی اختراع ہے۔ اصل قصہ یہ ہے کہ سسی، پنوں تک پہنچ ہی نہیں پاتی ہے۔ راہ میں 'لو' اور تپش سے تڑپ تڑپ کر مر گئی تھی۔

محبت خاں کی جذبات نگاری اور اسلوب نہایت دلکش ہے۔ واقعات اور جذبات کے بیان میں انھیں ملکہ حاصل تھا۔ محبت، برمحل واقعہ نگاری، منظر نگاری اور دوسرے لوازمات کا بہت خیال رکھتے تھے۔ قصے کی رفتار بہت تیز

ہے۔ ابتدا کی طرح انتہا بھی محبت کے فلسفے پر ہوتی ہے۔ کردار نگاری میں بھی وہ خاص کرداروں کو ابھارتے ہیں۔ پوری مثنوی میں سب سے بڑا کردار خود ہیروئن یعنی 'سسی' کا ہے۔ محبت نے اپنی مثنوی آصفی عہد سے لکھنؤ کے دوران قیام تحریر کی تھی جب زبان پر تکلفات کا دبیز پردہ پڑا ہوا تھا لیکن محبت کا کمال ہے کہ انھوں نے اپنے کو جرأت اور مصحفی سے بچائے رکھا اور وہ زبان تحریر کی جو آج ہی کی زبان معلوم ہوتی ہے۔ مرزا جعفر علی حسرت کے سوز و گداز کی جھلک محبت کے کلام میں کافی ہے۔ 'سسی' کا حال انھوں نے جس سادگی اور دردمندی سے بیان کیا ہے اس سے قاری یا سامع کا دل متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ اس اعتبار سے مثنوی اسرارِ محبت حالی کے بیان کردہ اصولوں پر پوری اترتی ہے۔

عہدِ حاضر کے جدید نقاد جلال الدین احمد نے مثنوی کو پرکھنے کا نیا میزان عطا کرتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ ''مثنوی میں غزل کا سوز و گداز، معاملہ بندی، قصیدے کی تشبیب کی رنگارنگی، شان و شوکت، نظم کا تسلسلِ بیان، مرثیہ کا غم والم، رزم کی ہنگامہ آرائی، سبھی اقسام کے اوصاف کا اجتماع کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مثنوی، نظم کی سب سے زیادہ جامع قسم ہے۔'' مثنوی 'اسرارِ محبت' کو جدید عہد کے اس تنقیدی میزان پر پرکھا جائے تو آزاد اور حالی کے میزانوں پر جس طرح یہ کھری اُترتی ہے، اسی طرح اس پر بھی پوری اُتری ہے۔ یہ مثنوی اپنے اندر کچھ ایسے انداز رکھتی ہے جس سے قدیم و جدید دونوں نقاد متاثر نظر آتے ہیں۔

آزاد نے مثنوی کی سرگزشت اور بیان ماجرا سے تعبیر کرتے ہوئے اسے تاریخ کے تحت رکھا ہے اور اس کی خوبی میں زبان کی صفائی، جذباتیت اور سادگی کو خاص اہمیت دی ہے۔

مرزا علی لطف 'تذکرۂ گلشنِ ہند' میں لکھتے ہیں ''محبت کی مثنوی کی خصوصیت زبان اور محاورے کا برجستہ و برمحل استعمال، طرزِ ادا کی نزاکت دل کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔'' 'گلشنِ بے خار' میں نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ ان کی سلاست اور جذبات نگاری کے قائل ہیں۔ تذکرۃ الشعرا میں میر حسن نے فرمایا کہ ''محبت خاں نے قصہ نگاری کے تمام فرائض پورے پورے ادا کردیے ہیں۔ وہ میر کی طرح عشق میں ڈوب جاتے ہیں۔ تذکرۂ خازن الشعرا کا مصنف محبت کی اسی مثنوی کا قائل ہے اور اس کو 'نقدِ شیریں' بتاتا ہے۔

جدید تذکروں 'گلِ رعنا' میں مولانا عبدالحی صاحب نے بھی جرأت کے تذکرے سے اس مثنوی کا ذکر کیا ہے۔ مولانا حسرت موہانی نے 'مجموعۂ' کے نام سے تین مثنویوں کو شائع کیا تھا اُس میں ایک 'اسرارِ محبت' بھی ہے۔

محبت کی مثنوی اپنی ادبی اور فنی خوبیوں، لب و لہجے کی سادگی کی بنا پر ادب میں منفرد مقام رکھتی ہے اور ایسا لگتا ہے کہ کسی قادرالکلام شاعر کی تصنیف ہے۔ مجنوں گورکھپوری نے مثنوی کو کامل العیار قرار دیا ہے۔ عبدالقادر سروری، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور ڈاکٹر محمد عقیل سبھی نے اسے نئے تنقیدی میزان پر تولا ہے اور سب کی مشترکہ رائے ہے کہ دو سو برس گزرنے کے بعد بھی اپنی خصوصیت کے اعتبار سے یہ اس دور کی تصنیف معلوم پڑتی ہے۔

اس مثنوی میں ہر اعتبار سے شاعری اپنے عروج پر ہے اور شاعری تو احساس کی مصوری ہے اس احساس کی جو حسن کے آنچل میں لپٹ جائے تو ماہتابوں کی تابانی سے نگاہوں کو خیرہ کردے اور عشق کی شوریدہ سری کا دامن تھام لے تو صحرا کے تپتے ہوئے ریگزاروں کو پسینہ آجائے۔ شاعری کی یہ تعریف، محبت کی مثنوی کی تعریف ہے اور 'اسرارِ محبت' شاعری کے انھیں اوصاف پر پوری اُترتی ہے۔

مثنوی 'اسرارِ محبت' کے متعدد نسخے ہیں لیکن قصہ تمام نسخوں میں ایک ہی ہے۔ مثنوی کی ابتدا محبت کے فلسفے سے ہوتی ہے اور حمد و نعت کے سبھی اشعار کے فلسفے کے سلسلے بیان کردیے جاتے ہیں۔ ہر شعر محبت ہی سے شروع ہوتا ہے اور بائیس اشعار تک محبت کا لفظ ابتدا میں آتا ہے:

محبت نام در ہر دل مکیں ہے
محبت سے کوئی خالی نہیں ہے
جو سمجھو ذات مطلق فی الحقیقت
محبت ہے، محبت ہے محبت
محبت ظاہر و باطن محبت
محبت اول و آخر محبت

زیادہ تر مثنوی 'اسرارِ محبت' کا نام نواب محبت خاں کے سلسلے میں آتا ہے مگر کسی کسی تذکرے میں صرف محبت خاں کا نام ہے، مثنوی کا ذکر نہیں ہے۔

محبت مثنوی کی ابتدا میں حضرت علی کی شان میں ایک منقبت لکھتے ہیں، جس میں یہ بیان کرتے ہیں کہ عشق کا سرچشمہ اور عشق کا باعث حضرت علی ہیں:

اوسے ہے عشق جو نفسِ نبی ہے
اوسے ہے عشق جو مولا علی ہے
کہ وہ مشکل کشا ہے قابلِ عشق
ہوئی آساں اُسی سے مشکلِ عشق
رکھ اس بحرِ ولایت سے سر عشق
کہ ہے وہ آبروئے گوہرِ عشق

میر کے بعد یہ اس دور کی خاص مثنوی ہے جو دامنِ دل کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ محبت خاں نے اس مثنوی کو 1197ھ برطابق 1782 میں لکھا تھا۔ یہ تاریخ محبت خاں نے مثنوی کے ایک شعر سے بتائی ہے:

کہتی تاریخ اس کی یہ بصنعت
عجب قصہ ہے اسرارِ محبت

محبت کے قصے کی رفتار بہت تیز ہے۔ قاری انجام پر زیادہ نظر رکھتا ہے۔ یہ قصہ محبت کا طبع زاد نہیں اس سے پہلے بھی نثر میں ملتا ہے۔ مگر انھوں نے اس طرح بیان کیا ہے کہ بالکل احساس نہیں ہوتا کہ یہ ان کی کہی ہوئی کہانی نہیں ہے۔ انھوں نے اس کی بحر بھی بہت سوچ سمجھ کر منتخب کی ہے جو اثر انگیز ہے۔ ابتدا کی طرح انتہا بھی محبت کے فلسفے پر ہوتی ہے۔ آخری بند میں دردانگیز بیان نے محبت کی حقیقت کو بہت مؤثر اور عبرت انگیز بنادیا ہے:

محبت صدمۂ محشر کی آفت
محبت ہی سے ہوجاوے قیامت
سو کہہ یہ نظم سرکارِ محبت
رکھا نام اس کا اسرارِ محبت

نواب محبت خاں کو شعر و سخن سے فطری لگاؤ تھا۔ فارسی اور اردو دونوں میں شعر کہتے تھے۔ فارسی میں مرزا فاخر لکھنوی کے شاگرد ہوئے۔ آدمی سخن سنج و صاحب ذوق تھے۔ اُن کی زبان بڑی صاف اور ہلکی پھلکی ہے اور آج کی زبان معلوم پڑتی ہے۔ مثنوی میں ایک جگہ پر 'سسی' کی حالتِ غیر کا اس طرح ایک شعر میں بیان کیا ہے کہ وہ آج کا شعر معلوم ہوتا ہے:

جگر پر داغ میرے دے گیا وہ
متاعِ صبر و طاقت لے گیا وہ

غزل کی جادو بیانی ہو یا مثنوی کی کہانی 'محبت' کی جذبات نگاری اور اسلوب کی کامیابی کا لوہا ماننا پڑتا ہے۔ وہ ایک ماہر و مشاق شاعر تھے۔ مثنوی 'اسرارِ محبت' اردو ادب میں اپنا ایک مقام رکھتی ہے۔

■

Syeda Shane Meraj
Tareen Takli, Shahjahanpur - 242001 (UP)

> **مثنوی میں غزل کا سوز و گداز، معاملہ بندی، قصیدے کی تشبیب کی رنگارنگی، شان و شوکت، نظم کا تسلسل بیان، مرثیہ کا غم و الم، رزم کی ہنگامہ آرائی، سبھی اقسام کے اوصاف کا اجتماع کیا جاتا ھے۔ یہی وجہ ھے کہ مثنوی، نظم کی سب سے زیادہ جامع قسم ھے۔**

عبدالکریم رضوان

کنہیالال کپور اور اردو زبان وادب

سرزمینِ پنجاب ہمیشہ سے بہت زرخیز رہی ہے۔ خواہ وہ زرعی پیداوار ہو یا ادبی۔ اردو زبان وادب کو اقبال جیسا بین الاقوامی شہرت یافتہ شاعر پنجاب نے ہی دیا۔ اقبال کے علاوہ اور بھی بہت سے شعرا وادبا کا تعلق پنجاب سے ہے۔ جنھوں نے اردو زبان وادب کی آبیاری کی اور اسے اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا۔ ایسے ہی ادیبوں میں ایک نمایاں نام کنھیا لال کپور کا بھی ہے، جنھوں نے اردو زبان وادب میں طنزیہ ومزاحیہ مضامین کے ذریعے اپنی ایک الگ شناخت قائم کی۔ کنھیا لال کپور نے طنز ومزاح کے فن کو ایک مقصد کے تحت برتا اور اسے اپنی کوشش و کاوش سے بلندی عطا کی۔

کنھیا لال کپور کی پیدائش 27 جون 1910 کو پنجاب کے ضلع لائل پور میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم اپنے آبائی وطن سے حاصل کرنے کے بعد، ڈی اے وی کالج لاہور سے بی اے اور گورنمنٹ کالج لاہور سے انگلش میں ایم اے کیا۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں انھیں پطرس بخاری جیسے قابل استاد اور اردو ادب کے ممتاز مزاح نگار کی سرپرستی حاصل ہوئی۔ جس کی بنا پر کنھیا لال کپور کے اندر سویا ہوا ظرافت نگار حرکت میں آیا۔ مزید تحریک انھیں اپنے دوست اور مشہور افسانہ نگار کرشن چندر سے ملی۔ کہا جاتا ہے کہ اگر مہابھارت میں دیوکی نندن کرشن نے ارجن کو ہتھیار اٹھانے پر آمادہ نہ کیا ہوتا، تو شاید مہابھارت جیسے دھرم 'یدھ اور ارجن جیسے مہارتھی سے دنیا نا آشنا رہتی۔ ٹھیک اسی طرح اگر کرشن چندر نے کنھیا لال کپور کو قلم اٹھانے کی تحریک نہ دی ہوتی، تو شاید! اردو ادب کے ترکش میں طنز ومزاح کے مختلف اقسام کے اتنے تیر نہ ہوتے اور کنھیا لال کپور جیسے ظرافت نگار سے ہماری شناسائی بھی نہ ہوتی۔

کنھیا لال کپور نے 1936 سے لکھنا شروع کیا اور زندگی کے آخری ایام تک مسلسل لکھتے رہے۔ 1942 میں رسالہ 'ادبی دنیا' میں شائع ان کا مضمون 'غالب جدید شعرا کی ایک مجلس میں' نے راتوں رات انھیں شہرت کی بلندی عطا کر دی اور اردو زبان وادب میں ایک ہنگامہ برپا کر دیا۔ اس مضمون میں ترقی پسند شعرا کے کلام میں تحریف کر کے انھیں طنز کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ اسی سال ان کے مضامین کا پہلا مجموعہ 'سنگ وخشت' کے نام سے مکتبہ جدید لاہور سے شائع ہوا۔ اسے ادبی حلقوں میں کافی سراہا گیا۔ ان کے کل دس مجموعے ان کی زندگی میں اور ایک مجموعہ ان کے انتقال کے بعد منظرِ عام پر آیا۔ کنھیا لال کپور اردو زبان وادب کے فن کار اور ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ انگریزی ادب کے ایک اچھے استاد بھی تھے۔

کنھیا لال کپور نے انشائیہ نگاری، خاکہ نگاری، تحریف نگاری اور کالم نگاری جیسے سبھی اصناف میں اپنے قلم کا جوہر دکھایا۔ وہ اپنے طنزیہ ومزاحیہ اسلوب سے ہر فرسودہ وبیہودہ چیزوں کا مذاق اڑاتے رہے۔ انھوں نے انسانی زندگی اور انسانی سماج کو متاثر کرنے والے تمام پہلوؤں کو اپنا موضوعِ قلم بنا کر ہر خاص وعام کو آئینہ دکھانے کی کوشش کی اور ان کی اصلاح کے خواہاں بھی رہے۔ چاہے وہ مذہب کے نام پر اندھے عقائد ہوں، مکار سیاستدانوں کی گندی سیاست ہو، سماجی ٹھیکیداروں کی پُر رعب سماجی بالادستی ہو یا انسانی ذہن ودل کو متاثر کرنے والا حسین ادب ہو۔ کنھیا لال کپور کو جہاں کہیں بھی کجی اور بدعملی نظر آئی اپنے طنز ومزاح کے اوزاروں سے اس کی اصلاح میں لگ گئے۔ ان کا ہر مضمون قارئین کو بہت جلد اپنی گرفت میں لے لیتا ہے کیوں کہ وہ اپنے موضوع کا مواد انسانی زندگی کے روزمرہ کے حالات وواقعات سے حاصل کرتے ہیں، جس کی وجہ سے ان کی تحریروں کو پڑھنے والا ان سے مانوس ہو کر مضمون میں مکمل طور پر شامل ہو جاتا ہے۔ ان کے مضامین کی خاص اور اہم بات ان کا اسلوب ہے۔ ان کے اسلوب کی سادگی، شگفتگی اور صاف گوئی نے ان کو دیگر ظرافت نگاروں سے ممتاز رکھا۔

کنھیا لال کپور نے جب لکھنا شروع کیا وہ ایسا زمانہ تھا جب ساری دنیا پہلی عالمی جنگ کے زخموں کو کرید کر دوسری عالمی جنگ کی طرف بڑھ رہی تھی۔ ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف باغیانہ تیور شتاب سے شتاب تر ہو رہے تھے۔ سیاسی وسماجی تبدیلی کے ساتھ تمام زبانوں کے ادب میں غیر معمولی تغیر بھی ہو رہا تھا۔ ترقی پسند تحریک اپنے عروج پر تھی۔ ایسے وقت میں اردو زبان وادب میں بھی نت نئے تجربے ہو رہے تھے۔ ان لمحات میں کنھیا لال کپور کا ذہن جہاں سیاسی ومعاشرتی طور پر بیدار تھا، اس سے کہیں زیادہ بیداری اور حساسیت ان کے ادبی شعور میں دیکھنے کو ملتی ہے۔

وہ ادب برائے زندگی کے قائل ہونے کے باوجود ادب کے فن اور روایت سے سمجھوتا کرنے کو تیار نہیں تھے۔ انھوں نے اپنے ظریفانہ اور طنزیہ لب ولہجے سے اردو ادب میں پیدا ہونے والے مریضانہ جراثیم کا سدباب کیا اور اردو ادب کو صحت مند وتوانا بنانے کی بھرپور سعی کی۔ وہ ترقی پسند تحریک کے زیر اثر لکھے گئے ان تمام ادب پاروں کو اپنے طنز کا نشانہ بناتے ہیں، جن سے انسانی اقدار اور اخلاقی بحران کے ساتھ اردو ادب کا تقدس بھی پامال ہو رہا تھا۔ ایک اقتباس دیکھیے:

''سو فیصد ترقی پسند افسانے وہ ہیں جن میں بھائی بہن سے اور بیٹا ماں سے عشق کرتا ہے عموماً یہ بھائی بہن نہایت تعلیم یافتہ ہوتے ہیں۔ انھوں نے ڈاکٹر فرائیڈ کا مطالعہ کیا ہوتا ہے اور ان کی نظر میں بہن بہن نہیں ہوتی بلکہ عورت ہوتی ہیں''

ترقی پسندی کے نام پر مغرب پرستی کی اس اندھی تقلید کو کنھیا لال کپور ہندوستانی سماج اور اردو ادب کے لیے بہت مضر سمجھتے تھے۔ اس پورے مضمون میں انھوں نے اس وقت کے تمام افسانوں کی ہیئت اور ان کے مواد پر ظریفانہ انداز میں سیر حاصل گفتگو کرتے ہوئے افسانہ نویسوں کو ہندوستانی پس منظر میں افسانہ نگاری کا پیغام بھی دیا ہے۔ کیونکہ کنھیا لال کپور اردو زبان وادب کو

ہندوستانی تہذیب وثقافت کا امین اور ترجمان مانتے تھے۔اسی ضمن میں مزید لکھتے ہیں:

’’وہ ایسے افسانے لکھتے وقت بھول جاتے ہیں کہ یہ ہندوستان ہے۔ جہاں آئندہ دو ہزار سال تک سوائے اپنی بیوی کے کسی اور عورت سے عشق نہیں کیا جاسکتا۔‘‘

ان اقتباس کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کنھیا لال کپور نے بے مصرف اور وقت گزاری کے لیے قلم نہیں اٹھایا تھا بلکہ ان کا مقصد جہاں ایک طرف ہندوستان کے سیاسی ومعاشرتی حالات کو خوش رنگ اور حسین بنانے کا تھا، وہیں اس ماحول کو بہتر بنانے میں اہم کردار ادا کرنے والے ادبا وشعرا کو ان کے فرائض کی یاد دہانی بھی تھی۔ کنھیا لال کپور نے صرف افسانہ اور افسانہ نویسوں کو ہی اپنے طنز کا نشانہ نہیں بنایا۔ بلکہ وہ ترقی پسند شعرا بھی ان کی ظریفانہ تحریروں کی زد میں آئے ہیں، جنھوں نے شاعری جیسی دلکش اور پرلطف صنف ادب کو ادبیت ادر مقصدیت سے خالی رکھا اور اس کی بنیادی و روایتی ہیئت میں تغیر پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اس ضمن میں ان کے کئی عمدہ مضامین ہیں۔ مثال کے طور پر ’حالی ترقی پسند شعرا کی محفل میں‘ کا یہ اقتباس دیکھتے چلیں:

’’حالی: تو سب سے پہلے میں جناب طویل لکھنوی سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ اپنی نظم پڑھیں۔ طویل لکھنوی: نظم کا عنوان ہے ’پرواز‘ عرض کیا ہے۔ مرا تخیل پہنچ گیا ہے زمین سے ایک جست میں وہاں تک کہ جس جگہ کہکشاں نے دھندلی سی رہ گذر پر بچھا دیے ہیں ہزاروں موتی کہ جیسے شبنم کے لاکھوں قطرے چمک رہے ہوں ہزاروں پھولوں کی پتیوں پر سحر سے پہلے:

’’حالی: یہ مصرعہ ہے یا شیطان کی آنت:

طویل لکھنوی: مولانا یہی تو اس صنف کی خوبی ہے دیکھیے نا اس میں انڈیا ربڑ کی سی لچک ہے مصرعہ جتنا لمبا کرنا چاہو کھینچ کر بنا لو اور اگر آپ کو مصرعہ کی طوالت پر واقعی اعتراض ہے تو دوسرا مصرعہ چھوٹا کر دیتا ہوں۔

حالی: مگر آپ پہلے مصرعے کو بھی دو تین چھوٹے مصرعوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

طویل لکھنوی: دیکھیے نا مولانا۔ یہ مصرع بالکل اسی طرح میرے ذہن میں آیا ہے ادر اسے چھوٹے چھوٹے مصرعوں میں تقسیم کر کے میں خیالات کو توڑنا نہیں چاہتا۔

حالی: مگر یہ مصرعہ پڑھتے پڑھتے تو قاری کا سانس پھول جاتا ہے۔

طویل لکھنوی: دم بے شک پھول جاتا ہے مگر ساتھ ہی پھیپھڑوں کی ورزش بھی تو ہو جاتی ہے۔

حالی: تو یہ شاعری کی شاعری ہے اور ورزش کی ورزش

کنھیا لال کپور کے ان ڈرامائی اور ظریفانہ تحریروں میں جہاں ایک طرف مزاح کی پر مسرت پھوار دکھائی دیتی ہے وہاں دوسری طرف اردو ادب کے تعلق سے حساس اور طنزیہ تنقید کے نمونے بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ وہ ادب میں ترقی پسندی کے خواہاں ضرور تھے۔ مگر بے جا مغرب پرستی، اور صحت مند روایت سے انحراف کے قائل نہیں۔ ان کا ماننا تھا کہ ادب کو معیاری وقار عطا کرنے کے لیے شعرا وادبا کو کسی حکومت یا سیاسی نظریے کا غلام نہیں ہونا چاہیے۔ انھوں نے اپنے مضمون ’اچھا ادب‘ میں اس بات کا برملا اظہار کیا ہے۔

’’کتنا بیوقوف ہے ششی موہن، بیوقوف اور سادہ لوح اتنا بھی نہیں جانتا کہ اچھا ادب کبھی قانون کے زور پر پیدا نہیں کیا جاسکتا۔‘‘

ان اقتباسات کی روشنی میں یہ بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ کنھیا لال کپور ادب میں کسی وقتی نظریے کے پیروکار نہیں بلکہ وہ ہندوستان کے سماجی واخلاقی اقدار کے پاسدار اور حیات انسانی کو مزین وخوش گوار بنانے والے تخلیقی ادب کے فنکار اور نقیب تھے۔ ان کے اس طرح کے خیالات متعدد مضامین میں بکھرے پڑے ہیں، جن میں سے کچھ مشہور مضامین، چینی شاعری، افسانے کا پلاٹ، اچھا ادب، اردو افسانہ نویسی کے چند نمونے، غالب جدید شعرا کی ایک مجلس میں، نام، وغیرہ بہت اہم ہیں۔ کنھیا لال کپور اردو ادب کے تقدس کے ساتھ ہی ساتھ اردو زبان کی پاکیزگی ادر محبت میں بھی گرفتار نظر آتے ہیں۔ انھوں نے اردو زبان کو ہمیشہ ایک الہامی زبان مانا ان کا کہنا تھا کہ، دنیا کی ہر الہامی زبان کے حسین وجمیل اور پر مسرت انداز اردو زبان میں موجود ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے تقسیم ہند کے بعد اردو زبان پر ہونے والی تنگ نظر فرقہ وارانہ ذہنیت کی یلغار کا کھل کر مقابلہ کیا اور اردو زبان کی اہمیت وافادیت کا نقارہ بھی بجایا۔ ان کا مشہور زمانہ مضمون ’برج بانو‘ اس کا بین ثبوت ہے۔ برج بانو مضمون میں کنھیا لال کپور نے مکالماتی انداز میں خود برج بانو یعنی اردو زبان کی زبانی اس کی تاریخی اور سماجی معنویت کو بیان کیا ہے:

’’پاکستان میری فتوحات میں سے ہے۔ میرا اصلی اور قدیمی وطن ہندوستان ہے۔ میں دلّی کے قریب ایک گاؤں میں پیدا ہوئی، بچپنا جھونپڑی میں اور شباب لال قلعہ میں بسر ہوا، مجھے ہندوستان کے شہنشاہ نے منھ لگایا دیوان عام میں مجھے سب سے اونچی مسند پر بٹھایا گیا اور جس وقت میرا استارہ عروج پر تھا کوئی بنگالی، گجراتی، سندھی حسینہ میرے حسن میری بھڑک اور طنطنے کی تاب نہ لاسکی میں ہندوستانی ہوں اور ہندوستان میں رہوں گی۔‘‘

ان رواں ودواں جملوں میں کنھیا لال کپور نے اردو زبان کی تاریخ، اس کی خوب صورت بناوٹ اور اس کے حسن وجمال کی تعریف وتوصیف کے ساتھ ہندوستان کے تہذیبی بناؤ سنگار میں اس کی اہمیت کی ترجمانی بھی کی ہے۔ ان کا ماننا تھا کہ اردو زبان کے خلاف چاہے کتنی بھی صف بندی ہو جائے، اردو زبان اپنی شیرینی اور دلکشی کے دم پر ہمیشہ قائم رہے گی۔ کیونکہ یہ زبان صرف امرا، رؤسا ہی نہیں بلکہ غریب مزدور، ٹرک ڈرائیور، قلفی والے، چنا بیچنے والے ہر خاص وعام بولتے ہیں۔ برج بانو، کا یہ آخری پیرا اسی طرف اشارہ کرتا ہے:

’’وہ بپھری ہوئی شیرنی کی طرح کڑک کر کہتی ہے۔ نہیں میں نہیں جاؤں گی ہرگز نہیں جاؤں گی۔ ’’لیکن حکومت نے فیصلہ کرلیا ہے کہ تم...... ’’حکومت قانون بنا سکتی ہے لیکن عوام کے فطری رجحانات اور چنا زور گرم بیچنے والے موجود ہیں۔ حکومت میرا بال بھی بیکا نہیں کرسکتی۔ خدا کی قسم بہت ضدی ہو تم، برج بانو مسکرا رہی ہے اور میں قلفی والے کے الفاظ زیر لب دہرا رہا ہوں، لاجواب، شان دار، بے نظیر۔‘‘

اس طرح کے مضامین کنھیا لال کپور جیسا اردو کا سچا عاشق ہی لکھ سکتا ہے۔ اردو زبان سے متعلق ان کے بہت سے ہنگامہ خیز مضامین ہیں۔ جس میں انھوں نے اردو زبان کے مخالفین اور اردو زبان کے اجارہ داروں کو اپنے طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ جن میں ’گبار کھاتر‘ جیسی پیروڈی، اہل زبان، ’نے چراغے نے گلے‘ اور برج بانو جیسے مضامین بہت ہی اہم ہیں۔ جنھیں پڑھ کر ہم ان کی اردو دوستی اور ان کے ادبی شعور کو بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔

اس مختصر سے مضمون میں ان سب کا احاطہ کرنا ممکن نہیں۔ مجموعی طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ کنھیا لال کپور کی تخلیقات میں طنز ومزاح کی آمیزش کے ساتھ سیاسی وسماجی بیداری، ہندوستانی تہذیب وثقافت کی بقا ادر اردو زبان و ادب کو خوش رنگ وتوانا بنانے کا پیغام مضمر ہے۔ آج کنھیا لال کپور کے زبان وقلم کو خاموش ہوئے تقریباً 32 برس گزر گئے، مگر اردو زبان وادب کے گلشن رنگا رنگ میں ظریفانہ پھولوں کی قہقہہ آمیز طنزیہ خوشبو اب بھی ان کے وجود اور اہمیت کا پتہ دیتی ہے۔

■

Hafiz Syed Abdul Kareem Rizwan
C/o Dawakhana Hakim Syed Ziaurraham
Akbar Nagar, Dharam Shala Road, Bansi
Siddharthnagar-272153 U.P.

عبدالسلام صدیقی

امتیاز علی تاج

کا ڈرامہ

'انارکلی'

ڈرامہ 'انارکلی' اردو ادب کا وہ کوہ نور ہیرا ہے جو کہ تاج ادب میں ہمیشہ درخشاں رہے گا۔ تاج محض اس ایک ڈرامہ سے ہی اردو ادب میں حیات جاوید کے حامل ہوگئے ہیں۔ کردار، واقعات، منظر نگاری، پلاٹ غرض ڈرامہ کا کوئی بھی پہلو ایسا نہیں ہے جو کہ تنقید کی کسوٹی پر داد تحسین نہ حاصل کرلے۔ کسی بھی ڈرامہ کا پلاٹ اس کی روح ہے۔ پلاٹ دراصل واقعات کے گھماؤ پھراؤ کا نام ہے۔ واقعات میں جتنی ہم آہنگی ہوگی پلاٹ اتنا ہی کامیاب اور بے مثل ہوگا۔

انارکلی کے پلاٹ کو نہایت عمدگی اور خوش اسلوبی سے ترتیب دیا گیا ہے۔ واقعات میں ربط وتسلسل ہے۔ ڈرامے کی کہانی شہنشاہ اکبر کے اکلوتے بیٹے سلیم کی کہانی ہے۔ یہ کہانی ہر دور میں ایک درس رہی ہے جہاں فرض ،وقار اور محبت کی کشمکش میں شمع اور پروانے کو جلنا پڑا۔ اس واقعہ نے مغلیہ سلطنت کو ہلا کر رکھ دیا۔ شہنشاہ اکبر جو ہمیشہ فتحیاب رہا لیکن دو محبت کرنے والوں کی محبت میں حائل ہوکر کامیاب ہوکر بھی ناکام رہا۔ نادرہ ایک کنیز تھی جس کو اکبر نے انارکلی کا معزز خطاب عطا کرکے اسے معراج کمال پر پہنچا دیا۔ لیکن یہ کلی کھل نہ سکی کیونکہ اکبر نے اسے کھلنے سے پہلے ہی توڑ کر مسل ڈالا۔

'انارکلی' ڈرامہ تین ابواب میں منقسم ہے ہر باب کے کئی منظر ہیں۔ باب اول کے پہلے منظر میں نادرہ (انارکلی) اور سلیم کے عشق اور معاشقہ کے جذبات وکیفیات کا بیان ہے۔ دلآرام اور نادرہ شہنشاہ اکبر کی مشہور کنیز ہیں۔ دلآرام کا رنگ شہنشاہ اکبر اور خود اس کے بیٹے سلیم (شیخو) پر چڑھا ہوا ہے۔ مگر اتفاقاً دلآرام اپنی بہن کی علالت کی خبر سن کر اس کی عیادت کو جاتی ہے۔ اس کی عدم موجودگی میں دوسری کنیز نادرہ کو اس کی ماں سجا کر لاتی ہے۔ وہ بہت خوب صورت ہے۔ خوب صورتی پر بناؤ سنگار اور پھر قیامت خیز رقص یہ سب چیزیں سب کو مرعوب کرتی ہیں۔ شہنشاہ اکبر خود متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا اور خوش ہوکر موتیوں کا ہار اور انارکلی کا خطاب بخشتا ہے۔

پورے محل سرائے میں انارکلی کے حسن اور خوبصورتی کے چرچے ہیں۔ شہزادہ سلیم اس کے بیساختہ وپرکشش حسن سے مرعوب ہوکر اس کے عشق میں گرفتار ہوجاتا ہے۔ انارکلی پر بھی فطری طور پر اس محبت کا اثر ہے۔ محبت کے اس پودے کی آبیاری میں اس کی بہن ثریا ایک بادبہار کی حیثیت رکھتی ہے۔

دوسرے منظر میں شہزادہ سلیم انارکلی کی محبت میں کھویا کھویا اور غمگین سا رہتا ہے۔ ہر ایک اس کی بے توجہی کا شاکی ہے۔ تعلیم، سیر وتفریح کسی بات کا سلیم کو ہوش نہیں ہے۔ ماں کے بلانے پر وہ بار بار عذر پیش کرتا ہے۔ شہنشاہ سے اس کی ملاقات نہیں ہوتی، آخر خود اکبر بیٹے سے ملنے جاتا ہے۔ اس کی اس بے خودی پر اکبر انگلی اٹھاتا ہے اور اعتراض کرتا ہے۔ دلآرام شہزادہ سلیم کے جذبات وکیفیات کو سمجھ جاتی ہے۔ بختیار جو سلیم کا دوست ہے وہ سلیم کو اس حالت سے باز رہنے کے لیے کہتا ہے۔

تیسرے منظر میں دلآرام سلیم اور انارکلی کی ملاقات کو بے نقاب کرتی ہے اور انتقام کی آگ کو ٹھنڈا کرنا چاہتی ہے۔ انارکلی اسی طرح کھوئی کھوئی سی رہتی ہے۔ ثریا اکثر وبیشتر اپنی بہن کو محفوظ رکھنے کی کوشش کرتی ہے۔ چوتھے منظر میں انارکلی اور سلیم کی ملاقات پائیں باغ میں ہوتی ہے۔ انارکلی کھوئی کھوئی اداس، غمگین باغ میں بیٹھی ہے۔ وہ گم صم رہتی ہے۔ خود ہی دھیرے دھیرے چپکے سے بڑبڑاتی ہے۔ سلیم چوری چوری اس کی یہ کیفیت دیکھتا ہے۔ انارکلی سلیم کو دیکھ کر چونک پڑتی ہے اور اس کی عجیب وغریب کیفیت ہوجاتی ہے۔ وہ مدہوشی کی حالت میں ہے۔ سلیم شہنشاہ اکبر کا اکلوتا بیٹا اس وقت سب کچھ بھول جاتا ہے۔ اس کی تمام آسائش اور راحت انارکلی کی اپنی ہنسی میں سمٹ آتی ہے۔ دل آرام اس ملاقات کو اپنی انتقامی نظروں سے دیکھتی ہے ادر طنزیہ انداز میں سلیم کو مبارک باد پیش کرتی ہے۔

باب دوم کے منظر اول میں سلیم انارکلی سے اپنی ملاقات کے بارے میں بختیار کو بتاتا ہے۔ دلآرام نے دونوں کا وصل دیکھ لیا ہے۔ سلیم اس کو خاموش کرنے کے لیے بختیار سے مشورہ لیتا ہے۔ زعفران، ستارہ اور بختیار کی شوخیاں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ دلآرام آتی ہے۔ سلیم کو خیال ہے کہ اس کو روپے کی طمع ہے اور وہ اس کو روپیہ دے کر اس کا منہ بند کردے گا۔ لیکن یہاں دلآرام اپنی بے پناہ محبت کا اظہار کرتی ہے۔ وہ زبان خاموش کرنے کے لیے محبت جیسی بیش قیمت چیز کی خواستگار ہے۔ وہ سلیم سے بیباکانہ، نڈر ہوکر اظہار الفت کرتی ہے اور سلیم اس کی جرأت پر چونکتا ہے۔ وہ اظہار محبت پر دلآرام کو پھانسنے کی ناکام کوشش کرتا ہے۔ بقول بختیار: ''سلیم اناڑی شاطر ہے اور حریف دوسری چال سوچ لے گا۔''

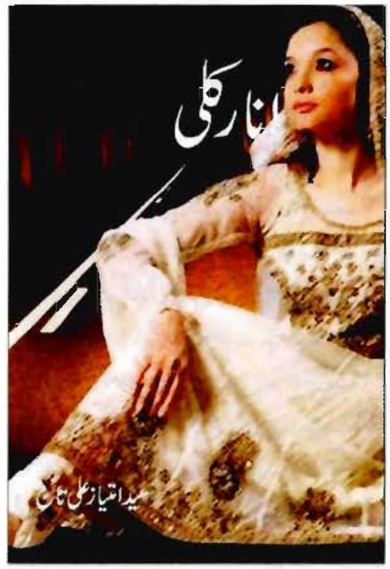

دوسرے منظر میں انارکلی پر دلآرام کا خوف طاری ہے۔ کیونکہ اس نے اس کو محبت کرتے دیکھ لیا ہے۔ انارکلی پر دیوانگی طاری ہے، ماں اس کیفیت پر چونکتی ہے، گھبراتی ہے۔ اس کو دلاسہ دیتی ہے اور ثریا (انارکلی کی بہن) بھی اسے سمجھاتی ہے۔ وہ بتاتی ہے کہ صاحب عالم نے دلآرام کی شہ رگ پکڑ لی ہے اور وہ ان کی محبت کے راز کو کسی سے نہیں کہے گی۔ دلآرام انارکلی سے اپنی غلطی کی معافی مانگتی ہے اور انارکلی کو دلاسہ دیتی ہے۔ وہ اس کو اطمینان دلانا چاہتی ہے کہ اس کا راز راز رہے گا۔ لیکن عقلمند ثریا اس کی چالوں اور گھاتوں سے اچھی طرح واقف ہے۔

تیسرے منظر میں اکبر کے خیالات کا جائزہ ملتا ہے اکبر اپنے جانشین یعنی سلیم عرف شیخو کے مستقبل کی طرف سے متفکر نظر آتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ جس طرح کم سنی میں اس نے حکومت کا بار سنبھال لیا تھا۔ سلیم بھی اس کا احساس کرے۔ وہ اپنی موت کے بعد شیخو میں زندہ رہنے کا مشتاق ہے۔ حرم کے جشن کے لیے دلآرام کو منتخب کیا جاتا ہے اور دلآرام سلیم اور انارکلی کے راز کو فاش کرنے کا منصوبہ سوچتی ہے۔

منظر چہارم میں جشن نوروز کی تیاری میں شیش محل کو نئی دلہن کی طرح سجایا گیا ہے۔ چاروں طرف چہل پہل ہے۔ کنیزیں اور خواجہ سرا ادھر ادھر بھاگے پھر رہے ہیں۔ اکبر، سلیم کے ساتھ شطرنج کھیلتا ہے۔ سلیم بازی ہار جاتا ہے۔ ادھر دلآرام شطرنج کی بساط اپنے ذہن میں بچھائے ہوئے ہے۔ وہ آئینے اس طرح لگاتی ہے کہ اکبر کو سلیم کی ساری حرکات وسکنات نظر آئے۔ انارکلی کو دوران رقص شراب پلائی جاتی ہے۔ نشے کی شدت محبوب کے سامنے اور بڑھ جاتی ہے۔ اکبر جیسا شہنشاہ اس کو برداشت نہیں کر سکتا اور انارکلی کو زنداں میں ڈالنے کا حکم دے دیتا ہے۔

ڈرامے کا تیسرا باب اس کا لب لباب یا خلاصہ ہے سارا ڈرامہ اس میں کھنچ کر آ گیا ہے۔ انارکلی قید ہو جاتی ہے۔ سلیم اس سے ملنے کے لیے بے چین ہے۔ اس کو زنداں سے نکالنے کے لیے بختیار اور داروغۂ زنداں کی مدد سے وہ کامیاب بھی ہو جاتا ہے لیکن دلآرام کے انتقام کی آگ اس جگہ شکست فاش دیتی ہے۔ اکبر ایک شہنشاہ بھی ہے اور مغلیہ سلطنت کا ایک عظیم شہنشاہ اور سلیم اس کا جانشین۔ وہ کس طرح ایک کنیز کو ملکۂ ہند بنا سکتا ہے باپ اور بیٹے کی کشمکش کا مقابلہ دلآرام کی عیاریاں، سلیم اور انارکلی کی بے بس محبت کی شدت سب اس میں سمٹ کر آجاتی ہیں اور پھر اکبراعظم انارکلی کو دیوار میں چنوانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ امتیاز علی تاج نے واقعات کی کڑی سے کڑی نہایت عمدگی اور خوش اسلوبی سے ملائی ہے۔ مقام و واقعات ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہیں۔ منظر نگاری بھی خوب ہے۔ مختصر یہ ہے کہ انارکلی کے پلاٹ میں وہ تمام ہی خوبیاں موجود ہیں۔ جو ایک مکمل اور کامیاب ڈرامہ میں ہونا چاہیے۔

'انارکلی' میں جو پلاٹ پیش کیا گیا ہے۔ وہ اتنا دلکش اور دلچسپ ہے کہ شروع سے آخر تک پڑھنے والے کی دلچسپی قائم رہتی ہے۔ اس ڈرامے میں اکبر کے محل کا منظر پیش کیا گیا ہے۔ انارکلی شہزادہ سلیم کی محبت میں گرفتار ہے دلآرام محل کی کنیز اس کی رقیب کی شکل میں سامنے آتی ہے۔ جو پہلے سلیم کو اپنا بنا کر ملکہ بننے کا خواب دیکھتی ہے۔ لیکن جب انارکلی کی وجہ سے اس کا خواب پورا ہوتا ہوا دکھائی نہیں دیتا تو وہ جوش رقابت میں انارکلی کے خلاف سازش کرکے اسے راہ سے ہٹانے کی کوشش کرتی ہے۔ وہ اکبر کو انارکلی اور سلیم کی محبت سے آگاہ کرکے اسے ان کے خلاف اکساتی ہے۔ 'نوروز' جشن کے موقعے پر دلآرام نے ایک آئینہ اس طرح نصب کیا کہ اکبر سلیم وانارکلی کی تمام حرکتیں خود اپنی آنکھوں سے دیکھ سکے۔ چنانچہ انارکلی جب عشقیہ غزلیں گاتے ہوئے سلیم کی طرف اشارہ کرتی ہے اور سلیم حسن کی اداؤں کا مسکراہٹ سے جواب دیتا ہے تو اکبر یہ منظر آئینے میں دیکھ کر آپے سے باہر ہو جاتا ہے اور جشن طرب موقوف کرکے انارکلی کی گرفتاری کا حکم دیتا ہے۔ چنانچہ اسے گرفتار کرکے اکبر کے حکم سے دیوار میں چنوا دیا جاتا ہے۔ اس طرح یہ المیہ ڈرامہ اپنے اختتام کو پہنچ جاتا ہے۔

تاج نے پلاٹ کی تشکیل میں اپنی فنکارانہ بصیرت

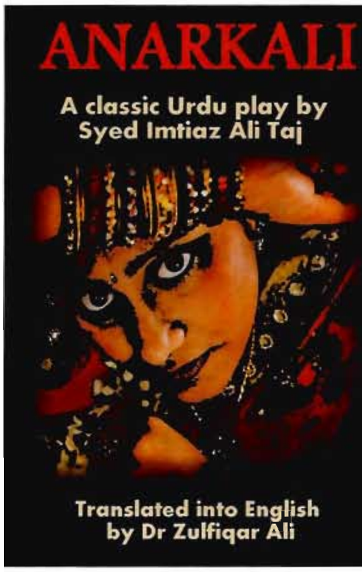

کا ثبوت دیا ہے۔ اس میں شروع سے آخر تک وحدتِ عمل موجود ہے تمام واقعات مرکزی کہانی سے جڑے ہوئے ہیں۔ وحدت زماں نہ ہونے کے باوجود وحدت تاثر میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔

کردار نگاری اس ڈرامے کی روح ہے امتیاز علی تاج نے جتنی عمدگی کے ساتھ نفسیاتی طور پر ہر کردار کو پیش کیا ہے وہ اپنی جگہ جامع اور مکمل ہیں۔ ان کو نفسیات کا نباض کہنا بیجا نہ ہوگا۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ تاج نے وہ ماحول اور لوگوں کو دیکھا ہے۔ اس کا ہر کردار جیتا جاگتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کردار نگاری وخاکہ نگاری میں تاج کو ملکہ حاصل ہے۔ اس ڈرامے کو پڑھتے وقت تمام کردار اس طرح ہمارے تخیل میں آجاتے ہیں گویا ہم پہلے سے ان سے شناسا ہیں۔

ڈرامے کا ہیرو شیخو یعنی سلیم ہے جو کہ ایک کنیز نادرہ کی محبت کا شکار ہے۔ نادرہ کو اکبر بادشاہ نے 'انارکلی' کے خطاب سے نوازا ہے سلیم اس سے محبت کرتا ہے۔ جب سے سلیم کو انارکلی سے محبت ہوئی ہے۔ محبت کے تمام آثار نمایاں ہیں۔ اداسی، غمگینی، کھویا رہنا، تبسم گویا ہمیشہ کے لیے دور ہو گیا ہے۔ وہ مکمل غم جاناں کی تصویر بن گیا ہے۔ وہ ایک سنجیدہ اور خوبرو نوجوان ہے۔ ساتھ ہی نہایت نڈر اور بےخوف، شروع تا آخر وہ ڈرامے پر چھایا ہوا ہے۔

دوسرا اہم کردار 'انارکلی' ہے جو کہ ایک کنیز ہے اور ڈرامے کی ہیروئن بھی ہے۔ وہ انار کی کلی کے مانند خوبصورت اور دلکش ہے۔ یہ ڈرامے کا مرکزی کردار ہے اور اس کا مرکز بھی جس کے ارد گرد تمام واقعات وکردار گھومتے ہیں۔ وہ اپنی سادگی، خلوص، جذبۂ ایثار اور بےمثال محبت سے سب کا دل موہ لیتی ہے۔ سلیم اس کا گرویدہ اور

اکبراعظم اس کی اہمیت کا قائل ہوجاتا ہے۔ اپنے حسن کے سبب اس نے انارکلی کا خطاب شہنشاہ اکبر سے حاصل کیا اور شہزادہ سلیم کا دل جیتا۔ اس کا حسن تصنع وبناوٹ سے الگ ہے اس میں بے ساختگی، معصومیت، شرافت اور دلکشی ہے۔ اس کے علاوہ وہ بہترین رقاصہ بھی ہے۔ سلیم سے سچی محبت کرتی ہے۔ وہ شرم وحجاب کا پتلا ہے جس کا پاس اس کو محبت میں بھی ہے، وہ رسوائی سے ڈرتی ہے، کانپتی ہے لیکن اس کے باوجود سلیم سے بے پناہ محبت کرتی ہے۔ وہ عام کنیزوں کی طرح نہیں ہے۔

انارکلی کی مقبولیت کی وجہ سے محل میں اس کے دشمن بھی پیدا ہوجاتے ہیں۔ دلآرام اس کی سب سے بڑی رقیب اور حریف کی شکل میں سامنے آتی ہے۔ اس کے کردار میں دھیرے دھیرے ارتقا ہوتا ہے۔ ناتجربہ کاری کے باوجود اپنی ذمے داریوں سے آگاہ نظر آتی ہے۔ اسے محبت کو نبھانے کا سلیقہ، شعار اور شعلوں سے ہنستے ہوئے گزرنے کا ہنر معلوم ہے۔ وہ جذباتی سطحیت اور ہوس کا شکار کبھی نہیں ہوتی، صرف اس وقت جذبات کے رو میں بہتی ہوئی نظر آتی ہے جب وہ تہہ خانے میں موت کی منتظر ہوتی ہے اور سلیم اس سے ملنے کے لیے جاتا ہے اس وقت وہ سب کچھ کہہ ڈالتی ہے جو ابھی تک اپنے دل میں چھپائے ہوئے تھی۔

انارکلی کی محبت میں خلوص اور گہرائی ہے۔ وہ اپنے عشق میں تنہا جلنا چاہتی ہے۔ یہ محبت اس کی شخصیت میں ایسا نکھار پیدا کردیتی ہے کہ سلیم جیسا ہوس پرست شہزادہ بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا اور سچی محبت کرنے پر آمادہ ہوجاتا ہے۔ انارکلی کی شخصیت میں ہمیں شروع ہی سے یاسیت، پسپائیت اور احساس شکست نظر آتی ہے۔ وہ ہر موقع پر غم کا ایک تاثر چھوڑ جاتی ہے۔

امتیاز علی تاج نے اس کردار کی پیکر تراشی میں بڑی فنکارانہ چابکدستی سے کام لیا ہے۔ لیکن اکبراعظم کے مقابلے میں اس کی شخصیت بڑی دبی دبی نظر آتی ہے۔ اکبر سے مقابلے کے لیے جس اولوالعزمی اور جرأت کی ضرورت ہے وہ اس میں کہیں نظر نہیں آتی۔

سلیم کی کم اندیشی پر افسوس کرتے ہوئے کہتاہے :
''کیا ہندوستان ایک عورت سے بھی سستاہے ''۔
اس طرح اکبر ایک عورت کی محبت پر اپنے لڑکے اور خود ہندوستان کے مستقبل کو قربان کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ ہوسکتا ہے اکبر سے انارکلی کی محبت کو سمجھنے میں غلطی ہوئی ہو۔ لیکن اس کے فرائض کا احساس اس کے جرم کو ہلکا کر دیتا ہے۔

ڈاکٹر محمود الٰہی درباری قید وبند میں پھڑپھڑاتی ہوئی اس زخمی چڑیا (انارکلی) کے کردار کو ایک لافانی کردار قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''امانت سے آغا حشر تک اردو ڈرامہ ایک بھی ایسا کردار نہ پیدا کرسکا جس میں زندہ رہنے والی قدریں ہوتیں۔ البتہ تاج نے ایسے کردار کی تخلیق کی جس پر کبھی زوال نہ آئے گا۔ 'انارکلی' سے بڑھ کر آج تک اردو ڈرامے کو کوئی کردار نہ ملا۔''

تخریبی کردار ادا کرنے والی کنیز دلآرام بھی اہم کردار ہے جو اس ڈرامے کے مرکزی کرداروں میں سے ہے۔ اس کا کردار بھی امتیازی حیثیت کا حامل ہے۔ دلآرام خود دار اور پروقار سلیم سے بے پناہ محبت کرنے والی کنیز ہے اس کے اندر عورت کی فطرت دیکھنے کو ملتی ہے جسے تاج نے نہایت کامیابی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ سلیم اور انارکلی کی محبت کو وہ کیسے برداشت کرسکتی ہے جبکہ سلیم اس کا محبوب ہے۔ انارکلی کی رقیب دلآرام انتقام کی آگ میں سلگنے لگتی ہے اور پھر وہ اپنی فطرت سے اپنے رقیب کو ناکام بنانے کی کامیاب کوشش کرتی ہے۔ وہ نہایت عقلمند اور چالاک ہے۔ عیاری کا عنصر بھی اس میں موجود ہے۔ ساتھ ہی وہ ایک باہمت اور خوددار عورت ہے۔ اپنے اندر وقار اور خودداری کا اس کو ہر جگہ پاس رہتا ہے۔

دلآرام کی وجہ سے ڈرامے کے پیکار وتصادم میں جان نظر آتی ہے اور اس سے ڈرامے میں پیچیدگی والمنا کی پیدا ہوتی ہے۔ وہ انارکلی کی رقیب اور سلیم کی عاشق کی شکل میں سامنے آتی ہے۔ سلیم اور انارکلی کی محبت کے راز سے آگاہ ہونے پر اس کے دل میں فطری طور پر جذبۂ انتقام ابھرتا ہے۔ جب اس کی محبت زخمی اور اس کی نسوانیت مجروح ہوتی ہے۔ تو وہ انتقام کے لیے اس حد تک آگے بڑھ جاتی ہے کہ خود اس آگ میں جل مرتی ہے۔

دلآرام کا کردار پوری کہانی پر چھایا ہوا ہے انارکلی کی محبت میں گرمی اور شوخی اسی کردار ہی کی وجہ سے پیدا ہوئی۔ اسی نے اکبراعظم کو انارکلی کو دیوار میں چنوانے کے سنگین اقدام پر آمادہ کیا۔ اس کے اندر خود اعتمادی اور ذہانت ہے وہ سلیم اور اکبر کی نفسیات سے واقف ہے۔ وہ ایک ماہر فنکار کی طرح اپنی سازش کا جال بنتی اور جشن نوروز میں انارکلی وسلیم کی حرکتوں کو بادشاہ پر ظاہر کرنے کے لیے دربار میں آئینہ نصب کرکے اپنی ذہانت کا ثبوت دیتی ہے۔ اس طرح اس ڈرامے کو نقطۂ عروج تک پہنچانے میں اس کا بڑا ہاتھ ہے۔

شہنشاہ اکبر کا کردار بھی ڈرامے میں کافی اہم ہے۔ یہ جیتا جاگتا کردار ہے۔ اس ڈرامے میں اکبر کی باوقار شخصیت اس کے جاہ جلال اور عالی ہمتی کو نہایت عمدگی سے پیش کیا گیا ہے۔ فرض ومحبت کی کشمکش میں اس کے کردار کو اتنی اچھی طرح پیش کرنا تاج ہی کا ملکہ ہے۔ اکبر صرف شہنشاہ ہی نہیں، وہ باپ بھی ہے۔ اس کی پدرانہ محبت، جذبات اور حکومت مغلیہ خاندان کا وقار وغیرہ سب اس میں پنہاں ہیں۔ مختصر یہ کہ اکبر کا کردار بھی خوش سلیقگی سے پیش کیا گیا ہے۔ اکبر جو مغلیہ سلطنت کے امین اور ایک دوراندیش باپ کی شکل میں سامنے آتا ہے۔ امتیاز

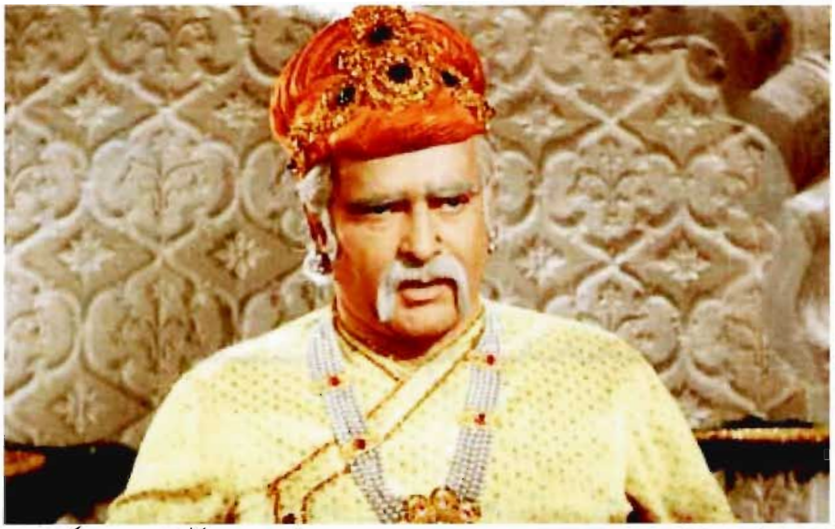

علی تاج نے اس کے کردار میں توازن برقرار رکھنے کے لیے کمال ہوشیاری سے کام لیا ہے۔ بظاہر وہ ایک ظالم، سنگین اور محبت کا دشمن نظر آتا ہے۔ اس کی سنگدلی کی انتہا یہ ہے کہ وہ اپنے بیٹے کی محبت یعنی انارکلی کو زندہ دیوار میں چنوا دیتا ہے لیکن ڈرامہ نگار نے اکبر کے جرم کو ہلکا کرنے کے لیے اس کی دور اندیشی، ہندوستان کی فلاح و بہبود اور اپنے لڑکے کے مستقبل کو سنوارنے کی فکر کے پہلو کو ابھارا ہے۔ وہ ایک دوراندیش باپ کی طرح سلیم کو انارکلی سے دور رکھنے کی کوشش کرتا ہے کیونکہ وہ عورت کو سلطنت کے لیے تباہی و بربادی کا پیش خیمہ سمجھتا ہے۔

سلیم کی کم اندیشی پر افسوس کرتے ہوئے کہتا ہے:

''کیا ہندوستان ایک عورت سے بھی سستا ہے''۔

اس طرح اکبر ایک عورت کی محبت پر اپنے لڑکے اور خود ہندوستان کے مستقبل کو قربان کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ ہوسکتا ہے اکبر سے انارکلی کی محبت کو سمجھنے میں غلطی ہوئی ہو۔ لیکن اس کے فرائض کا احساس اس کے جرم کو ہلکا کردیتا ہے۔

آخر میں اکبر کی شخصیت بالکل بدل جاتی ہے۔ جابر بادشاہ کی شخصیت پر باپ کی شفقت ومحبت کا جذبہ غالب آجاتا ہے اور محسوس ہوتا ہے کہ اس کی سنگدل شخصیت کے پہلو میں بھی ایک نرم ونازک دل ہے۔ وہ انارکلی کی موت کے بعد نادم ہوکر روتا ہے اور اپنی مذمت کرتا ہے۔ اس کی شخصیت کی ساری سختی اس کے ان الفاظ میں پگھل کر بہتی ہوئی نظر آتی ہے کہ ''خداوندا! کیا معلوم تھا کہ یوں ہوگا۔ شیخو! میرے مجنون بچے اپنے باپ سے چمٹ جا۔ اگر ظالم باپ سے دنیا میں ایک بھی راحت پہنچی ہے، تیرے سر پر ایک بھی احسان باقی ہے تو میرے بچے اس وقت میرے سینے سے چمٹ جا، میں شعلوں میں بھن رہا ہوں۔ تو بھی آنسو بہا، میں بھی آنسو بہاؤں۔''

ان کرداروں کے علاوہ بہت سے ضمنی کردار ہیں۔ ان میں ثریا کا کردار کافی متاثر کرتا ہے۔ ثریا انارکلی کی بہن ہے۔ کم عمر ہونے کے باوجود دلآرام، سلیم اور اکبر تک سے ٹکرا جانے کا حوصلہ رکھتی ہے۔ ثریا نہایت شوخ وچنچل، لیکن عقلمند وچالاک ہے۔ مہارانی جودھا بائی ایک ماں ہے۔ اکلوتے بیٹے کی ماں۔ ان کے علاوہ زعفران، ستارہ، مروارید جیسی شوخ وچنچل کنیزیں بھی سامنے آتی ہیں۔ 'انارکلی' کی ماں کا کردار بھی نفسیاتی ہے۔ مختصر یہ کہ امتیاز علی تاج نے ان تمام کرداروں کی تخلیق میں فنکارانہ چابکدستی اور بصیرت کا ثبوت دیا ہے۔ 'انارکلی' کی کردار نگاری بے مثل ہے۔ خوش سلیقگی وعمدگی کے ساتھ کرداروں کو پیش کیا گیا ہے۔

'انارکلی' ڈرامے میں مکالمہ نگاری بھی قابل قدر حد تک دلکش اور متوازن ہے۔ ہر کردار کی زبان سے ادا ہونے والے مکالمے کردار کی شخصیت کو ہمارے سامنے روشن اور بے نقاب کر دیتے ہیں۔ ان مکالموں میں طنز ومزاح کی بھی ملاوٹ ہے۔ تاج نے ان مکالموں کے ذریعے کرداروں کے جذبات اور ان کی نفسیات کو بڑی کامیابی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اکبر کے مکالموں سے شاہانہ جاہ وجلال، سلیم کے مکالموں سے جذباتیت ورومانیت، دل آرام کے مکالموں سے مکاری وعیاری اور انارکلی کے مکالموں سے اس کی معصومیت اور سادگی کا اظہار ہوتا ہے۔ یہ تمام مکالمے فطری اور تاج کے فن کی عظمت کے مظہر ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اچھے مکالموں سے ہی سیرت نگاری وکردار نگاری میں کمال حاصل کیا جاسکتا ہے۔ انارکلی میں کردار نگاری کی کامیابی کا سبب ہی اس کی زبان ومکالمے ہیں۔ مکالموں کے علاوہ اس ڈرامے کی دلکش زبان بھی متاثر کرتی ہے۔ تاج کی فصاحت وبلاغت اور دلکش دلآویز اسلوب نے اس ڈرامے کو لازوال بنا دیا ہے۔ پلاٹ مکالموں سے ہی آگے بڑھتا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تاج کو مغلیہ زبان پر پوری قدرت حاصل تھی۔ الفاظ اور جملے موقع محل سے تو بولے ہی گئے ہیں ہر کردار اپنی حیثیت سے الفاظ استعمال کرتا ہے۔ کنیزوں کی زبان، ثریا کی تیز وطرار شوخی، شہزادہ وشہنشاہ غرض یہ کہ ہر کردار مکمل اور جامع مکالموں سے مزین ہے۔ انارکلی معصوم ہے، بے گناہ ہے، افشائے راز سے پریشان۔ دلآرام کے بارے میں اس طرح کہتی ہے:

''وہ جانتی ہے سب کچھ جانتی ہے۔ اس کی گفتگو میں کینہ تھا۔ ایک پیاس تھی۔''

عنبر ایک کنیز ہے وہ انارکلی کے بارے میں کہتی ہے:

''ایک تو کمبخت تھی ہی چاند کا ٹکڑا، سونے پہ سہاگہ۔ سنگار قیامت بن گئی۔''

انارکلی کے حسن کے بارے میں شہزادہ سلیم اس طرح کہتا ہے:

''وہ تو فردوس کا ایک خواب ہے۔ شباب کے آنکھوں کی قوس قزح۔''

مجموعی طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ کردار اور موقع محل کے لحاظ سے ہر مکالمہ شاندار ہے۔ مکالمے طویل نہ ہوکر مختصر ہیں۔ زبان اردو ہے مگر فارسیت کا ہلکا رنگ ہے جو کہ مغلیہ تہذیب کی عکاسی کے لیے ضروری ہے۔ یہ ڈرامہ مغلیہ دور کی تہذیب کی عکاسی کرتا ہے۔ ہندو مسلم اتحاد، مغلیہ عہد کی خوش حالی، ایرانی اور ہندستانی تہذیب کا امتزاج ہم کو اس ڈرامے میں ملتا ہے۔ مختصر یہ کہ انارکلی فن کی بے لاگ کسوٹی پر پورا اترتا ہے۔ انارکلی ڈرامے کی خصوصیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے عشرت رحمانی اس طرح لکھتے ہیں:

''انارکلی فنی عروج ودلکش ادبیت کے لحاظ سے بے مثل کارنامہ ہے۔ زبان کی خوبی، مکالموں کی چستی، محاوروں کا برمحل استعمال لاجواب ہے۔ (اردو ڈرامے کا ارتقا، عشرت رحمانی)

اپنی انھیں خوبیوں کی وجہ سے یہ ڈرامہ ہمیشہ اہمیت کا حامل رہے گا۔ اس کے ڈرامائی عناصر کردار نگاری، واقعہ نگاری، اس کا جذباتی اثر اور اس کی خوب صورت وشستہ نثر اسے ادبی تاریخ کے صفحات میں ہمیشہ زندہ وروشن رکھیں گے۔

■

Dr. Abdus Salam Siddiqui, N/139 B, Qadri Masjid Gali, Abul Fazal Enclave, Jamia Ngar, Okhla, New Delhi - 110025

محمد شمیم اختر

اردو میں طنزیہ ومزاحیہ کالم نگاری اور

فکر تونسوی

کالم نگاری جدید صحافت کا ایک اہم حصہ ہے۔ ہندوستان کی اردو صحافت میں بیشتر کالم نگاروں کے کالموں کو وقار واعتبار کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ کالم نگاری کے متعلق مجتبیٰ حسین کی رائے ہے:

''کالم نگاری در اصل اپنے اور عوام کے دکھ کو کبھی خوبصورتی کے ساتھ چھپانے کبھی خوبصورتی کے ساتھ اجاگر کرنے، درد کے چہرے پر خوشگواری کا مکھوٹا چڑھانے اور ناگوار زندگی کو گوارہ بنانے کا نام ہے... کالم نگار جب تک اپنے اور زمانے کے غم کو انگیز نہیں کر لیتا تب تک سچی اور اچھی کالم نگاری نہیں کر سکتا۔ کالم نگاری کے لیے مزاحیہ کالم نگار کا صرف ظریف ہونا ہی کافی نہیں ہوتا بلکہ اس کا باظرف ہونا بھی ضروری ہوتا ہے۔'' (مجتبیٰ حسین، مزاحیہ کالم نگاری، اردو صحافت، مرتبہ: انور علی دہلوی، ص، 222)

کالم کے لیے کوئی عنوان یا موضوع مخصوص نہیں ہے وہ ہر موضوع پر تحریر کیا جا سکتا ہے۔ کالم صرف سیاسی موضوعات پر بھی بنی ہو سکتا ہے۔ بعض کالم صرف مزاحیہ ہوتے ہیں تو بعض سنجیدہ اور کچھ مقصدی انداز کے ہوتے ہیں تو کچھ جذباتی، بعض حقائق پر زیادہ زور دیتے ہیں تو بعض اہم واقعات کے بیان کو اہمیت دیتے ہیں۔ یہ حالات و واقعات کی نوعیت کے اعتبار سے طویل یا مختصر یا قسط وار ہو سکتے ہیں اور زبان کے اعتبار سے سادہ، صاف، شستہ اور ادبی زبان میں لکھے جاتے ہیں۔ غرض یہ کہ جس شعبے میں زیادہ دلچسپی ہو اس پر مستقل کالم لکھا جا سکتا ہے۔

بنیادی طور پر کالم نگاری کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ سنجیدہ کالم نگاری اور طنزیہ ومزاحیہ کالم نگاری۔

سنجیدہ کالم نگار کسی ایک خاص موضوع یا متعدد موضوعات پر اپنی رائے کا اظہار کچھ اس طرح پیش کرتا ہے کہ عبارت میں انفرادی اہمیت کا عنصر غالب ہوتا ہے اسے ہم ذاتی کالم نگاری بھی کہہ سکتے ہیں۔ کالم نگار موضوع سے متعلق تمام تر معلومات کی مدد سے اطمینان بخش دلائل پیش کرتا ہے۔ تفصیلات میں اپنی رائے اور ذاتی خیالات پر زور دیتا ہے۔

اردو صحافت میں طنزیہ ومزاحیہ کالم نگاری کی روایت بہت پرانی ہے یہ تقریباً سوا سو سال کے ہندوستانی معاشرے کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ اکثر نقادوں کی رائے یہ ہے کہ غالباً ہندوستان کی کسی زبان کے کالم نگاروں نے معاشرے کی اتنی گہری اور صاف شفاف تصویر پیش نہیں کی جتنی اردو کالم نگاروں نے۔ ہمارے ان کالم نگاروں نے تمام سیاسی وسماجی برائیوں اور مسائل مثلاً ذات پات، اونچ نیچ، چھوا چھوت، استحصال اور مکر وفریب کو بڑی تیکھی نظر سے دیکھا اور ان پر اکثر وبیشتر ہلکے پھلکے لیکن انتہائی مؤثر انداز میں لکھا۔ اس ضمن میں نذیر احمد اور رتن ناتھ سرشار، خواجہ حسن نظامی، عبدالمجید سالک، چراغ حسن حسرت، مولانا ظفر علی خاں، مولانا محمد علی جوہر، قاضی عبدالغفار، عبدالماجد دریابادی، کرشن چندر، کنہیا لال کپور، سعادت حسن منٹو، حیات اللہ انصاری اور عصمت چغتائی جیسے نامور ادیب شامل ہیں اور یہ سلسلہ ہنوز جاری وساری ہے۔ فکر تونسوی نے لکھا ہے کہ ''اردو کی طنزیہ ومزاحیہ کالم نگاری کی یہ خوش بختی ہے کہ ہمیشہ بڑے اور قدآور ادیبوں نے ہی کالم نگاری کی ہے لیکن طنزیہ ومزاحیہ کالم نگاری کی بدبختی یہ بھی رہی ہے کہ کالم نگاری کو ادب عالیہ میں شمار نہیں کیا جاتا۔''

طنز ومزاح کی چاشنی کے ساتھ پیش کیے جانے والے کالموں کے مداح قارئین کا حلقہ بہت وسیع ہوتا ہے۔ اکثر قاری مزاحیہ کالموں کو پڑھنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ 1877 میں 'اودھ پنچ' کے اجرا کے ساتھ طنزیہ ومزاحیہ کالم نگاری کا آغاز ہوا۔ یہیں سے ملکی اور سیاسی معاملات کے ہمراہ سماجی زندگی کو بھی طنز ومزاح کا نشانہ بنایا گیا۔ تاہم اس سے قبل بھی اردو اخبارات میں تنقیدی رائے زنی اور کہیں کہیں طنز کی جھلکیاں ضرور نظر آتی ہیں۔ مثلاً 1836 میں شائع ہونے والا 'اردو خبار' جسے مولوی محمد باقر نے دہلی سے جاری کیا تھا اس میں چھپنے والے طنز سے انگریزی حکومت کی مخالفت کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

اودھ پنچ نے اردو صحافت میں کئی کارہائے نمایاں انجام دیے اور نئی نئی باتوں سے قاری کو روشناس کرایا۔ مثلاً اس سے پہلے اخبار میں کارٹون چھاپنے کا رواج نہ تھا۔ اودھ پنچ نے سیاسی مسائل پر کارٹون چھاپنے شروع کیے۔ مزاح کے در پردہ انگریزی حکومت کی پالیسی کا خوب مذاق اڑایا۔

یہ بات قابل غور ہے کہ 'اودھ پنچ' سے قبل نکلنے والے اردو اخبارات میں سنی سنائی خبروں کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا تھا کیوں کہ ان کا مقصد تاجرانہ فائدے کے سوا کچھ نہ تھا لیکن 'اودھ پنچ' کے سامنے ایک مقصد تھا اور اپنے مقصد کے حصول کے لیے قومی خدمت اور اصلاح معاشرت کے لیے یہ اپنے مقاصد کی راہ پر گامزن رہا۔ 'اودھ پنچ' ظرافت کے اعتبار سے اپنے رنگ کا پہلا پرچہ تھا۔ مجموعی طور پر دیکھیں تو 'اودھ پنچ' کی اصل اہمیت اس کی اولیت کے باعث ہے۔ اس کے قلمکاروں کی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے واقعات وحالات کے مضحک پہلوؤں کو نمایاں کیا اور اس کو مقبول عام بنانے میں بھی خاطر خواہ حصہ لیا۔ نتیجے کے طور پر اردو صحافت میں ظریفانہ رنگ لیے ہوئے کئی اخبار دیکھتے ہی دیکھتے منظر عام پر نظر آنے لگے جن میں پنجاب پنچ (1878)، بنگال پنچ (1880)، دہلی پنچ (1880) اور راجپوتانہ پنچ (1888) وغیرہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ اس دور کی اخبار نویسی میں معیاری ظرافت کے نمونے خال خال ہی نظر آتے ہیں۔ اردو صحافت میں ظرافت کا یہ رنگ ڈھنگ رفتہ رفتہ انیسویں صدی کے آخر تک ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔ بقول مجتبیٰ حسین:

''ان رسالوں کی سب سے بڑی دین یہ ہے کہ انھوں نے نہ صرف طنز ومزاح کی اہمیت کو منوایا بلکہ بعد کے

طنز نگاروں کو طنز کرنے کے آداب اور مزاح پیدا کرنے کا سلیقہ سکھایا۔ 'اودھ پنچ' کا یہ کارنامہ کچھ کم قابل تحسین نہیں ہے کہ اس کے لکھنے والوں نے زبان کو نہ صرف آسان اور عام فہم بنایا بلکہ اس کی لطافت اور شیرینی میں بھی اضافہ کیا... 'اودھ پنچ' اور اس طرح کے رسالوں کی ظرافت بحیثیت مجموعی اعلا معیار کی بھلے ہی نہ ہو لیکن ان کے لکھنے والوں نے وہ بنیاد رکھی اور وہ ماحول پیدا کیا جو اردو میں مزاحیہ کالم نگاروں کی روایت کو مستحکم بنانے کے لیے ضروری تھا۔''
(مجتبیٰ حسین، مزاحیہ کالم نگاری، اردو صحافت، مرتبہ: انور علی دہلوی، ص 223)

'اودھ پنچ' سے قبل اور بعد اردو کے کئی اور رسالے شائع ہوئے مثلاً اسی دوران ریاض خیرآبادی نے 'ریاض الاخبار' کے ساتھ دو مزاحیہ رسالے 'فتنہ' اور 'عطر فتنہ' کے نام سے نکالنا شروع کیا جس کا مقصد ہی آسودگی تھا اصلاح یا انقلاب نہیں۔ گورکھپور سے ریاض خیرآبادی نے اور کئی اخبار نکالے مثلاً 'تار برقی'، 'صلح کل'، 'گلدستۂ ریاض' یہ سب کے سب مزاحیہ اخبار تھے۔ فتنہ کے سرورق پر 'مبصر'، 'فتنہ' لکھا ہوتا تھا۔ فتنہ کا منظوم حصہ 'عطر فتنہ' کے نام سے موسوم تھا۔ سولہ صفحات پر مشتمل اس اخبار کا سائز پوسٹ کارڈ سے بھی کم تھا۔ سائز کے اعتبار سے یہ کچھ بھی ہو لیکن اپنی شوخی اور لطیف طنز کی بنا پر اس زمانے میں یہ انتہائی قابل قدر اور دلچسپ فتنہ تھا خود ریاض کا ایک شعر ہے:

فتنہ کو پوچھتا ہے کوئی کس ادا کے ساتھ
چھوٹا سا وہ ریاض کا اخبار کیا ہوا

اخبار 'فتنہ' میں نثر کے مختصر شوخ مزاحیہ مضامین شائع ہوتے تھے اور 'عطر فتنہ' اس دور کے مزاحیہ شعرا کے اشعار کے لیے مخصوص تھا۔ 'فتنہ' میں مزاح کی بنیاد اس مزاحیہ چپقلش پر قائم تھی جس کی ابتدا کبھی 'اودھ پنچ' اور کبھی 'طوطی ہند' میرٹھ سے ہوئی تھی لیکن بعد میں 'اودھ پنچ' اور 'فتنہ' میں چھیڑ چھاڑ کا آغاز ہوا اور پھر طوطی ہند کے بیان یزدانی اور ریاض خیر آبادی میں ٹھن گئی اور اس طرح فتنہ واقعی فتنہ بن گیا۔

'ریاض الاخبار' اور 'فتنہ' کا معیار تقریباً ایک جیسا تھا فتنہ کی پالیسی صحافتی آزادی کے ساتھ حکام پر حملے کی تھی چنانچہ اس بنا پر اس پر کئی مقدمات قائم ہوئے اور وہ ایک دشمن کے حملے کے شکار بھی ہوئے۔ اس موقع پر کسی نے یہ شعر کہا:

واہ رے اے ریاض رنگین طبع
زخم کھا کر بھی تو پھولا پھلا

محکمہ ڈاک کی سخت گیریوں کی بنا پر آخر کار 'فتنہ' بند ہوا 'فتنہ' کے بند ہونے سے اردو ادب ایک خاص طرز کے طنز و مزاح سے محروم ہو گیا۔ حالانکہ اس وقت تک لطیف اور پختہ کالم نگاری کی روایت قائم ہو چکی تھی۔ اسی وقت مولانا ظفر علی خاں کا اخبار 'زمیندار' منظر عام پر آیا۔ اس اخبار میں مولانا 'حاجی لق لق' کے عنوان سے مزاحیہ کالم لکھا کرتے تھے۔ جب عبدالمجید سالک نے اس اخبار میں اپنا حکایتی کالم 'افکار و حوادث' کے نام سے لکھنا شروع کیا تو اس کالم کی وجہ سے اخبار کی مقبولیت میں دن بہ دن اضافہ ہوا اور دیگر اردو اخبارات بھی اس کی تقلید میں مزاحیہ کالم نگاری کی طرف مائل ہوئے۔ مولانا عبدالمجید سالک کا 'زمیندار' میں شائع ہونے والا یہ کالم 'افکار و حوادث' آگے جا کر ان کے اخبار 'انقلاب' کی اس وقت زینت بنا جب مولانا اسے 1927 میں منظر عام پر لائے۔ اردو صحافت کو مزاح نگاری کے اس رنگ نے اتنا پروان چڑھایا کہ یہ سلسلہ آج تک رواں دواں ہے۔ زمیندار کے 'افکار و حوادث' اور دیگر اخبارات پر اس کے اثرات کے بارے میں وزیر آغا لکھتے ہیں:

''سنہ 1923 میں یہ کالم مولانا عبدالمجید سالک کے سپرد ہوا اور سالک نے اسے بہت جلد ایک مستقل کالم کی حیثیت دے دی۔ اپنے زمانے میں اس کالم کی مقبولیت کا ہلکا سا اندازہ اس بات سے ممکن ہے کہ 'افکار و حوادث' کی تقلید میں تقریباً ہر اردو اخبار نے ایک مستقل فکاہی کالم کو اپنے متن میں جگہ دے دی۔ ان فکاہی کالموں میں سید حبیب کے 'راز و نیاز' (سیاست)، نبیر اور مسافر کی 'چٹکیاں' (ملاپ) اور 'پرتاپ' کی 'گپ شپ' نے خاصی مقبولیت حاصل کی۔ سنہ 1927 میں جب مولانا عبدالمجید سالک 'زمیندار' سے علاحدہ ہوئے اور 'انقلاب' نکالا تو اپنا مستقل کالم 'افکار و حوادث' بھی اپنے ساتھ ''انقلاب میں لے آئے۔ چنانچہ 'انقلاب' کے دور حیات میں اس کالم نے ملکی اور سیاسی مسائل پر ظریفانہ اظہار خیال کا ایک نہایت اچھا نمونہ پیش کیا۔'' (وزیر آغا، اردو ادب میں طنز و مزاح، ص 368)

اس وقت صحافتی مزاح نگاری کے میدان میں ایک اور اہم نام بھی لوگوں کی زبان پر آ چکا تھا۔ یہ نام مولانا چراغ حسن حسرت کی ذات سے وابستہ ہے۔ اردو صحافت میں حسرت کی شخصیت مشہور و معروف رہی ہے۔ 'نئی دنیا' کلکتہ سے انھوں نے اپنی صحافتی زندگی کا آغاز کیا جس کے فکاہیہ کالم میں 'کولمبس' کے فرضی نام سے لکھتے تھے۔ اس کے بعد وہ پنجاب آ کر 'زمیندار' سے منسلک ہو گئے اور 'سند باد جہازی' کے فرضی نام سے لکھنے کا سلسلہ جاری و ساری رکھا۔ جس طرح 'افکار و حوادث' نے متعدد اخبارات میں فکاہت کے گل بوٹے سجائے اسی طرح 'سند باد جہازی' نے جہان صحافت کے کئی جزیروں پر اپنے طنز و مزاح کا علم لہرایا۔

1947 سے 1955 تک کے زمانے کو مولانا چراغ حسن حسرت کے انتہائی عروج کا زمانہ کہا جاتا ہے۔ مولانا نے مختلف قلمی ناموں کے تحت مختلف اخبارات میں کالم تحریر کیے۔ 'حرف و حکایت' ان کا آخری کالم اور 'سند باد جہازی' ان کا آخری قلمی نام ہے۔ لیکن اچانک قدرت کی منظوری کے تحت مولانا نے اس فانی دنیا کو خیرباد کہہ دیا۔ مولانا کی وفات کے بعد ان کے اس آخری کالم کو روزنامہ 'امروز' لاہور میں احمد ندیم قاسمی نے لکھنا شروع کیا، اس اخبار کے کراچی ایڈیشن میں 'حرف و حکایت' کی ذمے داری ابن انشا نے سنبھالی۔

مولانا چراغ حسن حسرت کی ادارت میں نکھرا ہوا مزاح لیے شیرازہ بھی بہت مشہور ہوا۔ فکاہیہ ہفت روزہ 'شیرازہ' سے اردو صحافت میں ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ چراغ حسن حسرت نے 1936 میں لاہور سے شیرازہ جاری کیا اور اچھے لکھنے والوں کی ایک بڑی تعداد اپنے گرد جمع کر لی ان میں چند ایسے افراد بھی شامل تھے جو آگے چل کر اردو صحافت میں طنز و مزاح کو فروغ دینے والوں کی فہرست میں شامل ہو گئے جو جدید مزاحیہ ادب میں فکاہیہ کالم نگاری کی روایت کو مستحکم کرنے والوں میں اپنا ایک خاص مقام بنا پائے۔

مولانا چراغ حسن حسرت نے صرف سیاسی کشمکش کا ایک طویل دور دیکھا تھا بلکہ اپنے تبصروں میں اپنے مخصوص مزاحیہ انداز میں اس پر روشنی بھی ڈالی۔ تحریف کے سلسلے میں ان کا 'پنجاب کا جغرافیہ' خاصا مقبول ہوا جس میں اس دور کی بعض شخصیتوں پر طنز کیا ہے۔ 'مردم دیدہ' ان کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے اس کے مضامین شیرازہ میں بھی چھپتے تھے۔

چراغ حسن حسرت کے مضامین کا ایک مجموعہ 'کیلے کا چھلکا' ہے۔ جس کے اکثر و بیشتر مضامین انگریزی سے ماخوذ ہیں۔ الیکشن، مرزا باقر کے خطوط اور شاہ الفت حسین ان کے اپنے ذہن کی تخلیق ہے اس میں لکھنؤ کے ایک مشاعرے کی عکاسی ہے۔ جس میں شعرا کے انداز بیان، سامعین کی سخن شناسی اور صدر کی کارکردگی کا خاکہ اڑایا گیا ہے مثال کے طور پر اقتباس دیکھیں جس میں شاعر کا حلیہ اور سامعین کی بیداری کا ذکر اور ان کا اسلوب مزاح عروج پر نظر آتا ہے:

''ان سب کے آخر میں ایک صاحب آئے۔ بھرا ہوا چہرہ، سانولی رنگت، پچاس پچپن کی عمر، داڑھی منڈی ہوئی، بڑی بڑی مونچھیں۔ آرزو نے جھک کر میرے کان میں کہا یہ دہلی کے رہنے والے ہیں اور ارمان تخلص کرتے ہیں۔ انھوں نے غزل شروع کی، بیمار آنکھیں، بیمار آنکھیں لیکن ابھی مطلع ہی پڑھا تھا کہ ایک طرف سے

آواز آئی 'مونچھیں' اس پر شور مچ گیا اب یہ کیفیت تھی کہ ارمان صاحب آنکھیں کہتے ہیں اور لوگ مل کر مونچھیں پکارتے ہیں، لیکن انھوں نے بھی غزل پڑھ کر ہی دم لیا۔''

(سند باد جہازی، کیلے کا چھلکا اور دوسرے مضامین، ص171)

آزادی کے بعد کے زمانے کے مزاحیہ کالم نگاروں کا جائزہ لیں تو ان میں ایک اہم نام فکر تونسوی کا ہے۔ تقسیم ملک کے حالات وواقعات اور اس کے بعد کے بہت سے اہم مسائل کو انھوں نے اپنی تحریروں میں نمایاں کیا۔ اس سے قبل وہ ادبی دنیا میں ایک شاعر کی حیثیت سے جانے جاتے تھے۔ تقسیم وطن، فسادات اور ہجرت کے المیہ نے ان کی زندگی کو بہت متاثر کیا۔ وقتی حالات کے انتشار کا جو تقاضا تھا فکر نے اس پر عمل کرتے ہوئے ہجرت کے مرحلے کو اختیار کیا اور پاکستان کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ کر دلی میں آباد ہوئے۔ اس کا اثر ان کے دل ودماغ نے اس حد تک قبول کر لیا تھا کہ انھوں نے اپنا سارا وقت شاعری سے ہٹ کر صحافت میں لگا دیا۔ یہاں فکر کے ساتھ فکر معاش کا سوال بھی وابستہ تھا۔ وہ بخوبی جانتے تھے کہ شاعری سے اپنا اور اپنے گھر والوں کا پیٹ پالنا بہت مشکل ہوگا، اس لیے صحافت کو انھوں نے بطور پیشہ اختیار کیا اور اپنے داخلی جذبات کے تحت ان واقعات وحادثات کی ناہمواریوں پر طنز کا تیر چلایا جو رہ رہ کر معاشرے میں پیدا ہو رہی تھیں۔ اس وقت کا پورا معاشرہ منتشر، تباہ حال اور پریشانیوں کی زد میں تھا۔ لوگ طرح طرح کی برائیوں میں ملوث تھے۔ پوری انسانیت سسک رہی تھی۔ فکر شدت سے ان ساری باتوں کو محسوس کر رہے تھے۔ وہ اپنے اندر ایک دردمند انسان کا دل رکھنے کے ساتھ ساتھ انسانیت کی قدر وقیمت سے بھی بخوبی واقف تھے۔ اس کا حل ان کی نگاہ میں معاشرے کی اصلاح کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ نتیجتاً انھوں نے سڑے گلے معاشرتی نظام کے خلاف قلم اٹھایا اور عوام کی پریشانیوں کو اپنی طنز نگاری سے دور کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ اس کے لیے انھوں نے جو ذریعہ اپنایا وہ صحافت اور ادب سے جڑا ہوا تھا۔

''فکر تونسوی کی کالم نگاری کا آغاز'' 1952 میں روزنامہ 'نیاز مانہ' کے طنزیہ کالم سے ہوا۔''

(ابن اسماعیل، اردو طنز ومزاح احتساب وانتساب، ص119)

اس اخبار میں فکر 'آج کی خبر' کے نام سے کالم لکھا کرتے تھے۔ پھر انھوں نے روزنامہ 'ملاپ' دہلی میں 'پیاز کے چھلکے' کے عنوان سے طنزیہ ومزاحیہ کالم لکھنا شروع کیا جو 1955 سے 1987 تک باقاعدہ چھپتا رہا۔ بقول نامی انصاری:

''اردو اخبار 'ملاپ' میں برسوں فکر تونسوی نے 'پیاز کے چھلکے' کے عنوان سے طنزیہ کالم لکھے۔ وہ روز مرہ کی سیاسی وسماجی زندگی کے واقعات کو موضوع سخن بناتے رہے۔ چونکہ ان کے پاس زندگی کے عملی تجربات اور مشاہدات کی کمی نہ تھی اس لیے ان کی روزانہ کالم نویسی میں بھی ایک خاص توانائی اور قوت ہوتی ہے۔ ان کے قاری کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ خاص اسی کے تجربے کی بات کر رہے ہوں۔ فکر تونسوی، انسان کو اس کی ساری خوبیوں اور خرابیوں کے ساتھ برتتے اور دیکھتے ہیں۔ ان کے پاس نہ تو رنگین شیشوں کی عینک تھی اور نہ بلندی کا مصنوعی زینہ۔ وہ آدمیوں میں گھل مل کر ان کے دکھ درد کا ادراک کرتے تھے اور اس کو طنز ومزاح کی چاشنی میں ڈبو کر اخبار کے صفحے پر پھیلا دیتے تھے۔''

(نامی انصاری، آزادی کے بعد اردو نثر میں طنز ومزاح، ص166)

مجتبیٰ حسین نے فکر تونسوی کی طنزیہ ومزاحیہ کالم نگاری کے بارے میں ایک دلچسپ بات کا ذکر اپنے ایک مضمون میں کچھ اس طرح کیا ہے:

''ملاپ اخبار میں کسی صاحب نے اپنی بھینس کی گم شدگی کا اشتہار شائع کیا تھا تو فکر تونسوی نے اس اشتہار پر ایک طنزیہ ومزاحیہ کالم لکھا۔ چند دنوں بعد ان صاحب کو ان کی گم شدہ بھینس واپس مل گئی۔ اس لیے نہیں کہ انھوں نے اخبار میں اشتہار چھپوایا تھا بلکہ اس لیے کہ فکر تونسوی نے اس بھینس کے بارے میں کالم لکھا تھا۔ مبادا یہ نہ سمجھیے کہ ان دنوں بھینس بھی فکر تونسوی کا کالم پڑھتی تھیں بلکہ ان دنوں لوگ اشتہاروں سے زیادہ طنزیہ ومزاحیہ کالم کو دلچسپی سے پڑھتے تھے۔''

(مجتبیٰ حسین، مزاحیہ کالم نگاری، اردو صحافت، مرتبہ: انور علی دہلوی، ص 227-28)

فکر جس واقعے کو بیان کرتے ہیں اس کا ایک ایک جز ظاہر کر کے ہو بہو نقشے کی شکل میں قاری کے سامنے لاتے ہیں۔ رشوت جیسی سماجی برائیوں کو واضح کرنے کے لیے وہ ایک کانسٹبل پر طنز کا تیر یوں چلاتے ہیں:

''میں نے روپیہ نکال کر کانسٹیبل کی جیب میں ڈال دیا اور کہا'' لیجیے جناب تہذیب آپ کی جیب میں آ گئی''۔ وہ بولا، کیا تم نے مجھے رشوت دی؟ میں نے کہا رشوت! صرف کالے روپے کو سفید کر دیا۔ کانسٹیبل کو میری بات پر مسکرانا چاہیے تھا مگر جس کی جیب میں دوسروں کا روپیہ ہو مسکراہٹ اس کے نصیب میں نہیں ہوتی بلکہ وہ انتہائی سنجیدہ ہو جاتا ہے۔ سنجیدگی اور دھمکی کے ملے جلے انداز میں اس نے کہا'' تم مجھے کسی شریف خاندان کے معلوم ہوتے ہو اس لیے اس بار چھوڑے دیتا ہوں، لیکن خبردار آئندہ کسی کو رشوت دی۔ رشوت کے معاملے میں سرکار کے قانون بہت سخت ہیں۔'' (فکر تونسوی، یادرفتگاں نمبر، اشوک پریہ درسی، ص174)

ایک اور مثال ملاحظہ ہو:

''مگر میرا خیال ہے کہ جو لوگ کم بچے پیدا کرنے کے نعرے لگاتے ہیں وہ پڑھے لکھے جاہل ہیں۔ کیونکہ بچے پیدا کرنے کا تعلق ساج واد سے نہیں ہے صرف ساج سے ہے۔ مثلاً کم سے کم بچے کا مطلب یہ ہے کہ صرف ایک بچہ پیدا کیا جائے، کیونکہ ایک بچے سے کم بچے پیدا کرنا ممکن نہیں۔ لیکن اگر وہ ایک بچہ نالائق ہو جائے تو آپ کیا کریں گے۔ کیونکہ تاریخ کہتی ہے کہ ہر گھر میں ایک نہ ایک بچہ ضرور نالائق نکلتا ہے۔ اس لیے اگر بچہ ہی ایک ہو تو نالائق ہونے کی ذمے داری بھی اسے ہی اٹھانا پڑتا ہے لہٰذا ایک نالائق بچے کے مقابلے میں ایک لائق بچہ پیدا کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ تاکہ بوڑھا باپ اپنے پڑوس سے کہہ سکے۔ ''اجی رگھوناتھ جی! وہ تو مجھیے میرا نصیب اچھا تھا کہ چھوٹا لڑکا عقل مند نکل آیا ورنہ بڑے نے تو گھر کی لٹیا ڈبو دی تھی۔''

(فکر تونسوی، فکر نامہ، ص360)

بات بات میں طنز کے تیر برسانا فکر کی فطرت میں شامل تھا۔ ان میں ایک خوبی یہ بھی تھی کہ وہ بات سے بات پیدا کر کے قاری کو حیرانی وپریشانی میں ڈال دیتے تھے۔ فکر کی نظریں ان کرداروں وموضوعات پر ٹکتی ہیں جو میلے کچیلے، غربت زدہ، خستہ حال اور زمانے کے ستائے ہوئے تھے۔ فکر تونسوی ان ہی لوگوں کی مزاحیہ انداز میں وکالت کرتے نظر آتے ہیں اور اپنے طنز کے پیرائے میں پوری انسانیت کو اچھائی کا درس دیتے ہیں۔ ان کے طنز کے نشانے پر وی آئی پی اور ناکارہ حاکم سے لے کر بڑے بڑے مفاد پرست اور استحصال پرست سرمایہ دار ہیں جو اپنی ہمدردی کا ڈھونگ رچا کر غریبوں، کسانوں، محتاجوں اور مظلوموں کو ستاتے ہیں اور ان سے غلط اور خطرناک کام لیتے ہیں۔ اس طرح کی باتوں کو فکر اپنے دل ودماغ پر نقش کر لیتے ہیں اور موقع محل کی مناسبت سے ان واقعات وحالات کو اپنی تحریروں میں بیان کرتے ہیں۔ طنزیہ ومزاحیہ مضامین اور اخبار میں لکھے گئے کالم ان کی اسی سوچ کا نتیجہ ہیں اور شاعری سے طنز ومزاح کی جانب رجوع ہونے کی وجہ بھی شاید یہی ہے۔

■

Md.Shamim Akhter, c/o.Alam medical hall, Maharajganj Road, Post. Rafiganj, Dist; Aurangabad - 824125 (Bihar)

شریف احمد قریشی

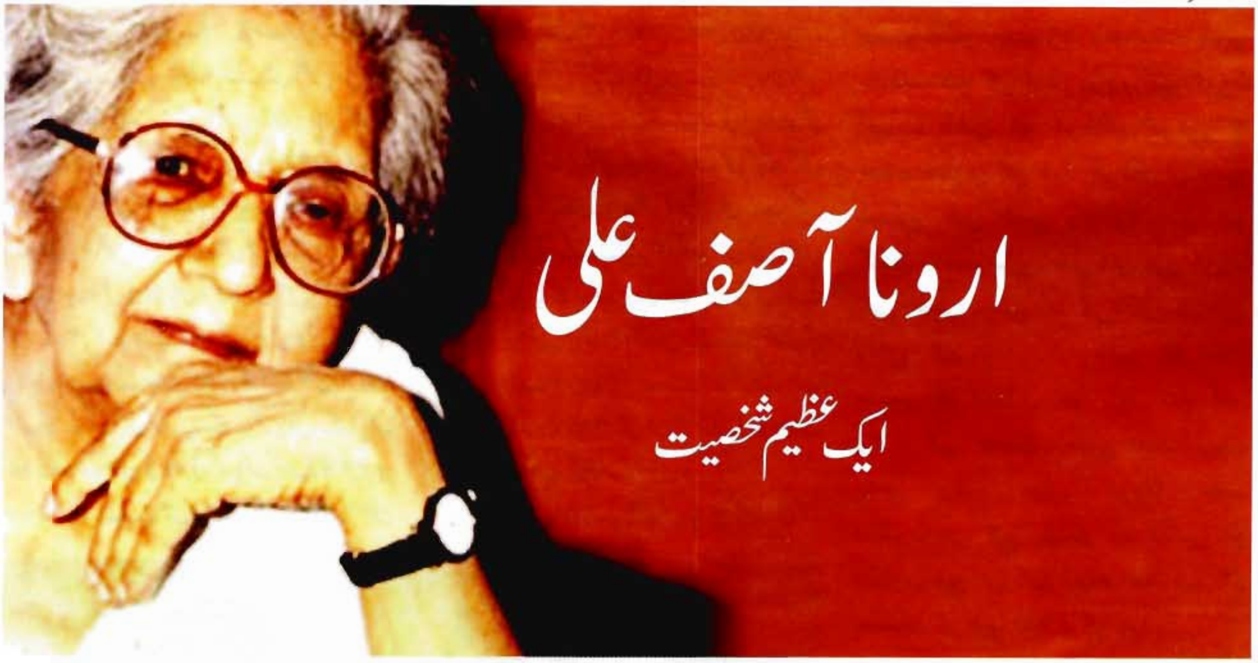

ارونا آصف علی

ایک عظیم شخصیت

تاریخ شاہد ہے کہ دنیا کے بیشتر انقلاب جرأت مند خواتین کی بیداری، عملی جدوجہد اور اُن کے تعاون کے بغیر تکمیل کو نہیں پہنچے۔ صفحۂ قرطاس پر ایک نہیں ایسی ہی بے شمار دلیر اور جرأت مند خواتین کی داستانیں بکھری ہوئی ہیں جنھوں نے ہر میدان میں اپنے عظیم کارناموں سے دنیا کو حیرت زدہ کر دیا ہے۔ ہندوستان کی جنگ آزادی میں جہاں مردوں نے صعوبتیں برداشت کیں، سختیاں جھیلیں، پھانسی کے پھندوں پر جھولے وہیں دخترانِ ہند بھی عیش وآرام اور خانگی زندگی کی راحتوں کو چھوڑ کر وطنِ عزیز کو غاصب انگریزوں کے چنگل سے آزاد کرانے کے لیے اپنے آنچلوں کے پرچم بنا کر برسرِ پیکار ہو گئیں۔

جن دخترانِ قوم نے انگریزی حکومت کے جبر واستبداد کا مقابلہ سینہ سپر ہو کر کیا اُنھیں میں سے ایک عظیم دخترِ ہند ارونا آصف علی بھی ہیں جنھیں گرانڈ اولڈ لیڈی کے خطاب سے یاد کیا جاتا ہے۔ ارونا آصف علی کی پیدائش 16 جولائی 1909 کو موجودہ ہریانہ اور اُس وقت کے برٹش پنجاب کے ماتحت کالکا کے ایک معزز برہمن خاندان میں ہوئی تھی۔ اُن کی ابتدائی، ثانوی اور گریجویشن کی تعلیم لاہور اور نینی تال میں ہوئی۔ گریجویشن کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد وہ گوکھلے میموریل اسکول، کلکتہ میں درس وتدریس کے فرائض انجام دینے لگیں۔ اُسی دوران الٰہ آباد کے ایک اہم اور فعال کانگریسی لیڈر آصف علی سے ارونا کی نزدیکیاں بڑھنے لگیں۔ دھیرے دھیرے یہ نزدیکیاں محبت میں تبدیل ہو گئیں اور پھر 1928 میں ارونا نے اپنے خاندان والوں کی مرضی کے خلاف آصف علی سے شادی کر لی۔ آصف علی عمر میں ارونا سے 23 سال بڑے تھے۔ شادی ہونے کے بعد اُن کا نام ارونا گانگولی سے ارونا آصف علی ہو گیا اور وہ عملی طور پر جنگ آزادی کی تحریک سے وابستہ ہو گئیں۔

نمک کا قانون توڑنے کے سلسلے میں ہونے والے عوامی اجلاس میں حصہ لینے کی وجہ سے انگریزوں نے ارونا آصف علی کو گرفتار کر لیا۔ 1931 میں گاندھی اِروِن معاہدے کے تحت انگریزوں نے سیاسی قیدیوں کو تو رہا کر دیا مگر ارونا آصف علی کو رہا کرنے سے انکار کر دیا۔ انگریزی سرکار کے حکمرانوں کے اس رویّے سے ناخوش اور ناراض ہو کر دیگر خواتین قیدیوں نے بھی جیل سے رہا ہونا نامنظور کر دیا۔ ماحول کے مکدّر ہونے اور گاندھی جی کی مداخلت کے بعد ارونا آصف علی کو جیل سے رہا کیا گیا مگر 1932 میں اُنھیں پھر گرفتار کر لیا گیا اور دلّی کے تہاڑ جیل میں رکھا گیا۔ جیل کا عملہ قیدیوں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتا تھا۔ اُنھیں مختلف طریقوں سے پریشان کیا جاتا تھا۔ سیاسی قیدیوں کے ساتھ بُرا سلوک کرنے کے سبب ارونا آصف علی نے جیل میں بھوک ہڑتال شروع کر دی جس سے جیل کے عملے اور انگریز حکمرانوں میں کھلبلی مچ گئی۔ آخرکار جیل کے حالات معقول کرنے کے لیے انگریزی سرکار کو مجبور ہونا پڑا مگر ارونا آصف علی کو تہاڑ جیل سے منتقل کر کے انبالہ کے جیل میں قید تنہائی کی سزا دی گئی۔ جیل سے رہا ہونے کے بعد وہ سیاسی طور پر بہت زیادہ سرگرمِ عمل نہیں رہیں۔

مہاتما گاندھی کی تحریک پر 1942 میں ہندوستان چھوڑو تحریک میں ارونا آصف علی نے پھر عملی طور پر حصہ لینا شروع کر دیا۔ جب 8 اگست 1942 کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے بمبئی کے اجلاس میں انگریزوں کو مُلک سے باہر کرنے کا عہد کیا گیا تو انگریزی حکومت لرزہ براندام ہو گئی۔ ہندوستان چھوڑو تحریک کو ناکام کرنے کے لیے آپریشن زیرو اوور کے تحت انگریزی سرکار نے ہندوستان چھوڑو تحریک سے وابستہ تمام اہم اور قدآور رہنماؤں کو گرفتار کر لیا۔ گاندھی جی کو پونہ کے آغا خاں محل میں جواہر لال نہرو، ابوالکلام آزاد، آصف علی، ڈاکٹر راجندر پرساد، ڈاکٹر سیّد محمود، جی بی پنت، آچاریہ کرپلانی، سیتارمیّا، پرپھُلّ گھوش وغیرہ کو احمد نگر اور دیگر مقامات میں نظر بند کر دیا گیا۔ دوسرے دن یعنی 9 اگست 1942 کو بمبئی کے اس اجلاس کی صدارت ارونا آصف علی نے بڑی بے باکی اور بے خوفی سے کی۔ اُنھوں نے بہادری، دلیری اور جرأت مندی کا ثبوت دیتے ہوئے بمبئی کے گوالیا ٹینک میدان میں ترنگا پرچم پھہرا کر ہندوستان چھوڑو تحریک کا نہ صرف آغاز کیا بلکہ انگریزی حکومت کے خلاف کھُلی بغاوت بھی کر دی۔ گرفتاری سے بچے ہوئے کانگریسی لیڈر جے پرکاش نارائن، رام منوہر لوہیا اور ارونا آصف علی نے ہندوستان چھوڑو تحریک کو آگے بڑھانے کا قابلِ فخر کارنامہ انجام دیا۔ اُنھوں نے ایک کتابچہ بھی شائع کیا جس میں بارہ نکات تھے۔ اس کتابچے میں عدمِ تشدد پر زور دیتے ہوئے پورے مُلک میں ہڑتال کرنے، عام اجلاس کرنے، جلوس نکالنے، نمک بنانے اور لگان نہ دینے کی اپیل کی گئی

تھی۔ اس کتابچہ کو انگریزی سرکار نے ضبط کرلیا۔ کوئی مستحکم قیادت نہ ہونے کے باوجود تمام مُلک میں انگریزوں کے خلاف غم وغصّے کی لہر دوڑ گئی۔ انگریزو! ہندوستان چھوڑو، کے نعرے بلند ہونے لگے۔ انگریزوں کی مخالفت میں جگہ جگہ جلسے اور جلوس کا اہتمام کیا جانے لگا۔ مُلک کے مزدوروں، کسانوں اور طلبا نے اس تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا۔ ریل کی پٹریاں اُکھاڑ دی گئیں، بجلی اور ٹیلی فون کے تار کاٹ دیے گئے، کئی جیلوں کو توڑ دیا گیا، سرکاری رپورٹ کے مطابق 250 ریلوے اسٹیشن اور 500 ڈاک خانے نذرِ آتش کر دیے گئے۔ انگریزوں کے ناپاک وجود سے ہندوستان کی دھرتی کو پاک کرنے کا عزم ہر ہندوستانی کی رگ و پے میں سرایت کر گیا تھا اور ایسا معلوم

ہوتا تھا کہ

دلوں میں جاگ اُٹھا تا حیات کا جذبہ
فرنگیوں سے مکمّل نجات کا جذبہ

ہندوستانیوں کے جوش اور جذبے کو دیکھ کر یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ اب انھیں غلامی کے بندھن میں بہت دن تک نہیں جکڑا جا سکتا۔ ارونا آصف علی کو ہندوستان چھوڑو تحریک کی علم بردار کی حیثیت سے ہمیشہ یاد کیا جاتا رہے گا۔

ہندوستان چھوڑو تحریک سے خائف ہو کر انگریزوں نے ارونا آصف علی کو گرفتار کرنے کا حکم جاری کر دیا۔ گرفتاری سے بچنے کے لیے وہ روپوش ہو گئیں۔ انگریزی سرکار نے ارونا کی خبر دینے یا گرفتار کرانے والے کو 5,000 روپے کا انعام دینے کا اعلان کر دیا۔ جو اُس وقت کے حساب سے ایک بہت بڑی رقم تھی۔ ارونا جب انگریزوں کے ہاتھ نہ لگیں تو انھوں نے ان کی تمام املاک کو ضبط کر کے نیلام کر دیا۔ وہ اسی دوران ڈاکٹر رام منوہر لوہیا کے ساتھ مل کر انقلاب نامی ماہنامہ کی ادارت بھی کرتی رہیں۔ انھیں دنوں ارونا آصف علی بہت علیل ہو گئیں۔ خرابیِ صحت کے مدِنظر گاندھی جی نے انھیں خودسپردگی کرنے کے لیے ایک خط لکھا جس میں انھوں نے یہ بھی تحریر کیا تھا کہ خودسپردگی کے عوض حاصل ہونے والی رقم کو ہریجنوں کی فلاح و بہبودی کے لیے استعمال کیا جائے۔ ارونا نے خودسپردگی کرنے سے انکار کر دیا۔ جب انگریزی سرکار نے 1946 میں اُن کی گرفتاری کا وارنٹ رد کیا تب وہ لوگوں کے سامنے آئیں۔

1948 میں ارونا نے کانگریس پارٹی چھوڑ دی اور سوشلسٹ پارٹی میں شامل ہو گئیں۔ کچھ دنوں کے بعد انھوں نے کمیونسٹ پارٹی کی رکنیت اختیار کر لی۔ 1953 میں اپنے شوہر آصف علی کی وفات کے بعد وہ ذہنی اور جسمانی طور پر کچھ کمزور سی ہو گئیں۔ آزادیِ ہند کے بعد بھی ارونا آصف علی نے ملک، سماج اور قوم کی فلاح و بہبود کے لیے بہت سے کام کیے۔ وہ 1958 میں دلّی کی پہلی میئر منتخب ہوئیں۔ اُنھوں نے جے پرکاش نارائن کے ساتھ روزنامہ پیٹریاٹ اور ہفت روزہ لنک بھی شائع کیے مگر باہمی اختلافات کی بنا پر وہ بہت دنوں تک ان اخبارات سے وابستہ نہ رہ سکیں۔ وہ 1964 میں دوبارہ کانگریس میں شامل ہوئیں مگر عملی طور پر انھوں نے سیاست سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ اندرا گاندھی اور راجیو گاندھی سے اُن کے بہت قریبی تعلّقات تھے۔ 1975 میں اُنھیں امن اور اتحاد کے لیے لینن پرائز اور

ہندوستان چھوڑو تحریک سے خائف ہو کر انگریزوں نے ارونا آصف علی کو گرفتار کرنے کا حکم جاری کر دیا۔ گرفتاری سے بچنے کے لیے وہ روپوش ہو گئیں۔ انگریزی سرکار نے ارونا کی خبر دینے یا گرفتار کرانے والے کو 5,000 روپے کا انعام دینے کا اعلان کر دیا۔ جو اُس وقت کے حساب سے ایک بہت بڑی رقم تھی۔ ارونا جب انگریزوں کے ہاتھ نہ لگیں تو انھوں نے ان کی تمام املاک کو ضبط کرکے نیلام کر دیا۔

1991 میں انٹرنیشنل نالج کے لیے جواہرلال نہرو ایوارڈ پیش کیا گیا۔ اُنھیں 1992 میں پدم وِبھوشن اور بعد از مرگ 1997 میں بھارت رتن کے عظیم اعزاز سے بھی نوازا گیا۔ 1998 میں اُن کی یاد میں ایک ڈاک ٹکٹ بھی جاری کیا گیا۔

ارونا آصف علی نہایت سادہ مزاج اور عوام کے ساتھ گھُل مل کر رہنے والی خاتون تھیں۔ اُنھوں نے اپنی عمر کے 80 سال تک عام سواریوں میں سفر کیا۔ ایک بار وہ دلّی میں مسافروں سے کھچا کھچ بھری بس میں سوار ہوئیں۔ اُسی بس میں ایک نوجوان ماڈرن لیڈی بھی سوار ہوئی۔ سیٹ پر بیٹھے ایک شخص نے اُس لیڈی کے لیے اپنی سیٹ خالی کر دی مگر اُس لیڈی نے وہ سیٹ ارونا کو دے دی۔ قدرے ناگواری کا اظہار کرتے ہوئے اُس شخص نے اُس لیڈی سے کہا: بہن! میں نے یہ سیٹ تمھارے لیے خالی کی تھی اور تم نے انھیں دے دی۔ ارونا آصف علی نے اُس شخص کو مخاطب کرتے ہوئے فوراً کہا: بیٹا! یہ مت بھولو کہ بہن سے پہلے ماں کا حق ہوتا ہے۔ یہ سُن کر وہ شخص نہایت شرمسار ہوا۔

29 جولائی 1996 کو ہند کی اس عظیم شخصیت ارونا آصف علی نے گویا یہ کہتے ہوئے داعیِ اجل کو لبیک کہا:

اُن چراغوں کے لیے میرا بھی خوں لے جانا
آندھیوں سے لڑنے کا جن کو خیال آتا ہے

■

Dr. Shareef Ahmad Quraishi Asso. Prof. Dept of Urdu, Gov. Raza Post Graduate College, Rampur - 244901 (UP)

شاہ نواز فیاض

اختر اورینوی کی افسانہ نگاری

ریاست بہار میں افسانہ نگاری کے باب میں 1930 سے 1946 تک کا زمانہ کافی اہم ہے۔ کیونکہ اس دوران بہت سے افسانہ نگار سامنے آئے۔ اس عہد کے مشہور افسانہ نگار، محسن عظیم آبادی، اختر اورینوی، سہیل عظیم آبادی اورش اختر وغیرہ کافی اہم ہیں۔ یہ سبھی اردو کے اہم ترین افسانہ نگاروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ سہیل عظیم آبادی کی پہچان پورے ملک میں ماہرِ نفسیات کی حیثیت سے ہوئی۔ کیونکہ ان کے افسانوں میں نفسیاتی پہلو کو بڑے منظّم طریقے سے بیان کیا گیا ہے۔ اسی زمانے میں ایک ایسا افسانہ نگار منظر عام پر آیا، جس نے ادب میں اپنی انفرادی پہچان بنائی۔ اس سے پہلے اتر پردیش اور پنجاب میں دیہی زندگی کو افسانے کا موضوع بنایا جا چکا تھا۔ اس شخص (اختر اورینوی) نے پہلی بار بہار کی دیہی زندگی اور وہاں کے طور طریقے اور رہن سہن کو اپنا موضوع بنایا۔

اختر اورینوی اردو کے مشہور افسانہ نگار ہیں۔ انھوں نے 1927 سے لکھنا شروع کیا اور یہ سلسلہ اخیر تک چلتا رہا۔ ان کے افسانوں کے مجموعے کی تعداد کل چھ ہے، 'منظر پس منظر،' 'کلیاں اور کانٹے'، 'انارکلی اور بھول بھلیا'، 'سمینٹ اور ڈائنا میٹ'، 'کیچلیاں اور بال جبریل' اور 'سپنوں کے دیس میں' ان کے مزاج میں رومان اور حقیقت کا ایک بڑا اچھا تال میل ہے اور یہی پہلو ان کے افسانے کی اہم کڑی ہے۔ انھوں نے ہمیشہ مزدور طبقہ کے لوگوں کو اپنا موضوع بنایا۔ ان کے یہاں مزدور بہر صورت مزدور ہے، چاہے وہ شہر کا ہو یا پھر دیہات کا۔ بلکہ شہر کے مزدور طبقے کا حال دیہات کے مزدور طبقے سے کہیں برا ہے۔ انھوں نے جس موضوع پر قلم اٹھایا ہے، اس کی اس طرح سے منظر کشی کی ہے کہ وہ منظر پورے اپنے اصل وجود کے ساتھ نظروں کے سامنے آجاتا ہے۔ انھوں نے بہار کے موسم، وہاں کی فضا اور وہاں رہنے والے غریب لوگوں کے عادات واطوار کو اپنے افسانے کا موضوع بنایا ہے۔ انھوں نے کسان اور زمیندار کے تعلقات کو بھی بیان کیا ہے۔ گویا کہ غریب لوگوں سے متعلق ہر وہ چیز جس سے کہ وہ پریشان رہتا ہے۔ مثلاً مال گزاری، خشک سالی، قرض، کھانا، گھر سنسار یہی وہ اصل چیز ہے جن کے گرد انسانی زندگی گھومتی نظر آتی ہے اور انسان کی بنیادی ضروریات بھی یہی ہیں۔ ان ہی سب کو اختر اورینوی نے اپنے افسانوں میں جگہ دی ہے۔

اختر اورینوی نے سماج کا مطالعہ ایک ادیب کی نظر سے کیا۔ انھوں نے اپنے لیے ایک ایسے موضوع کا انتخاب کیا، جس کا ان سے پہلے کسی نے بھی، خاص طور پر بہار کے حوالے سے، نہیں کیا تھا۔ چونکہ یہ ایک حساس معاملہ ہے، یہ ایک ایسی دنیا ہے جہاں خوشی کبھی کبھی ہی ملتی ہے۔ ورنہ عام طور پر تکلیف کے ہی بادل منڈلاتے نظر آتے ہیں اور ان ہی میں سے بہت سے ایسے لوگ ہوتے ہیں جو اپنی زندگی کے تین حصے سے زیادہ تکلیف میں گزار دیتے ہیں۔ جب ایسے لوگوں پر کوئی ادیب قلم اٹھاتا ہے، اور پنے انداز میں اس پورے سماج کا نقشہ کھینچتا ہے، تبھی اس پورے سماج کی اصلیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ کیونکہ اس طرح تفصیل سے ایک ادیب ہی لکھ سکتا ہے۔ اور اس کام کو اختر اورینوی نے بہت بھرپور کیا ہے۔ ان کے افسانے کے حوالے سے وقار عظیم نے لکھا ہے:

''اختر اورینوی نے بہار کے دیہاتوں کی جو کہانیاں لکھی ہیں ان سے یہاں کی زندگی کے کچھ پہلو اپنے اصلی خدوخال کے ساتھ ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔ یہاں کے موسم، یہاں کی وہ خاص فضا جو یوپی اور پنجاب سے بالکل الگ ہے اور اس فضا میں رہنے سہنے والے کسان اور ان کی زندگی کے ناسور، ان کے اخلاق اور عادتیں۔ کسان اور زمیندار کا تعلق۔ کسان یہاں بھی لگان، مال گزاری، خشک سالی اور مہاجن کے قرض میں مبتلا ہیں۔ پیٹ خالی ہیں اور تن ڈھکنے کو کپڑا نہیں۔ پھر بھی بدن پر لنگوٹی لگانے والے اپنے من کی موج میں مگن رہتے ہیں۔''

(نیا افسانہ، وقار عظیم، علی گڑھ ایجوکیشنل بک ہاؤس 1975 ص 174-173)

اختر اورینوی نے نہ صرف دیہات میں بسے ہوئے مزدور اور نچلے طبقے کے لوگوں کو اپنی کہانی کا موضوع بنایا ہے، بلکہ انھوں نے شہر کے ان لوگوں کو بھی اپنی کہانی کا موضوع بنایا ہے، جو گاؤں چھوڑ کر شہر میں آبسے۔ حقیقت یہ ہے کہ غریبوں کے لیے شہر کی زندگی گاؤں کی زندگی سے کہیں زیادہ تکلیف دہ ہے۔ شہر کی تکلیف زدہ زندگی اس سمندر کے مانند ہے، جس کی گہرائی اور اس سمندر سے آنے والی تباہی سے لوگ یکسر ناواقف ہیں اور اوپری سطح کی ٹھنڈی ہوا کے ساتھ ہی زندگی کا لطف لیتے ہیں۔ اسی طرح سے شہر کی بھاگ دوڑ بھری زندگی میں تکلیف زدہ لوگوں کے آنسوؤں کو پوچھنے والے اور ان سے ہمدردی کرنے والوں کی تعداد نا کے برابر ہے۔ جہاں کسی کی نگاہ نہیں پہنچتی وہاں کی زندگی کا مشاہدہ ایک ادیب کرتا ہے اور اختر اورینوی نے اس کام کو بڑے اچھے اور منظّم طریقے سے انجام دیا ہے۔ انھوں نے شہر کے نچلے طبقے کے لوگوں کو اپنے افسانے کا موضوع بنایا جیسے: رکشا والے، ڈرائیور، باورچی اور اسی طرح کے دوسرے مزدور، جو شہر میں رہتے ہوئے بھی بنیادی سہولیات سے محروم ہیں اور یہی اختر اورینوی کا کمال ہے کہ انھوں نے بڑے سادے اور دل موہ لینے والے انداز میں یہ ساری باتیں کہی ہیں اور اسی تناظر میں ان کے مشہور افسانہ 'کلیاں اور کانٹے' کو پڑھا جائے تو، ایسے کمزور اور دبے کچلے لوگوں کی سچی تصویر نظروں کے سامنے ابھر آتی ہے:

''تیسرے درجے کے معنی تھے ایک وسیع اور لانبا (لمبا) چوڑا کمرہ۔ ایک کمرے میں آٹھ پلنگ ہوتے تھے اور جب حیات کے لعب ولہو کی رفتار میں زیادہ تیزی ہو

جاتی تو سل ودق کے جراثیم کے چند اور شکار آجاتے تھے اور کمرے کی آبادی بارہ تیرہ تک پہنچ جاتی تھی۔ درجہ سوئم کا کرایہ پچیس روپے ماہوار تھا۔ موت اور زندگی کے درمیان بھی انسانیت درجوں میں بٹی ہوئی ہے۔ گھر، اسپتال اور قبرستان، ہر جگہ نمبر ایک نمبر دو اور نمبر تین کی تفریق ہوتی ہے۔ کالوں کا قبرستان، گوروں کا قبرستان، شرفا کے مدفن اور غریبوں کے گورستان ہر شہر، ہر قصبے اور گاؤں میں پائے جاتے ہیں۔ صحت گاہ اسی کرہ پر قائم تھی اور اسی کے بھلے برے قانون کی پابند۔''

(اختر اورینوی کے افسانے، انتخاب مع مقدمہ، م، عبدالمغنی، بہار اردو اکادمی، پٹنہ 1977 ص 89-88)

درج بالا اقتباسات سے اختر اورینوی کی باریک بینی کا تو اندازہ ہوتا ہی ہے، ساتھ ہی ساتھ سماجی زندگی اور انسانی فطرت پر جس طرح کا طنز ہے وہ اختر اورینوی ہی کا خاصہ ہے۔ ان کے اس طرح کے افسانے میں ایسا لگتا ہے کہ ایک چھوٹی سی دنیا آباد ہے۔ جہاں ایک طرف زندگی کی سچائیاں دکھائی پڑتی ہیں، تو دوسری طرف اسی سے پیدا شدہ بہت سی فنی باتیں اور زندگی کا فلسفہ بھی نظر آتا ہے۔ اگر اختر اورینوی کی زندگی کا نچوڑ دیکھنا چاہیں تو اس باب میں ان کے دو افسانے خصوصیت کے ساتھ پیش کیے جاسکتے ہیں۔ 'کیچلیاں اور بالِ جبریل' دوسرے 'سپنوں کے دیس میں' حقیقت یہ ہے کہ اختر اورینوی کے فن کی جب، جہاں بات آئے گی ان کے یہ دونوں افسانے بطور خاص پیش کیے جائیں گے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ ان افسانوں میں ان کی زندگی اور تجربے کا نچوڑ ہے۔ ان دونوں افسانوں کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں میں فلسفیانہ باتیں کہی گئی ہیں۔ ایسا فلسفہ جس کا تعلق صرف اور صرف زندگی اور سماج سے ہے اور ایسی تصویر ابھر کر ہمارے سامنے آتی ہے جیسے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی خواب دیکھا جا رہا ہو، اور اسی طرح کے رنگ برنگِ منظر ابھر کر سامنے آتے رہتے ہیں۔ دونوں افسانے کا ایک ایک اقتباس مثال کے لیے پیش ہے، تا کہ بہ آسانی اندازہ لگایا جا سکے کہ ان کا فن کس طرح سے اصل زندگی کے فلسفے کی ترجمانی کرتا ہے۔ 'کیچلیاں اور بالِ جبریل' کا اقتباس ملاحظہ ہو:

''... میں نے پھر خدائی کا دعوی کر دیا۔ اور اب کے مجھے سانپ نے نگل لیا۔ اور یوں ہوا کہ پہاڑ روشنی سے بھر گئے۔ میری روح کے بے شمار اجزا نے میرے خلاف سر اٹھایا۔ اور وہ مجھ سیرو گرداں ہو گئے۔ میں نے ان کا تعاقب کیا اور میں نے دیکھا کہ سمندر دو حصوں میں بٹ گیا۔ یا میں دو حصوں میں بٹ گیا۔ ایک حصہ ڈوبا اور ایک سلامت نکل گیا۔ میں 'غرقِ دریا' ہو کر بھی 'رسوا' ہوا۔ ہزاروں سال بعد میرا جنازہ شاہانہ طور پر تو نہ اٹھا۔ لیکن ایک عجائب خانہ میں مجھے مزار کی جگہ مل گئی۔''

(ایضاً، ص، 165)

'سپنوں کے دیس میں' کا اقتباس ملاحظہ ہو:

''پتلوں میں تو روح اسی وقت پھنک گئی تھی جب پتلے اٹھ بیٹھے تھے اور اس لمبے سفر کی لغزش و افتاد اور مقابلہ و تعاون نے پتلوں کی روحوں کو اور بالیدہ و پیچیدہ بنا دیا۔ روح کے ہر پیچ میں نت نئے تجربوں کے عکس مرتسم ہوتے جاتے تھے اور ان سے روحوں کی تہہ داری بڑھتی جاتی تھی۔ نئے تجربوں کی آزادی نے پتلوں میں بڑا اپنا پن پیدا کر دیا۔ ہر پتلا ایک فرد بن گیا۔ پہلے وہ محض ایک وجود تھا۔ پتلوں سے جب جوڑے بنے اور ان جوڑوں سے جب خاندان پیدا ہوئے تو پتلوں کی انفرادیت اور بڑھ گئی۔'' (ایضاً، ص 209-208)

دونوں افسانوں کے درج بالا اقتباسات سے اندازہ ہوتا ہے کہ اختر اورینوی کی ذہنی افق کس حد تک تھی۔ ایک ایک جملہ اپنے آپ میں ایک پورا واقعہ بیان کرتا ہوا نظر آرہا ہے۔ یہاں بات صرف انسان ہی تک محدود نہیں رہی۔ بلکہ بھگوان کی بھی بات کہی گئی ہے اور جب وہ اپنی ہی بنائی ہوئی چیز کے نشیب و فراز سے گزرتا ہے، تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ کوئی حقیقت نہیں بلکہ خواب دیکھ رہا ہے اور یہ پوری فضا خواب ناک بن جاتی ہے۔ اختر اورینوی کا کمال یہی ہے کہ وہ قصے کو ایسا ڈرامائی ماحول بنا کر پیش کرتے ہیں کہ تجسس اخیر تک بنا رہتا ہے۔ یہی ان کی امتیازی خصوصیت ہے۔

اختر اورینوی کا کوئی بھی افسانہ پڑھنے کے بعد یہ محسوس نہیں ہوتا ہے کہ، محض وہ ایک قصہ یا کہانی ہے، اور اس کہانی کی دلچسپی ہی اس کی پوری کائنات ہے۔ پڑھنے کے ساتھ ہی یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ یہ صرف قصے کی حد تک محدود نہیں ہے، بلکہ اس میں ایک درد، ایک قسم کی پکار اور ایک نغمہ ہے۔ جس کی وجہ سے قاری بہت دیر تک اسی میں کھویا رہتا ہے۔ اسی سلسلے کا ایک اقتباس (کلیاں اور کانٹے) سے ملاحظہ ہو:

''میں نے ان آنسوؤں میں ماضی کے کانٹوں کی چبھن محسوس کی اور زندگی کے کمیاب حسن کی چند نورانی کلیاں کھلتی ہوئی دکھائی دیں۔ انوکھے طور پر میں نے یہ محسوس کیا کہ عورت ہی مرد کی ابدیت کا ذریعہ ہے۔ فانی انسان عورت ہی کی مدد اور ربوبیت سے چند قطروں کو ناپیدا کنار سمندر بنا دیا ہے۔ میں نے دیکھا کہ انسانیت کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر عورت کی آغوش سے نکل کر ازل اور ابد کو گھیرے ہوئے ہے۔'' (ایضاً، ص 122)

اختر اورینوی کا کوئی ایک یا دو افسانہ نہیں، بلکہ ان کے بیشتر افسانے اسی طرح کے موضوعات پر ہیں۔ ان کے افسانوں کے موضوعات اتنے چست اور درست ہوتے ہیں کہ قاری خود بخود اسی میں کھو جاتا ہے۔ ان کے افسانے 'شادی کے تحفے'، 'زود پشیمانی'، 'شکور دادا'، 'کوئلے والا'، 'بہت بے آبرو ہو کر' اور کلیاں وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان کے افسانوں کی انفرادیت یہ ہے کہ افسانہ نگار کا اپنے کردار کے ساتھ ایک مخصوص رویہ ہے، جیسے کہ فنکار خود اپنی کہانی اس کردار کے توسط سے سنا رہا ہے۔ وقار عظیم لکھتے ہیں:

''اختر اورینوی نے جب دیہاتی زندگی کی کہانیاں لکھی ہیں یا شہری زندگی کے ان پہلوؤں کو اپنی کہانی کا موضوع بنایا ہے، جنھیں انھوں نے اپنے تخیل میں سمو لیا ہے، تو ان کے طرز میں حد درجہ سادگی اور شیرینی پیدا ہو جاتی ہے اور اس سادہ اور شیریں زبان میں لکھے ہوئے افسانوں میں وہ ساری باتیں آجاتی ہیں جو افسانے کو صرف اچھا ہی نہیں، بلکہ بہت اچھا بنا دیتی ہیں۔ ایسے افسانوں میں جب کسی شخصیت کا تعارف ہم سے ہوتا ہے تو ہم جیسے اس خاص شخص کو اپنے آپ سے بغل گیر ہوتے محسوس ہوتے ہیں۔''

(نیا افسانہ، وقار عظیم، علی گڑھ ایجوکیشنل بک ہاؤس، 1975 ص 177)

اختر اورینوی کے افسانوں کے مجموعے، 'سمینٹ اور ڈائنامیٹ'، 'کیچلیاں اور کلیاں'، اور 'سپنوں کے دیس میں' یہ تینوں مجموعے بحیثیت مجموعی اختر اورینوی کی افسانہ نگاری کے عروج اور کمالِ فن کا واضح نقش پیش کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں کی منظر کشی اس طرح حقیقت پر مبنی ہوتی ہے کہ، پڑھنے کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے یہ ساری چیزیں آنکھوں دیکھی ہیں۔ ہر لفظ اپنے اندر ایک گہری معنویت رکھتا ہے، اور ہر جملہ ایک پوری داستان بیان کرتا نظر آتا ہے۔ یہی وہ ساری خصوصیات ہیں جن کی وجہ سے اختر اورینوی اردو افسانے میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں اور جدید اردو افسانہ نگاری کے چند اہم افسانہ نگاروں میں اختر اورینوی کا بھی شمار ہوتا ہے۔

□

Shahnewaz Faiyaz, Research Scholar,
Department of Urdu, Jamia Millia Islamia,
New Delhi-110025

مسعود فضلی

نصرت محی الدین: چند تاثرات

آج کے دور میں جب کہ ہر طرف نفسا نفسی، خودغرضی، مفاد پرستی اور اخلاقی، سماجی افراتفری پھیلی ہوئی ہے ایسے میں کسے کہاں اتنی فرصت کہ بے لوث عوامی، سماجی اور ادبی خدمات کا جذبہ لے کر اٹھے اور بدلے میں کسی صلے اور ستائش کی طمع نہ کی، یقیناً ایک قابل قدر بات ہے۔ ایسے ہی کچھ آشفتہ سر لوگوں میں نصرت محی الدین کا شمار ہوتا ہے جن کے سروں میں ہر وقت کچھ نہ کچھ کرتے رہنے کا سودا سمایا ہوا ہوتا ہے۔

نصرت محی الدین کی عوامی، سماجی، ادبی، علمی اور سیاسی سرگرمیوں کا سلسلہ گزشتہ زائد از پچاس برسوں پر محیط ہے۔ ان کی شب و روز کی زندگی کا بہ نظرِ غائر جائزہ لیں تو پتہ چلتا ہے کہ وہ تادم مرگ دشتِ عمل کے سنگلاخ ریگزاروں کی صحرہ نوردی میں مصروف رہے۔

نصرت اور میری رفاقت زائد از پچاس برسوں کا احاطہ کرتی ہے۔ ہم پہلی بار 1963 کے اوائل میں ایک احتجاجی مہم کے دوران ملے تھے۔ یہ احتجاجی مہم ریاست میں اناج کے بڑھتے داموں کے خلاف کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کی جانب سے چلائی جارہی تھی۔ ان سے کچھ لمحوں کی ملاقات بعدازاں دیرینہ رفاقت میں بدل گئی جو دم آخر تک روز اوّل کی طرح باہمی خلوص، محبت اور اعتماد پر قائم و برقرار رہی۔ وہ جب کبھی مجھ سے بچھڑتے تو پھر جلد ہی دوبارہ ملنے کا وعدہ کرکے وداع ہوتے مگر اب کی بار دوبارہ ملنے کا وعدہ کیے بغیر ہی بچھڑ گئے۔

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سے کہاں جسے

> **نصرت کا حلقہ احباب بہت وسیع تھا۔ جس میں ایک محنت کش اور غریبوں سے لے کر دولت مند، برسراقتدار عہدہ دار، سیاسی لیڈران سب ہی شامل تھے۔ یہی وجہ تھی کہ غرض مند انھیں گھیرے رہتے کہ وہ ان کی سفارش کرکے ان کے رکے کام کروادیں اور نصرت بلاتکلف سفارش کرتے اور ان کا کام بہرحال کروادیتے۔**

اب ان سے ملاقات شاید روز قیامت ہی ہوگی۔ جب کبھی یہ احساس ہوتا ہے نصرت ہم میں نہیں رہے۔ ہمیشہ کے لیے بچھڑ گئے ہیں تو آنکھیں ڈبڈبا جاتی ہیں۔ نصرت تم کہاں ہو؟ ابھی ابھی تو تم نے انجمن کی صدارت سنبھالی تھی اور اردو زبان وادب کی ترقی کے لیے کیا کیا نہ پروگرام بنائے تھے اور کیا کیا نہ خواب دیکھے تھے۔

سارے خواب یوں ہی ادھورے پڑے ہیں

نصرت نے اپنی ساری زندگی حاجت مندوں کی بے لوث خدمات کے لیے وقف کر رکھی تھی۔ ہمیشہ دوسروں کے مسائل کے حل کے لیے کوشاں رہتے۔ اپنے لیے کچھ نہ کیا۔ قلندرانہ مزاج کے حامل تھے۔ چاہتے تو اپنے لیے بہت کچھ حاصل کرسکتے تھے۔ انھوں نے اپنے والد مخدوم محی الدین کے نام، اثر ورسوخ کو استعمال کرنے کو خودداری کے خلاف سمجھا۔ عزت، دولت، شہرت یا پھر کوئی سیاسی رتبہ، سماجی عہدہ اور انتظامی منصب حاصل کرنا ان کے لیے کوئی مشکل کام نہ تھا۔ صرف والدِ محترم کا نام ہی حصول مقصد میں بند تالوں کو کھولنے کے لیے کافی ہوتا مگر ان کی خوددار فطرت نے یہ گوارہ نہیں کیا کہ اپنے ذاتی مفاد کے لیے والد کے اثر و رسوخ کو استعمال کریں۔ وہ صرف اپنی صلاحیتوں کے بل بوتے پر اپنی پہچان بنانے پر ایقان رکھتے تھے۔

نصرت، مرتے وقت تک بے شمار ادبی، سماجی، تہذیبی انجمنوں سے نہ صرف وابستہ تھے بلکہ روح رواں بھی تھے۔ انجمن ترقی اردو آندھراپردیش اور تنظیم انصاف کے شریک معتمد اور انجمن ترقی اردو عظیم تر حیدرآباد کے صدر تھے۔ یہ

ذاتِ خود ایک ترقی پسند شاعر، صحافی اور ادیب تھے۔

نصرت مجاہد اردو تھے۔ انجمن ترقی اردو عظیم تر حیدرآباد کے صدر منتخب ہونے کے بعد اردو میڈیم کے طلبہ و طالبات کو دیگر ابنائے وطن کے دوش بدوش زندگی اور ترقی کی دوڑ میں شامل کرنے کے لیے اردو زبان کے ساتھ تلگو اور انگریزی زبان سیکھنے اور ان میں مہارت حاصل کرنے کے لیے بھی عملی اقدامات روبہ عمل لائے اور پرانے شہر کی مسلم اور غریب بستیوں میں اردو، تلگو اور انگریزی زبان سکھانے کے لیے تربیتی و کوچنگ کلاسوں کا آغاز کرنے کے ساتھ ساتھ گھریلو خواتین اور طالبات کی تعلیم و تربیت اور ضامن روزگار 'فن اور ہنر' سکھانے کا بھی منصوبہ بنایا تھا۔

نصرت بالخصوص غریب اور ضرورت مند طبقہ کے بڑے ہمدرد تھے۔ کسی کے برے وقتوں میں کام آنے کو اپنی خوش بختی تصور کرتے۔ وہ اپنا اور اپنے گھر کا ضروری کام چھوڑ کر دوسروں کی حاجت روائی کے لیے نکل پڑتے۔ وہ ایک یار باش، خوش مزاج بے لوث اور مخلصانہ مزاج کی حامل شخصیت کے مالک تھے۔

کبھی کسی موضوع پر کسی سے اختلاف ہوتا یا تلخی پیدا ہوجاتی تو خاموشی اختیار کرلیتے، ان کا غصہ یا ناراضگی ایک بلبلہ سطح آب ثابت ہوتا۔ ازخود پہل کرتے غلط فہمیوں کا ازالہ کرتے اور پھر شیر وشکر ہوجاتے۔

نصرت کا حلقہ احباب بہت وسیع تھا۔ جس میں ایک محنت کش اور غریبوں سے لے کر دولت مند، برسراقتدار عہدہ دار، سیاسی لیڈرس سب ہی شامل تھے۔ یہی وجہ تھی کہ غرض مند انھیں گھیرے رہتے کہ وہ ان کی سفارش کرکے ان کے رکے کام کروادیں اور نصرت بلاتکلف سفارش کرتے اور ان کا کام بہرحال کروادیتے۔ وہ ہر ایک سے بلاامتیاز عہدہ ورتبہ بڑے خلوص اور برابری سے پیش آتے اور ہر کوئی نہ صرف ان سے محبت اور خلوص رکھتا بلکہ بہ الفاظ دیگر ان کا گرویدہ ہوجاتا اور یہ سمجھنے پر مجبور ہوجاتا کہ وہ ان سے بے حد قریب اور بااعتماد و حلقہ احباب میں شامل ہے۔

پرانے شہر کا محلّہ مغل پورہ ہر اعتبار سے تاریخی عوامل کا حامل رہا ہے۔ یہ سرزمین کیفی، صفی، تاج، جہاندار، بافع، بشیر انور، حسن علی کی سرزمین ہے اسی سرزمین نے بڑے بڑے انقلابات، تحریکیں اور کارہائے نمایاں برپا کیے ہیں۔ شرفائے وقت کی یہ سرزمین نوجوانوں اور طالب علموں کے لیے سرچشمہ وجدان رہی ہے۔ یہ سرزمین عوامی، سماجی، ادبی تہذیبی سرگرمیوں کے علاوہ ہندو مسلمان کے اتحاد، یکجہتی اور بھائی چارہ کا گہوارہ رہی ہے۔ یہیں سے نصرت محی الدین عوامی خدمات کا جذبہ لے کر اٹھے اور تادم مرگ اپنے مقصدِ حیات میں مصروف رہے۔

جشن آزادی ہو کہ جشن جمہوریہ ہر دونوں مواقع پر بالخصوص اس سرزمین پر بڑی گہما گہمی رہا کرتی۔ یہاں جشن کا ایسا ماحول پیدا ہوتا کہ سارے شہر میں اس کی دھوم رہتی۔ محلے کے بزرگ بلا امتیاز مذہب، نوجوان، طالب علم اور خواتین کی بھیڑ قومی پرچم کشائی کے وقت جمع رہتی۔ آزادی کے ترانے گائے جاتے، حب الوطنی کے دل کش مرقع پیش کیے جاتے۔ غرض اپنے وطن عزیز سے اٹوٹ وابستگی کے عہد و پیمان کیے جاتے۔

نصرت محی الدین کے لیے تعصب اور فرقہ پرستی ہمیشہ باعث تشویش رہی اور اس کو ملک کی آزادی اور جمہوریت کے لیے نقصان خیال کرتے تھے اور لوگوں میں اتحاد، باہمی اعتماد، بھائی چارہ اور یگانگت کو فروغ دینے کے لیے کوشاں رہا کرتے تھے۔ وہ بالخصوص اردو زبان وادب کے فروغ کے لیے کی جانے والی ہر جمہوری تحریک کے ہراول دستے میں شامل رہا کرتے تھے۔

نصرت محی الدین کے لیے تعصب اور فرقہ پرستی ہمیشہ باعث تشویش رہی اور اس کو ملک کی آزادی اور جمہوریت کے لیے نقصان خیال کرتے تھے اور لوگوں میں اتحاد، باہمی اعتماد، بھائی چارہ اور یگانگت کو فروغ دینے کے لیے کوشاں رہا کرتے تھے۔ وہ بالخصوص اردو زبان و ادب کے فروغ کے لیے کی جانے والی ہر جمہوری تحریک کے ہراول دستے میں شامل رہا کرتے تھے۔

جب ریاست آندھرا پردیش میں پی وی نرسمہا راو وزیر تعلیم تھے، ریاست میں صرف تلگو اور انگریزی میڈیم کے جونیر کالجوں کے قیام کے احکامات جاری ہوئے، اردو میڈیم کے جونیر کالجوں کے قیام کی ضرورت کو یکسر نظر انداز کردیا گیا تھا۔ نصرت محی الدین نے اس کے خلاف اپنی تنقیدی اور احتجاجی آواز بلند کی اور حکومت کو 'طلبہ و نوجوانوں کی بھوک ہڑتال' احتجاج کے آگے اپنے فیصلہ میں اردو میڈیم کے جونیر کالجوں کے قیام کی گنجائش رکھنے پر مجبور کردیا تھا۔ ان کے پرامن احتجاج ہی کا نتیجہ رہا کہ حکومت نے اردو میڈیم کے جونیر کالجز کے قیام کے احکامات جاری کیے۔

محلّہ مغل پورہ میں جہاندار افسر، بشیر انور، مجتبیٰ حسینی، حسن بافع، حسن علی جیسے سینئر نوجوانوں نے ہر سال دو سال بعد یوتھ فیسٹول کی داغ بیل ڈال رکھی تھی۔ فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی صورت حال کو بگڑتے ہوئے دیکھ کر 1969 کے ماہ ستمبر میں یوتھ فیسٹول کے انعقاد کا فیصلہ کیا گیا تا کہ ہندو مسلم طالب علموں اور نوجوانوں کو یکجا کیا جاسکے۔ نصرت محی الدین اس فیسٹول کی تیاری کمیٹی کے جنرل سکریٹری منتخب کیے گئے جب کہ سابق وزیر داخلہ نواب میر احمد علی خان کو صدر نشین بنایا گیا۔

یہ یوتھ فیسٹول کی تقاریب کوئی ایک ہفتہ تک جاری رہیں۔ ہندو مسلم نوجوانوں اور طالب علموں کی ایک بڑی تعداد نے مختلف کھیل کود کے مقابلوں میں حصہ لیا اور انعامات حاصل کیے۔ فیسٹول کا آغاز حسین ساگر کٹہ سے عابڈز چوراہے تک سائیکل ریس سے ہوا پھر عابڈز سے چارمینار تک دوڑ کا آغاز ہوا۔ ان دونوں مقابلوں کو نواب صاحب نے جھنڈی دکھائی اور خود کو ایک کھلی جیپ میں سوار ریس اور دوڑ کی قیادت ونگرانی کرتے رہے تھے۔ بعد ازیں دن میں مغل پورہ پلے گراؤنڈ، حافظ ڈنکا میدان اور دیگر پلے گراؤنڈز میں آوٹ ڈور اور ان ڈور گیمس کا آغاز ہوا تھا۔ غرض اس فیسٹول کے انعقاد نے ہندو مسلم نوجوانوں کو ایک بار موقع فراہم کردیا کہ وہ اپنی غلط فہمیوں کو دور کرکے آپسی میل ملاپ بھائی چارہ، قومی یکجہتی کو فروغ دیں۔

اس فیسٹول کی گہما گہمی اور شہرت نے سرزمین مغل پورہ میں قومی یگانگت کا ایک جشن سا ماحول پیدا کردیا تھا۔ دورانِ فیسٹول مختلف نوجوانوں کی تنظیموں کے سربراہ، سیاسی وسماجی قائدین اور کارکن جس میں مخدوم محی الدین، راج بہادر گوڑ، کے ایل مہندرا، امورک رام، کے علاوہ کے ایم خاں، جاوید قادری، غلام غوث خاں، منوہر راج سکسینہ ایڈوکیٹ و دیگر بے شمار عوامی نمائندے اس فیسٹول کے مشاہدہ کے لیے آتے رہے۔ رات میں مال والا پیلس، دیوڑھی احمد علی اور جاوید ماڈل اسکول میں مشاعرے کلچرل پروگرامس کا انعقاد عمل میں آیا کرتا تھا۔

■

Masood Fazli, Head Anjuman Urdu Azeemtar Hyderabad, Mughalpura - 232302 (AP)

رحمٰن عباس

خاموش طبیعت افسانہ نگار کی موت

علی امام نقوی اردو فکشن کی ایک سنجیدہ اور گراں قدر آواز تھی جو 10 مارچ 2014 کو ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگئی۔ 9 مارچ کی شب سے ہی ان کے سینے میں ہلکا ہلکا سا درد ہونے لگا تھا جس کے سبب انھیں سانس لینے میں دشواری بھی ہو رہی تھی۔ فجر کی نماز کے بعد طبیعت کچھ بحال ہوئی لیکن پھر دوبارہ گیارہ بجے کے آس پاس سانس لینے میں تکلیف ہونے لگی۔ گھر کے افراد نے فوراً فیملی ڈاکٹر سے رابطہ کیا۔ ان کے دیرینہ دوست شمیم عباس کو مطالعہ کیا گیا۔ وہ بھی چند منٹوں میں علی امام کے گھر پہنچ گئے۔ ڈاکٹر نے انجکشن لگایا اور فوری طور پر جو کچھ کیا جاسکتا تھا کیا لیکن کوئی خاص فرق نہیں پڑا۔ علی امام نقوی کی حالت بدستور بگڑتی جارہی تھی۔ سانس لینے کی تکلیف کو بڑھتا ہوا دیکھ کر ڈاکٹر نے آکسیجن مہیا کرنا اشد ضروری سمجھا اور انھیں اسپتال بھی داخل کرنے کا مشورہ دیا۔ ایمبولنس بلائی گئی۔ اہل وعیال ایمبولنس کا انتظار کر رہے تھے کہ اسی دوران علی امام نقوی کا جسم سرد پڑنے لگا۔ ان کی چوڑی پیشانی پر پسینے کے ٹھنڈے قطرے جمع ہوگئے۔ چند منٹوں بعد علی امام نقوی نے دنیا کو خیرباد کہہ دیا۔

علی امام نقوی ایک خاموش طبیعت، پرہیزگار، حد درجہ کم گو اور اصول پسند آدمی تھے۔ 1970 کے بعد افسانہ نگاروں کی جو تازہ دم نسل سامنے آئی تھی جس نے ترقی پسندی اور جدیدیت کی ادبی روایت کی مثبت اقدار کو قبول کرتے ہوئے حقیقت پسند افسانے کو اپنے لب ولہجے میں برتنے کوشش کی علی امام اس نسل کے نمائندہ افسانہ نگار تھے۔ سلام بن رزاق کے مع جب میں قریب 1 بجے ان کے فلیٹ پر پہنچا علی امام کا جسد خاکی نگاہوں کے سامنے تھا۔ میری آنکھیں ڈبڈبائیں۔ شمیم عباس ایک طرف کھڑے رو رہے تھے۔ سلام بن رزاق بھی علی امام کے دیرینہ دوستوں میں سے ایک تھے۔ انھیں بھی اس خبر سے بہت صدمہ پہنچا تھا۔ علی امام کے خاموش چہرے کو دیکھنے کی طاقت ان میں بھی نہیں تھی۔ ہم دونوں شمیم عباس کو فلیٹ سے باہر لے آئے۔ سلام بن رزاق نے شمیم عباس کو دلاسا دیا لیکن میں یہ محسوس کر رہا تھا دلاسے کی ضرورت خود سلام بن رزاق کو بھی ہے۔ دونوں لفٹ کے پاس کھڑے رہے۔ کچھ لوگ بھی آگئے۔ میں ایک بار پھر کمرے میں گیا۔ علی امام کا چہرہ پرنور تھا۔ جو خاموشی گذشتہ بیس بائیس برسوں سے ان کے چہرے پر سایہ فگن تھی اب بھی وہی خاموشی ان کے چہرے پر محسوس ہو رہی تھی بلکہ کچھ نکھر گئی تھی۔

ابتدا میں ان (علی امام) کے فسانے اور مضامین مقامی اخبارات میں چھپتے رہے، لیکن ماہنامہ 'شاعر' میں ان کے افسانہ 'کھلتے ہوئے بل' کی اشاعت کے ساتھ ان کی ادبی زندگی کا باقاعدہ آغاز ہوتا ہے

علی امام کی پیدائش 9 نومبر 1945 میں ہوئی تھی۔ ان کے والد امیر حیدر خوش حال اور کاروباری شخص تھے لیکن بچوں کی اعلی تعلیم سے انھیں کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ علی امام میٹرک سے آگے تعلیم حاصل نہیں کر سکے اور والد کے کاروبار سے جڑ گئے۔ والد کے رویے میں حد درجہ سختی کے سبب علی امام نے اپنے لیے الگ راستے کا انتخاب کیا۔ علی امام نے ایرانی کانسلٹ میں بطور کلرک مستقل ملازمت سے پیشتر کئی برسوں تک بطور ڈرائیور ملازمت کی۔ زندگی کے بڑے بڑے تلخ تجربات سے علی امام کا سابقہ رہا۔ تلخ تجربات کے اس عرصے میں بھی وہ پاگلوں کی طرح فکشن کا مطالعہ کیا کرتے تھے۔ ان کو کتابوں میں غرق دیکھ کر لوگ باگ حیران ہو جاتے تھے، وہ جہاں رہتے جس حال میں رہتے ان کی آنکھیں کتابوں میں گڑھی رہتیں۔ بہت ممکن ہو ان کے لیے فکشن کا مطالعہ زندگی کی سنگلاخی کو قابل برداشت بنانے کا ایک وسیلہ ہو۔ البتہ مطالعے کے اس جنون نے چند برسوں بعد علی امام کو ایک اہم فکشن رائٹر میں بدل دیا۔ معاشی اور سماجی زندگی کی کافرانہ سفاکی، خانگی اور گھریلوں زندگی کی تلخی اور عدم اعتباری کے ماحول میں کہانیوں کے مطالعے نے علی امام کی ذات میں موجود کہانی کار کو ایک صورت عطا کی۔ علی امام کی فکشن اور ادب سے بے پناہ محبت ان کو انور خان، حفیظ آتش، انور قمر، الیاس شوقی، ساجد رشید، مشتاق مومن اور دیگر فکشن نگاروں اور ادب کے متوالوں کے قریب لے گئی۔ بمبئی میں ان لکھنے والوں کی صحبتوں میں علی امام کی جوانی گزری۔ علی امام میں ایک فطری کہانی کار موجود تھا جس کی تربیت میں مطالعے کا جنون اور دوستوں کے ساتھ مباحث کا نمایاں رول ہے۔ علی امام افسانوی منظرنامے پر 1970 کے آس پاس ابھرے۔ ابتدا میں ان کی کہانیاں اور مضامین اخباروں میں شائع ہوئیں۔ الیاس شوقی نے اپنے مضمون '1970 کے بعد اردو افسانہ ممبئی میں' میں لکھا ہے: 'ابتدا میں ان (علی امام) کے فسانے اور مضامین مقامی اخبارات میں چھپتے رہے، لیکن ماہنامہ 'شاعر' میں ان کے افسانہ 'کھلتے ہوئے بل' کی اشاعت کے ساتھ ان کی ادبی زندگی کا باقاعدہ آغاز ہوتا ہے۔'

علی امام کے افسانوں میں انسانی رشتے اور معاشرتی حالات کلیدی رول ادا کرتے ہیں۔ علی امام مکھوٹوں کو ہٹانے میں مہارت رکھتے ہیں اور ساتھ ہی

ساتھ وہ کردار میں کوئی ایسا پہلو ضرور تلاش کرتے ہیں جس کی روشنی میں انسانی نفس کی مہین پرتوں کو سمجھنا زیادہ آسان ہو جاتا۔ ایسے افسانوں میں 'خواہش معصوم'، 'لقا کبوتر'، 'گیندے کے پھول'، 'کہی ان کہی'، 'سچ مچ'، 'موسم'، وغیرہ شامل ہیں۔ فسادات کے پس منظر میں ان کا افسانہ 'ڈونگرواڑی کے گدھ' بے حد مقبول ہوا۔ فسادات کی بربریت یوں بھی ان کا محبوب موضوع ہے جس کی آنچ ان کی بیشتر دوسری کہانیوں میں دیکھی جا سکتی ہے۔ 'خواہش معصوم'، 'لقا کبوتر' اور '13 اگست 1980' میں بھی فسادات کی آنچ موجود ہے۔ دوسری طرف 'ڈونگرواڑی کے گدھ' میں جو رمز ہے وہ ان کی ایک خوبی ہے۔ وہ باتوں کو ہمیشہ پوری طرح کھول کر پیش کرنے کے بجائے جانے پہنچانے ماحول میں بغیر کسی چیستان کے کچھ لطیف اشاروں میں اپنی بات کی گہرائی کو چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایسے افسانوں میں 'بنگالی ہاؤس کی منی'، 'خواہش معصوم'، 'لقا کبوتر'، 'ہونی ان ہونی'، 'تشخیص'، 'جگاڑ'، 'بازگشت'، 'اور ایک دن'، 'مسیحائی' وغیرہ شامل ہیں۔

علی امام کا پہلا افسانوی مجموعہ 'نئے مکان کی دیمک' (1980) میں، دوسرا مجموعہ مباہلہ (1988) میں، تیسرا مجموعہ 'گھٹتے بڑھتے سائے (1993) میں، چوتھا مجموعہ 'موسم عذابوں کا' (1998) میں اور آخری مجموعہ 'کہی ان کہی' (2012) میں شائع ہوا۔ علی امام کے افسانوں میں خانگی اور معاشرتی رشتوں کے مختلف پہلو، سماجی وسیاسی صورت حال اور اس صورت حال کا افراد کی زندگیوں پر اثر عام رجحان ہے۔ کئی افسانوں میں سیاسی، تہذیبی اور اقداری مسائل کو انھوں نے موضوع بنایا ہے۔ علی امام کی کہانیوں میں انور خان، مشتاق مومن اور ساجد رشید کی طرح ممبئی کی معاشرت کے زائیدہ کردار ہیں جو اپنی مٹی بھر زندگی کی کیفیات کو اپنے لب و لہجے میں پیش کرتے ہیں۔ علی امام کی کہانیوں میں کردار کی زبان اور اس کی کلچرل شناخت کا بہت پاس دکھائی دیتا ہے۔

علی امام نے مذکورہ افسانوی مجموعوں کے علاوہ ایک ناولٹ 'تین بتی کے راما' (1991) میں لکھا اور ایک ناول 'بساط' (2000) کے عنوان سے شائع کیا۔ 'تین بتی کے راما' پارسی گھرانوں میں ملازمت کرنے والے لڑکوں، مراٹھی نوکرانیوں اور نادار لوگوں کے روزمرہ کی ایک تصویر ہے۔ 'تین بتی کے راما' کا سب سے کامیاب کردار 'سکو' ہے۔ 'سکو' ایک مفلس مہاراشٹرین عورت ہے جس کی معاشی، جذباتی اور جنسی زندگی میں کئی پیچ ہیں۔ عشق اور جسم کی آگ کے درمیان اس کی روح برہنہ ہو چکی ہے۔ 'سکو' کامیابی سے اپنے طبقے کی عورتوں کی کسمپرسی، محرومیوں اور استحصال کی نمائندگی کرتی ہے۔ علی امام نے 'سکو' کے گھریلوں اور معاشی مسائل کے ساتھ ساتھ اس کی ذات کے کئی وسوسوں کو بھی پیش کیا ہے۔ دوسری طرف علی امام نے اس ناولٹ میں بمبئی کی بولی ٹھولی کو برتنے کی اچھی کوشش کی ہے۔ 'تین بتی کے راما' میں امیر پارسی افراد کی زندگی، عیاشی، خانگی رشتوں کی پستی کے ساتھ ساتھ ایسے افراد بھی دکھائی دیتے ہیں جن کے اندر انسانیت زندہ ہے، جن کے دلوں میں دوسروں کے لیے ہمدردی موجود ہے۔ 'تین بتی کے راما' ایک سماجی منظرکشی بھی ہے اور طبقاتی تقسیم کی پیداوار بھی ہے اس لیے اس ناولٹ پر کرشن چندر کے اسلوب کا گمان بھی ہوتا ہے۔

علی امام کا ناول 'بساط' سیاست اور خانگی رشتوں کی کہانی بیان کرتا ہے۔ یہ ناول کشمیر کے سیاسی مسئلہ کو پیش کرنے کی کوشش ہے لیکن کشمیر کے مسئلے پر یہ براہِ راست ناول نہیں ہے۔ مسئلۂ کشمیر کی پیچیدگی، اس مسئلے کی پیدا کردہ ہولناکی اور سہ جہت تشدد کی طویل تاریخ کے سبب پیدا انسانی کرائسس کی شدت کو ناول بیان نہیں کر سکا۔ یہ ناول کسی طرح علی امام کی صلاحیتوں کا عکاس نہیں ہے۔ اس کے باوجود اس ناول میں علی امام نے روای کے طور پر ممبئی کے اس ادبی ماحول کو بیان کیا ہے جس میں ان کی تخلیقیت پروان چڑھی تھی۔ بڑی مہارت سے علی امام نے اس ناول میں انور خان، حفیظ آتش، ساجد رشید اور دیگر دوستوں کی صفات اور کردار کو پیش کیا ہے۔ بہت ممکن ہے کل علی امام کی سوانح لکھنے والوں کے لیے اس ناول کا کچھ حصہ کام آئے۔

> **علی امام جتنے اچھے فکشن رائٹر ہیں اس سے کئی درجہ بلند انسان تھے۔ ان کی شخصیت ایک خاموش سمندر تھی۔ مزاج میں اصول پسندی کے سبب پیدا ہونے والی سنجیدگی تھی جو چہرے پر عیاں تھی۔ نئے لکھنے والوں کی تخلیقات شوق سے پڑھتے، کوئی تحریر پسند آتی تو فون کر کے مبارک باد دیتے۔ دل شکنی یا تلخ کلامی سے کبھی کام نہیں لیتے تھے**

علی امام جتنے اچھے فکشن رائٹر ہیں اس سے کئی درجہ بلند انسان تھے۔ ان کی شخصیت ایک خاموش سمندر تھی۔ مزاج میں اصول پسندی کے سبب پیدا ہونے والی سنجیدگی تھی جو چہرے پر عیاں تھی۔ نئے لکھنے والوں کی تخلیقات شوق سے پڑھتے، کوئی تحریر پسند آتی تو فون کر کے مبارک باد دیتے۔ دل شکنی یا تلخ کلامی سے کبھی کام نہیں لیتے تھے۔ پڑھنے کی تلقین کیا کرتے اور جو پڑھنے کا شوق رکھتا انھیں کتابیں بھی مہیا کرتے۔ علی امام کے مزاج میں ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ خوشامد پسندی اور مصلحت پسندی کے سخت خلاف تھے۔ اپنی تخلیقات پر بات چیت کرنے سے ہمیشہ گریز کرتے۔ اگر کوئی بات کرنا چاہتا تو روک دیتے۔ میری ان سے بے حد قربت تھی۔ اس کے باوجود میں نے جب دوردرشن کے لیے ان کا انٹرویو کرنا چاہا تو کسی طرح تیار نہیں ہوئے۔ حالانکہ انھیں اس بات کی شکایت تھی کہ نقادوں نے ان کی فن کاری پر کوئی بات نہیں کی۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو کہ وہ نقادوں کو اپنے تحریروں پر لکھنے کے لیے خوشامد کر کے تیار کرنے کے خلاف تھے جبکہ ہمارے نقاد اس وقت تک کسی فن کار پر قلم نہیں اٹھاتے جب تک فن کار ان کی 'گڈ بک' میں اپنے لیے جگہ نہ بنا لے۔ علی امام بہت خوددار قسم کے انسان تھے۔ انھیں ایسی 'گڈ بک' میں رہنا کسی طور منظور نہیں تھا۔ وہ تخلیقی فن کار تھے اور فن کاری پر اعتماد کرتے تھے۔ ان کی زندگی میں اوبڑ کھابڑ راستے کا سفر زیادہ رہا اور فرصت بہت کم رہی۔ بیسویں صدی کی آخری دہائی میں دو بار ہارٹ اٹیک برداشت کر چکے تھے۔ دل پر نوجوانی سے بہت بوجھ تھا شاید اسی لیے ان کا دل بہت کمزور ہو گیا تھا۔ یہاں دو تین برسوں سے علی امام موت کی خواہش کا اظہار کیا کرنے لگے تھے۔ زندہ رہنے کے عمل سے ان کا دل بھر گیا تھا۔

10 مارچ کی دوپہر جب انھیں سانس لینے میں شدید تکلیف ہو رہی تھی۔ وہ دو گھنٹے اس کیفیت سے گزرتے رہے لیکن اس دوران ان کی زبان سے ایک حرف بھی ادا نہیں ہوا۔ خاموشی سے اپنی سانس کی طناب کو ٹوٹتے ہوئے دیکھتے رہے۔ یہ شکست علی امام کی نہیں تھی۔ یہ شکست اس زندگی کی تھی جس میں کبھی انھوں نے بہت اعتقاد کیا تھا۔

■

Rahman Abbas, 204/A, Poonam Park
Near Haider Chowk, Mira Road
Thane - 401104 (M.S.)

ادارہ

علی جواد زیدی
فن اور شخصیت

مشہور شاعر، ادیب، نقاد، صحافی اور منتظم، علی جواد زیدی ہمہ جہت شخصیت کے حامل تھے۔ لیکن ادب میں انھیں ان کی شاعری کی بدولت شہرت ملی ہے۔ پہلے وہ صابر تخلص کرتے تھے لیکن بعد میں پتہ نہیں کیوں انھوں نے یہ تخلص چھوڑ دیا اور شروع میں جرم محمد آبادی سے اصلاح لینے کے بعد اشعار پر اصلاح کا سلسلہ بھی ترک کردیا۔ وہ 10 مارچ 1916 کو محمد آباد ضلع اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے۔

ان کی تعلیم کا سلسلہ 1921 سے شروع ہوا جب وہ صرف پانچ سال کے تھے۔ اُسی سال ان کی بسم اللہ ہوئی اور انھیں مکتب میں داخل کیا گیا۔ زیدی بسم اللہ سے قبل ہی گھر پر بغدادی قاعدہ ختم کرچکے تھے۔ اُن کے والد جناب علی امجاد صاحب افسر ان کو عالم دین بنانا چاہتے تھے اور اس مقصد کے تحت 1927 میں جب علی جواد زیدی صرف گیارہ سال کے تھے، ان کے والد نے انھیں مدرسۂ ناظمیہ لکھنؤ میں داخل کرادیا۔ یہیں لکھنؤ یونیورسٹی سے انھوں نے بی اے اور ایل ایل بی کی ڈگریاں حاصل کیں۔

علی جواد زیدی نے پیشہ کی ابتدا وکالت سے کی۔ انھوں نے اعظم گڑھ اور غازی پور میں وکالت کی ابتدا کی۔ اُس کے بعد چند برسوں تک سشن عدالت میں اقبال سہیل صاحب کے جونیئر کی حیثیت سے وابستہ رہے۔ اور پھر 1947 میں ملک کی آزادی کے بعد محکمۂ اطلاعات، حکومت اتر پردیش سے وابستگی اختیار کی۔ یہ ملازمت کانگریسی لیڈر کیشو دیو مالویہ کے توسط سے ملی جو اس وقت پارلیمنٹری سکریٹری تھے۔ یہاں اُن کی ادارت میں رسالۂ اطلاعات نکلا جس میں صرف پریس نوٹ چھپتے تھے۔ علی جواد زیدی نے 'اطلاعات' کو باقاعدہ ایک ادبی رسالہ بنا دیا اور اُسے 'نیا دور' کا نام دیا۔ یہ رسالہ آج تک جاری ہے۔ حکومت ہند کے پبلک سروس کمیشن کے لیے اُن کا انتخاب جنوری 1956 میں ہوا اور 1957 میں وہ ڈپوٹیشن پر ریاست جموں و کشمیر پہنچے اور اُس وقت وہاں کے وزیر اعلیٰ بخشی غلام محمد کے پبلک ریلیشن آفیسر مقرر ہوئے۔ کشمیر میں انھوں نے اکادمی آف آرٹس کلچر اینڈ لینگویجز قائم کی جس کا قیام زیدی کی کوششوں اور بخشی غلام محمد صاحب کی دلچسپی کا مرہون منت تھا۔ اس اکادمی کے تحت انھوں نے ایک معیاری ادبی رسالہ 'شیرازہ' جاری کیا۔ 1962 میں وہ دلّی واپس آگئے۔ اس کے بعد ڈھائی برس کے لیے ممبئی میں 1967 کے دوران ڈپٹی پرنسپل انفارمیشن آفیسر برائے مہاراشٹر، گجرات و گوا میں مامور ہوئے۔ پھر دلّی واپس آنے کے بعد ڈپٹی ڈائرکٹر جنرل نیوز آل انڈیا ریڈیو ہوئے اور پھر اُسی زمانہ میں گجرال کمیٹی کے ممبر جوائنٹ سکریٹری کی حیثیت سے وہ اردو زبان کی اصل صورت حال کا جائزہ لینے کے لیے پورے ہندوستان کے دورے پر نکل گئے۔ جون 1975 سے جولائی 1978 تک تین سال آل انڈیا ریڈیو کے خصوصی نمائندہ کے طور پر مغربی ایشیا میں مقیم رہے۔ جہاں ان کا ہیڈکوارٹر تہران (ایران) تھا لیکن ساتھ ہی ساتھ یمن، عمان، بحرین، قطر، شارجہ، افغانستان، کویت، دوبئی، ابوظہبی، لبنان و سعودی عربیہ وغیرہ بھی گئے۔ 1970 میں اُن کو انگلستان، فرانس، امریکہ، کناڈا، جاپان، ہانگ کانگ اور سنگاپور جانے کا بھی موقع ملا۔

اکادمی آف آرٹس کلچر اینڈ لینگویجز کشمیر

علی جواد زیدی کی شادی پہلے اُن کی پھوپھی زاد بہن سے طے تھی۔ لیکن یہ شادی نہ ہوسکی کیونکہ عین اُس وقت جب دلہن مانجھے بیٹھ چکی تھی، سیاسی سرگرمیوں کی بنا پر زیدی کے نام گرفتاری کا وارنٹ جاری ہوگیا۔ چنانچہ انھوں نے اپنے گھر والوں سے شادی ملتوی کردینے کو کہا۔ اُن کی والدہ کو یہ بات بہت ناگوار گزری۔ بہرحال اُن کی شادی منقطع ہوگئی۔ دلہن چونکہ مانجھے بیٹھ چکی تھی اس لیے اس کی شادی کسی دوسری جگہ کردی گئی۔ جب زیدی جیل سے چھوٹے تو ایل ایل بی کے بعد اُن کی شادی الہ آباد میں سید محمد جواد صاحب کوتوال کی صاحب زادی شہناز بیگم سے 21 ستمبر 1943 کو ہوئی۔ زیدی کثیر الاولاد تھے۔ اُن کے تین بیٹے اور چار بیٹیاں ہیں۔

علی جواد زیدی کی ادبی زندگی کا آغاز ان کے بچپن سے ہی ہوگیا تھا جب وہ تقریباً گیارہ برس کے تھے۔ ان کے ماموں کو ان کے بعض شعر سن کر تعجب ہوا اور بطورِ

امتحان انھوں نے زیدی کو علی میاں کامل کا ایک مصرعہ دیا۔ زیدی نے شام تک اس پر چار پانچ شعر کہہ دیے۔ ان کے والد جناب سید علی امجاد صاحب بھی شاعر تھے اور افسر تخلص کرتے تھے۔ لہٰذا ادبی و شاعرانہ ماحول میں زیدی کی پرورش ہوئی۔ ادب سے شغف ان کے لیے فطری بات تھی۔ بارہ برس کی عمر میں انھوں نے ایک نعتیہ قصیدہ کہہ کر جلسے میں پڑھا۔ یہ قصیدہ بعد میں رسالہ 'المصطفیٰ' جونپور میں شامل اشاعت ہوا۔ زیدی نے شاعری میں باقاعدہ کسی کی شاگردی اختیار نہیں کی۔ شعرا اور ادبا کی صحبتوں اور محفلوں سے فیض ضرور حاصل کیا اور یہی صحبتیں اُن کی اصلی تربیت گاہیں تھیں۔ تین شعرا کو اُن کا بے قاعدہ استاد کہا جاسکتا ہے۔ ان میں جرم محمد آبادی، عزیز لکھنوی اور آرزو لکھنوی شامل ہیں۔ ان میں جرم محمد آبادی سے محاسن شاعری کا علم ہوا۔ عزیز لکھنوی کو بھی کچھ غزلیں دکھائیں ہاں آرزو لکھنوی سے انھوں نے مسلسل مشورہ سخن کیا۔ بہرحال آگے چل کر انھوں نے بحیثیت شاعر بھی کافی شہرت حاصل کی۔ شاعری میں اُن کا رجحان ترقی پسندی کی طرف تھا لیکن جیسا کہ پہلے عرض کیا جاچکا ہے، وہ شاعری یا ادب کو کمیونسٹ سیاسی نظریات کا پروپیگنڈا بنانے کے قائل نہیں تھے۔ اُن کا دور جدوجہد آزادی کا دور تھا۔ انگریزوں کی مخالفت آزادی کی اہمیت اور حصول آزادی اُس وقت کی شاعری کے اہم ترین موضوعات تھے۔ چنانچہ ان کی شاعری اور نظموں کے موضوعات میں یہ شامل رہے۔

شاعر کی حیثیت سے انھوں نے غزل، نظم، قصیدہ، مرثیہ تقریباً ہر صنفِ سخن پر طبع آزمائی کی لیکن نظم میں دوسری اصناف کے مقابلے زیادہ کامیابی ملی اس کی وجہ کچھ تو اس زمانے کے حالات تھے اور کچھ اُن کی ذاتی دلچسپی بھی تھی۔ آزادی کی جدوجہد کے سبب اُس زمانے میں انقلابی شاعری کا زور زیادہ تھا۔ دوسرے وہ اشتراکی نظریات پر عقیدہ رکھتے تھے اور ان کا جھکاؤ ترقی پسندی کی طرف زیادہ تھا۔ وہ ایک مجاہد آزادی بھی تھے لہٰذا صحافت سے دلچسپی ہونا اُن کے لیے ایک فطری بات تھی۔ وہ سیاسی انقلاب کے حامی تھے۔ انگریزوں کے خلاف جدوجہد میں شامل تھے۔ لہٰذا صحافت کو انھوں نے اس لڑائی میں ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کیا۔ وہ اپنے انقلابی خیالات کو اخبارات اور اپنے لکھے ایڈیٹوریل کے ذریعے ظاہر کرتے تھے۔ تحقیق میں ان کا سب سے بڑا کارنامہ 'قصیدہ نگاران اترپردیش' ہے۔ تحقیق میں اُن کی نظر بہت گہری تھی۔ وہ حقائق اخذ کرنے میں بڑی باریک بینی اور بصیرت اندیشی سے کام لیتے تھے۔ نثر میں اس کے علاوہ تنقید کے میدان میں بھی اُن کی قابل لحاظ خدمات ہیں۔ دوادبی اسکول، اُن کی ایک قابلِ قدر اور اہم تنقیدی تصنیف ہے۔

علی جواد زیدی نے خاکے بھی لکھے ہیں جن میں اُن کی کتاب 'ہم قبیلہ' ایک یادگار تصنیف ہے۔ وہ جس شخص کا خاکہ لکھتے تھے اُس کی مکمل شخصیت کو ابھار کر ہمارے سامنے پیش کردیتے تھے۔ انھوں نے کئی کتابوں کی ترتیب و تدوین کا فرض بھی انجام دیا اور اس میدان میں بھی اپنی ذمے داری کو پوری طرح نبھانے کی کوشش کی ہے۔ جہاں تک شعر و ادب و مختلف علوم کا تعلق ہے۔

انھوں نے کئی کتابوں کی ترتیب و تدوین کا فرض بھی انجام دیا اور اس میدان میں بھی اپنی ذمے داری کو پوری طرح نبھانے کی کوشش کی ہے۔ جہاں تک شعر و ادب و مختلف علوم کا تعلق ہے۔ انھیں ہر فن مولانا سمجھنا چاہیے۔ بہت کم علمی موضوع و مضامین ایسے ہوں گے جو ان کی دسترس سے باہر ہوں وہ فن کے جس شعبے میں بھی قدم رکھتے تھے اپنی متعلقہ ذمے داریوں کو پوری طرح نبھاتے تھے۔

انھیں ہر فن مولانا سمجھنا چاہیے۔ بہت کم علمی موضوع و مضامین ایسے ہوں گے جو ان کی دسترس سے باہر ہوں وہ فن کے جس شعبے میں بھی قدم رکھتے تھے اپنی متعلقہ ذمے داریوں کو پوری طرح نبھاتے تھے۔ تنقید و تحقیق میں اُن کو سب سے زیادہ دلچسپی تھی اور اس شعبے میں اُن کا ایک اہم مقام ہے۔ وہ ہر صنفِ ادب کے رموز و نکات سے اچھی طرح واقفیت رکھتے تھے۔ دیگر مصروفیات، جن میں بحیثیت سرکاری ملازم بھی اُن کی سرگرمیاں شامل ہیں، کے باوجود اس کے وہ لکھنے پڑھنے کے لیے وقت نکال لیا کرتے تھے جو بظاہر آسان نہیں معلوم ہوتا۔ اُن کی ہر قسم کی تصنیفات و تالیفات کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ فنی نقطۂ نظر سے اُن کی ہر تصنیف و تالیف کا معیار اعلیٰ ہے۔ اُن کی ہر تصنیف فن شعر و ادب کی کسوٹی پر پوری اترتی ہے۔ حکومت نے 1988 میں انھیں پدم شری کے اعزاز سے نوازا تھا۔

تصانیف:

(شاعری):

رگِ سنگ (1944)، میری غزلیں (1959)، دیارِ سحر (1960)، نسیم دشت آرزو (1982)، تیشہ آواز (1985)، سلسلہ (1990)، پارو: ایک منظوم افسانہ (2005(

(تنقید):

تعمیری ادب (1959)، تاریخ ادب اردو کی تدوین (1970) علمی مجلس نئی دہلی، طبع اوّل، تاریخِ ادب اردو کی تدوین (1983)، نصرت پبلشرز، لکھنؤ (3) دوادبی اسکول (1970) نسیم بک ڈپو لکھنؤ، طبع اوّل و نفیس بکڈپو، کراچی، پاکستان ایڈیشن، (1980)، نسیم بکڈپو، لکھنؤ طبع دوم، فکر و ریاض (1975)، کمال ابوالکلام (1989)

تحقیق:

ہندوستان میں اسلامی علوم کے مراکز (1972)، قصیدہ نگارانِ اترپردیش، (1978)، مثنوی نگاری (1975)، دہلوی مرثیہ گو جلد اوّل (1986)، دہلوی مرثیہ گو جلد دوم (1987)، میر انیس (1991)، تاریخ مشاعرہ (1992)

خاکہ نگاری:

آپ سے ملیے (1963)، ہم قبیلہ (1990)، اہل قبیلہ (2001)

تدوین:

پیام آزادی (1947)، نغمۂ آزادی (1957)، اردو میں قومی شاعری کے سو سال پہلا ایڈیشن (1959)، دوسرا ایڈیشن (1982)، انوارِ ابوالکلام (1959)، دیوانِ غنی کاشمیری (1964)، انیس کے سلام (1981)، انتخاب رند (1983)، سرود ہمسایہ (1985)، رباعیات انیس (1985)، مالک رام، ایک مطالعہ (1986)

ترجمے:

مہاتما گاندھی (انگریزی سے ترجمہ) 1986، دیوانِ شمس تبریز کی سیر (فارسی سے ترجمہ)

■

ماخذ: علی جواد زیدی (مونوگراف)، ساہتیہ اکادمی، مصنف: وضاحت حسین رضوی، فن و شخصیت کوائف نمبر۔

▪ علی جواد زیدی

انتخابِ کلام علی جواد زیدی

فیصلہ

چند روز، اور بھی گزرے، مری ہمراز، مگر
اب بھی دنیا ہے وہی، اور وہی عالم ہے
آج بھی زخمِ جگر طالبِ صد مرہم ہے
آستیں بہتے ہوئے اشک سے اب بھی نم ہے
راہ مسدود نہ ہو، پھر بھی بہت پُرخم ہے

———

خون تازہ رگِ ارماں سے ٹپکتا ہے ابھی
نشترِ غم دلِ دوراں میں کھٹکتا ہے ابھی
بادۂ ناب میں بھی زہر جھلکتا ہے ابھی
جادۂ جہل پہ انسان بھٹکتا ہے ابھی

———

کب تلک گنتے رہیں، ساعت ورقدومہ وسال
کب تلک روکے رہیں، دل کی طبیعت کا اُبال
تاکجے بُنتے رہیں آپ ہی اپنے لیے جال
تاکجے سُنتے رہیں صبر کے زرّیں اقوال

———

شیشۂ عقل پہ ہوتی ہے اُدھر بارشِ سنگ
سینۂ عصر میں گھٹتی ہے اِدھر دل کی امنگ
آزماتے ہیں یہاں زور جوانی کو تفنگ
اور جاری ہے وہاں حسرت و امید میں جنگ

———

ہم کو اصرار کہ ہم کیوں نہ ابھی وار کریں
خوں کا دریا ہے تو کیا تیر چلیں پار کریں
کوئی کہتا ہے اُدھر، ''دیکھ تو لو دو اک روز
تیرگی جائے گی نکلے گا مہ دہر فروز

تم ہو مجبور کہ اسلاف کا ورثہ ہے یہ سوز''
شوق کہتا تھا کہ وقفہ ہے یہ کافی دل دوز
سُن تو کیا تیرہ فضاؤں سے پیام آتے ہیں
باخبر! بادہ کشو! دور میں جام آتے ہیں
اور میں ظلم سے ہارا ہوا گھبرایا ہوا
ناتواں ہونے پہ بھی غیظ میں بل کھایا ہوا
نوجوانی کے حسیں زعم میں اترایا ہوا
جیسے بے تاج شہنشہ کو جلال آیا ہو
سوچتا تھا کہ خود اپنا ہی نشانہ بن جاؤں
کم سے کم دہر میں اک زندہ فسانہ بن جاؤں

(2)

چند روز اور بھی گزرے یوں ہی ہمراز، اگر
پھر مجھے شاعر و صناع نہیں پاسکتے
اس لیے کاش وہ آج اتنا ہی سمجھا سکتے

———

یہ جو گزری ہوئی صدیوں نے بنایا ہے طلسم
مکڑیوں ہی کا تو اک جال ہے زنجیر نہیں
اور یہ راہ میں کچھ دھندلے سے قدموں کے نقوش
بس عمارت کے نشانات ہیں تعمیر نہیں

———

میں بھی انسان ہوں، انسانوں کا خادم ہی نہیں
دیکھتا جاؤں یہ پُرہول تماشے کب تک
جنگ ہے حسرت تعمیر میں، لیکن آخر
میں اٹھاؤں گا تمناؤں کے لاشے کب تک

(3)

چند روز اور فقط چند ہی روز، اے توبہ!
مری ہمراز فریب اور کسی کو دینا
مجھ کو آتا نہیں تالاب میں کشتی کھینا
یہ سمندر مرا مؤاج سمندر، ہمراز
جس کے سینے پہ مچلتے ہیں سبک سیر جہاز
دے رہا ہے مجھے کیا جانیے کب سے آواز

———

آج ہی اے مری جاں ورنہ کبھی اور نہیں
زندگی غربت و افلاس کے آئینے میں
اپنا منہ دیکھے گی اور دیکھ کے تن جائے گی
سر اٹھائے گا نیا ولولہ ہر سینے میں
آج ہی اے مری جاں! ورہ کبھی اور نہیں

خودکلامی

میں نہ کہوں تو کون کہے گا؟
صحراؤں کے دکھ کی کہانی، ذروں کے مایوس فسانے
ارض و قمر کا دردِ جدائی بستیوں کے جگ مگ ویرانے
پتّی پتّی سوکھی ہوئی سی، گوشہ گوشہ اجڑا ہوا سا
بستی بستی گھائل سپنے، لاکھ شکاری، لاکھ نشانے
میں نے سمیٹے دامن دامن، کانٹوں میں مدفون تبسّم
دل نے بکھیرے صحرا صحرا، پھولوں کے محبوس ترانے
دیدۂ نسیاں نے بھی دیکھی، سوکھے دریاؤں کی روانی
چشمِ تمنا میں بھی ناچے، الجھے ہوئے غمگین زمانے
بے خود محفل کیا سمجھے گی، تشنہ لبوں نے کیا دیکھا
چھلکے ہوئے تو پھر بھی غنیمت لیکن یہ ٹوٹے پیمانے!
میں نہ کہوں تو کون کہے گا؟
میں نے بچپن بھی دیکھا ہے، ولولۂ فکر سرکش کا
یہ میری گودی میں کھیلی ہے، میں نے اسے چلنا سکھلایا
یہ روٹھی تو منایا میں نے، مچلی تو بہلایا میں نے
روئی تو گانا گایا میں نے، گرنے لگی تو میں نے سنبھالا
اس کی خاطر تتلایا ہوں، اور خود بچہ کہلایا ہوں
مہد سے محفل تک لایا ہوں، طفلی تا بہ شباب دانا
بات کرے گی سب سے چھپا کر، راز کہے گی کانوں میں جاکر
بھولی بنے گی باہر آکر، مصلحتوں کا ڈال کے پردا
جس پہ یہ سب بیتی ہو وہ جانے، اس پاگل دنیا کی کہانی
ڈوبنے والا ہی پائے گا، اس الٹی گنگا کا کنارا

میں نہ کہوں تو کون کہے گا؟
چھوٹی سی تھی دل کی انگنائی جس میں گھٹا دکھ درد جہاں کا
سانس جلی جب اندر دیکھا تیر لگا جب باہر جھانکا
تیر چلیں یا پتھر برسیں، دل جل جائیں، نظر پھنک جائے
پھر بھی کافر آس نہ ٹوٹے، حوصلہ تو دیکھو انسان کا
رام اور کرشن کی لے گونجے گی، سقراط و عیسیٰ اُٹھیں گے
شبیر و موسیٰ ابھریں گے، میں شک کرنے والا کہاں کا
انسانی اُمید کے نغمے، نانک اور گوتم چھیڑیں گے
گاندھی کی صورت دھارے گا، وقت کا تیور ترچھا بانکا!
آج بھی کوئی ہمت باندھے، اس سے الجھے اس کو ٹوکے
آج بھی کوئی ہنس کر کرے، استقبال غم و حرماں کا
میں نہ کہوں تو کون کہے گا؟
ایک بھیانک خاموشی میں، چند بچارا کھویا کھویا،
اک پیلی سی چادر اوڑھے، جاگا جاگا سویا سویا،
گھبرایا سا الجھا الجھا، ہانپ رہا ہے کانپ رہا ہے
اکثر شاید یہ بھی ہوا ہے، خود بھی رویا میں بھی رویا
جھوٹی محبت، جھوٹے ہی آنسو، عشق و محبت پہلو بہ پہلو
چاند! مگر پھر بھی تجھے بخشا، تو نے غبارِ غم بھی تو دھویا
تاریکی میں لپٹی دنیا، سہمی سہمی ڈول رہی ہے
ڈول رہی ہے، بول رہی ہے ''اب وہ کاٹو جو پہلے بویا''
میں نہ کہوں تو کون کہے گا، دنیا چھوٹی چاند بھی چھوٹا
یہ تاریکی فکر سحر ہے، یہ خاموشی اک لبِ گویا
میں نہ کہوں تو کون کہے گا؟

دوستی

ایسے ریگستان میں، جس میں کہیں سایہ نہیں
ریگ کے زینے بناتی ہے، گراتی ہے ہوا،
اور انھیں ذرّوں کو لے لیتی ہے اکثر گود میں
مادرانہ کاوشوں سے رقص کرنے کے لیے،
اور یہ ذرّے، ہم آہنگی کے ساتھ
کرتے ہیں تعمیر وہ اہرام گرد
جن میں ہے مدفون طوفانوں کی لاش
کیا یہ ذرّے کہہ سکیں گے بعد میں
ہم میں باہم دوستی ہے استوار؟
کل تو ہر ذرّہ کہے شاید یہ اپنے دوست سے
مل گئے تھے راستے میں، یوں ہی کچھ آوارہ گرد،
جن میں دردِ مشترک آوارگی!
اِن میں کیسی دوستی؟

قیدی کی لاش

(مہادیو دیسائی کی موت پر)
یہ کس نے لاش پھینک دی جوانیوں کی راہ میں؟
ابھی نمودِ زندگی بسی نہ تھی نگاہ میں
ابھی دریچۂ سحر کھلا نہ تھا،
ابھی فسونِ تیرگی مٹا نہ تھا،
سکوت میں زمانہ تھا،
ابھی گزر رہے تھے ہم، جوارِ رزمگاہ میں
یہ کس نے لاش پھینک دی جوانیوں کی راہ میں
یہ خوفِ اشک و آہ تھا
یہ شامِ غم کا عکس تھا، یہ ایک انتباہ تھا،
ستم گروں کے ترکشوں کا تیر تھا،
مگر براہِ مصلحت،
ابھی یہ سخت چٹکیوں کے پیچ میں اسیر تھا
کہ اب گزر رہے تھے ہم نمائشِ سپاہ میں
ہجوم اشک و آہ میں
یہ کس نے لاش پھینک دی جوانیوں کی راہ میں
ہمیں اسے کچل نہ دیں، ابھی یہیں
یہ روندنے کی چیز کیوں بنے امانتِ زمیں
نہیں، نہیں
بڑھے چلو، بڑھے چلو، کچل بھی دو
خزاں کا غنچہ ہے یہ لاش، ہاں اسے مسل بھی دو
یہ کس نے لاش پھینک دی جوانیوں کی راہ میں
یہ موت کا مجسمہ ڈرا رہا ہے دیر سے
لہو میں تربتر ہے سر سے پاؤں تک
جمے ہوئے لہو میں ہے، ترے ہی خون کی مہک
کوئی عزیز تو نہیں
مگر کٹے ہوئے سروں میں کچھ تمیز تو نہیں
کوئی بھی ہو عزیز ہے،
کہ اس جری نے جان دی ہے جشنِ رزمگاہ میں
یہ کس نے لاش پھینک دی جوانیوں کی راہ میں
یہ دور، اپنے آشرم کو چھوڑ کر
یہ اپنی ٹوٹی جھونپڑی سے اپنے منھ کو موڑ کر
یہ ظلم و جور کی بھری کلائیاں مروڑ کر
نکل پڑا،
اندھیری رات تھی مگر یہ چل پڑا،
کوئی بھی ہو عزیز ہے
کہ اس جری نے جان دی ہے جشنِ رزمگاہ میں

آغاز

افقِ شام پہ تارا سا جو تھراتا ہے
اک نئے دور کا آغاز نظر آتا ہے
اپنی منزل کی طرف وقت کھنچا جاتا ہے
کتنی پرکیف ہے اس گزرے ہوئے دن کی یہ شام
آنے والی، طرب انگیز سحر، کا پیغام
ایک مٹتا سا نظام، ایک ابھرتا سا نظام
دور ہے منزلِ مقصود مگر، ہے تو سہی
رہرووں کا کوئی معیارِ نظر ہے تو سہی
جرأت و عزم باندازِ سفر، ہے تو سہی
صبح اور شام کے مابین ہے اب ایک ہی رات
آج بیدار ہیں پھر عیش و طرب کے جذبات
جیسے یاد آئے یکایک کوئی بھولی ہوئی بات
بہکے بہکے سے ہیں کچھ میری خوشی کے انداز
جیسے اجڑی ہوئی بستی میں ہنسی کی آواز
جیسے سنسان بیابانوں میں بجتے ہوئے ساز
یوں ہیں مایوس نگاہوں میں تمناؤں کے خواب
جیسے مرجھائی ہوئی شاخ پہ اک تازہ گلاب
جیسے تعمیر کے سجدے میں پرانی محراب

غزلیں

یہ وہم ہے کہ جنوں ہے یہ لاگ ہے کہ لگن
کسی کا ذکر بھی آیا تو بڑھ گئی الجھن
یہ تجربوں نے بتایا کسی کا دوست نہ بن
مگر وہ زلف پریشان یار و صبح وطن
قیودِ فن میں کہاں گھر سکے گی روح سخن
کہ عشق ہی کوئی فن ہے، نہ زندگی کوئی فن
وفائے یار کو اے دل کہیں نظر نہ لگے
بہت ہی چست ہے اس جسم پر یہ پیراہن
وہ تیرے جلوۂ اوّل کی یاد کا عالم
گلاب جیسے کھلے ہوں کہیں چمن بہ چمن
جلا دیے ہیں سرِ شام آنسوؤں کے چراغ
خیالِ یار کی ہر رہگزار ہے روشن
فریب فکر تھی دستِ طلب کی کوتاہی
غرورِ ناز میں اس نے بچا لیا دامن
وہ تیری آنکھ کا جادو، وہ چھاؤں مژگاں کی
کماں بدوش، کمیں گاہ میں چھپا دشمن
وہ آندھیوں میں گھری غم کی زندگی اپنی
وہ خوشبوؤں میں بسی تیری رہگزر کی پون

◆

کم ظرف احتیاط کی منزل سے آئے ہیں
ہم زندگی کے جادۂ مشکل سے آئے ہیں
دل اک اداس صبح، نظر اک اداس شام
کیسے کہیں کہ دوست کی محفل سے آئے ہیں
زخمِ جبیں کے دیکھنے والو، خبر بھی ہے
ہم پیار لے کے کوچۂ قاتل سے آئے ہیں
آنسو بدل گئے ہیں تبسم میں بارہا
ہم راہِ غم میں ایسی بھی منزل سے آئے ہیں
چھیڑا تھا نوک خار نے لیکن گماں ہوا
تازہ پیام پردۂ محمل سے آئے ہیں

☆

منزلِ دل ملی کہاں ختم سفر کے بعد بھی
رہگزر ایک اور تھی راہگزر کے بعد بھی
آج ترے سوال پر پھر مرے لب خموش ہیں
ایسی ہی کشمکش تھی کچھ پہلی نظر کے بعد بھی
دل میں تھے لاکھ وسوسے جلوۂ آفتاب تک
رہ گئی تھی جو تیرگی ختم سحر کے بعد بھی
ایسی ہی شے ملی ہے کچھ حسن کی جلوہ گاہ میں
حوصلۂ نگاہ ہے خونِ جگر کے بعد بھی
ہار کے بھی، نہیں مٹی دل سے خلش حیات کی
کتنے نظام مٹ گئے جشنِ ظفر کے بعد بھی
کوئی مرا ہی آشیاں حاصلِ فصلِ گل نہ تھا
ہاں یہ بہار ہے بہارِ رقصِ شرر کے بعد بھی
ایک تمھاری یاد نے لاکھ دیے جلائے ہیں
آمدِ شب کے قبل بھی، ختم سحر کے بعد بھی

◆

ایسی تنہائی ہے اپنے سے بھی گھبراتا ہوں میں
جل رہی ہیں یاد کی شمعیں، بجھا جاتا ہوں میں
بزمِ فکر و ہوش ہو یا محفلِ عیش و نشاط
ہر جگہ سے چند نشتر چند غم لاتا ہوں میں
ذہن میں یادوں کے گلشن، دل میں عزمِ جوئے شیر
اک نیا فرہاد پاتا ہوں، جدھر جاتا ہوں میں
شب کے سناٹے ہیں رہگیروں کے نغموں کی طرح
اہل دل کی بستیوں میں آہ بن جاتا ہوں میں
شامِ تنہائی بجھا دو جھلملاتی شمع بھی
ان اندھیروں ہی میں اکثر روشنی پاتا ہوں میں
ہمت افزا ہے ہر اک افتاد راہِ شوق کی
ٹھوکریں کھاتا ہوں، گرتا ہوں، سنبھل جاتا ہوں
یوں تو ان سے دور ہی کا اک تعلق ہے، مگر
پوچھ لیتا ہے کوئی زیدی تو اتراتا ہو ں میں

◆

ہم سوگئے تھے منزلِ عرفاں سے گزر کے
اب آنکھ کھلی ہے حدِ عصیاں سے گزر کے
آنکھوں میں لیے جلوۂ نیرنگ تماشا
آئی ہے خزاں، جشنِ بہاراں سے گزر کے
یادوں کے جواں قافلے آتے ہی رہیں گے
سرما کے اسی برگِ پرافشاں سے گزر کے
بن جائے گا تارا کسی مایوس خلا میں
یہ اشکِ سحر گوشۂ داماں سے گزر کے
پائی ہے نگاہوں نے تری بزمِ تمنا
راتوں کو چناروں کے چراغاں سے گزر کے
اب درد میں وہ کیفیتِ درد نہیں ہے
آیا ہوں جو اس بزمِ گل افشاں سے گزر کے

☆

کبھی سر بسر توجہ، کبھی بے سبب کشیدہ
انھیں خوب جانتا ہے مرا عشق خوش عقیدہ
یہ بتا گئی جہاں کو نظر خزاں گزیدہ
گل و گلستاں سے آگے ہے بہارِ فکر و دیدہ
نہ عطائے نقش کاری، نہ عطیۂ چراغاں
ترے آستاں کی رونق ہے جبیں کی آفریدہ
ترا زیرِ لب تبسم تو چمن لٹا رہا تھا
مری تنگ دامنی نے لیے پھول چیدہ چیدہ
تری پرسشِ کرم پر میں لرز لرز گیا ہوں
کہ مرا دلِ شکستہ، ہے بہت وفا گزیدہ
ترے نقشِ پا میں آخر یہ کہاں سے آئی شوخی
تری رہگزر میں شاید کوئی گل تھا نودمیدہ
ہیں مزاجِ حُسن میں بھی وہی طور عاشقی کے
کبھی رنگِ رُخ پریدہ، کبھی پیرہن دریدہ
کبھی سازِ شاعری پر تمھیں گنگناؤ زیدی
لبِ زندگی کا نغمہ جو ابھی ہے ناشنیدہ

◆

ریگِ صحرا پہ نقشِ پا ہوں میں
آپ سے آپ مٹ رہا ہوں میں
ایسی منزل پہ آگیا ہوں میں
آپ ہی اپنا رہنما ہوں میں
کیوں یہ دنیا کہے نہ دیوانہ
دُکھتی رگ بھی جو چھیڑتا ہوں میں
دل نے چھیڑا ہے سازِ تنہائی
ان کی آواز سُن رہا ہوں میں
دور کے کارواں بھی سن لیں گے
غم کے صحراؤں کی صدا ہوں میں
تیرے آنچل کی اوٹ میں گویا
ٹمٹماتا ہوا دیا ہوں میں

◆

نگاہِ شوق میں جو انتخاب ہو نہ سکا
ہزار بار کھلا اور گلاب ہو نہ سکا
عجیب سا ہے یہ احساس انقلاب کے بعد
کہ جیسے اب بھی کوئی انقلاب ہو نہ سکا
نگاہ گوشۂ خامی پہ جا کے رُک سی گئی
جگہ یہ اس کی ہے جو باریاب ہو نہ سکا
روش روش سے الجھتی رہی ہے بادِ سموم
بہار نو کا مگر سدِّ باب ہو نہ سکا
ہم ان کو جانتے ہیں یہ وہی تو زیدی ہیں
کہ توبہ کرتے رہے اجتناب ہو نہ سکا

ماخذ: اردو شاعروں کا انتخابی سلسلہ: علی جواد زیدی (انتخاب کلام علی جواد زیدی)، سنہ اشاعت بار اوّل: مارچ 1971، ناشر: انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ

معین الدین

کیسے پڑھائیں اردو غیر اردو داں طلبا کو

غیر اردو داں طلبا کو اردو کیسے پڑھائی جائے یہ ایک اہم سوال ہے۔ مادری زبان اور غیر مادری زبان کی نوعیت میں چونکہ کافی فرق ہوتا ہے، اس لیے طریقۂ تدریس میں بھی اس فرق کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ مادری زبان سیکھنے کے لیے بچے کو شعوری طور پر کوشش نہیں کرنی پڑتی، بلکہ وہ خود بخود اپنے ماحول سے زبان سیکھ لیتا ہے۔ لیکن غیر مادری زبان سیکھنے کے لیے جہاں ایک طرف نئی لسانی عادتیں پیدا کرنی ہوتی ہیں، وہاں دوسری جانب مادری زبان کو بعض پختہ لسانی عادتوں کو چھوڑنا پڑتا ہے۔ یہ کام کتنا آسان ہے اور کتنا مشکل، اس کا فیصلہ اس بات سے ہونا چاہیے کہ غیر زبان سیکھنے سے ہماری کیا مراد ہے، اور کس مقصد کے تحت ہم زبان سیکھنا چاہتے ہیں۔ گویا، معیار اور مقصد دو بنیادی باتیں ہیں جن کا تعین ضروری ہے۔

غیر اردو داں طلبا کی مخصوص مادری زبان کی نوعیت کے اعتبار سے تدریس اردو کے مقاصد جدا جدا ہوں گے۔ لہٰذا ان جداگانہ مقاصد کے حصول کے لیے طریقہ تدریس تجویز کرتے وقت تدریسِ اردو سے متعلق ہمیں تین نہج پر غور کرنا ہوگا۔

1. ہندی داں کو اردو پڑھانا

ہندی کے علاقے میں عام طور پر بول چال کی زبان مشترک ہوتی ہے، جو ہندوستانی کے نام سے بولی اور سمجھی جاتی ہے، لہٰذا ان لوگوں کو جن کی مادری زبان ہندی ہے اردو بولنا سکھانے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ انھیں تو رسم خط سکھانا مقصود ہوتا ہے اتنا کہ وہ لکھنا اور پڑھنا سیکھ جائیں لیکن اگر مقصد اس سے بلند ہے، تو لکھنا پڑھنا سکھانے کے ساتھ ساتھ اردو ادب سے بھی روشناس کرانا ہوگا۔ یعنی لسانی پہلوؤں کے ساتھ ساتھ تہذیبی اور معاشرتی فضا سے بھی روشناس کرانا ضروری ہے، تا کہ اردو شعر و ادب سے لطف اٹھایا جا سکے اور زندگی کی اعلیٰ قدروں کی بصیرت حاصل کی جا سکے۔

2. غیر ہندی داں کو اردو پڑھانا

اس میں وہ لوگ شامل ہوں گے جن کی مادری زبان نہ تو اردو ہے اور نہ ہندی۔ لیکن وہ ہندوستانی زبان سمجھ سکتے ہیں۔ یہ لوگ ہندوستانی الفاظ سے آشنا ہوتے ہیں، لیکن خود ہندوستانی بول نہیں سکتے۔ ہمارے ملک میں ایسی کئی ریاستیں ہیں، جہاں یہ صورتِ حال پائی جاتی ہے، ان علاقوں میں اردو سیکھنے کا رواج بڑھتا جا رہا ہے۔ قومی ہم آہنگی کے پیش نظر اس رجحان کو فروغ دینے کی ضرورت ہے تا کہ ذہنی اور جذباتی طور پر ملک کے مختلف علاقوں کے لوگ ایک دوسرے سے قریب آسکیں۔ لہٰذا غیر ہندی داں کو اردو پڑھاتے وقت اس پہلو کو خصوصیت کے ساتھ پیش نظر رکھنا چاہیے۔

3. بیرونی زبان کی حیثیت سے اردو پڑھانا

اردو سے غیر ملکیوں کی دلچسپی نئی نہیں ہے۔ اگر ہم ہندوستان کی تاریخ پر ایک سرسری نظر ڈالیں، تو بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے قیام کے بعد سے ہی انگریزوں اور فرانسیسیوں نے اردو سے غیر معمولی دلچسپی کا اظہار شروع کر دیا تھا۔ بعض نے تجارتی، بعض نے سیاسی اور بعض نے محض علمی مقاصد کے پیش نظر اردو زبان سیکھنے کی کوشش کی اور بعض مستشرقین کو اس زبان کے اندر اتنی کشش نظر آئی کہ انھوں نے زبان کے ساتھ ساتھ ادب میں بھی دلچسپی لی اور شعر و ادب کے ذریعے ہندوستانی تہذیب و تمدن اور ہندوستانی مزاج کی رنگارنگی کا گہرا مطالعہ کیا۔

موجودہ دور میں زبان سیکھنے کے محرکات بدل گئے ہیں۔ اب لوگوں میں نئی زبانیں سیکھنے اور نئی تہذیبوں سے واقفیت پیدا کرنے کا رجحان بڑھتا جا رہا ہے اور بین الاقوامی تعلقات کی اہمیت کا احساس روز بروز مستحکم ہوتا جا رہا ہے۔ چنانچہ غیر ملکی طلبا کو اردو پڑھانے کے کام میں بڑی وسعت پیدا ہوگئی ہے، اور نت نئے تجربات کیے جا رہے ہیں۔

غرض، غیر اردو داں کو تین قسم کی اردو پڑھانے کے لیے مواد، سامانِ تعلیم اور طریقۂ تدریس فراہم کرنا ہوگا۔ اس باب میں چونکہ طریقۂ تدریس زیر بحث ہے، اس لیے خصوصیت کے ساتھ ان مسائل کا ذکر کیا جائے گا جو طریقۂ تدریس سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس سلسلے میں لسانیات کا ذکر بھی برمحل ہوگا اس لیے کہ گزشتہ چند دہوں سے لسانیات کو زبان سکھانے کی ایک سائنس کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے۔ لہٰذا اس بات پر غور کرنا ضروری ہے کہ غیر اردو داں کو اردو لکھنا اور پڑھنا سکھانے میں لسانیات کس حد تک معاون ثابت ہوتی ہے۔

تدریسِ زبان میں لسانیات کی اہمیت

لسانیات کا اولین منصب زبان سے متعلق ایسے نظریات فراہم کرنا ہے، جن پر عمل کرنے سے زبان سیکھنے کا کام دلچسپ ہو جائے، لیکن مادری زبان کے سلسلے میں یہ دعویٰ مشکوک نظر آتا ہے۔ اس لیے کہ مادری زبان نہ تو بچہ لسانیات کی مدد سے سیکھتا ہے اور نہ گرامر کی۔ بلکہ اپنے قریبی ماحول اور سماج سے وہ زبان سیکھتا ہے۔ عمر کے ساتھ ساتھ اس کی زبان کی نشو و نما ہوتی رہتی ہے۔ پھر وہ مدرسے میں داخل ہوتا ہے، تو اس کی لسانی عادتیں مستحکم ہوتی رہتی ہیں اور ان میں توسیع کا عمل بھی جاری رہتا ہے۔ غرض، زبان کی نشو و نما میں مدرسہ اور خصوصیت کے ساتھ استاد کی شخصیت اور اس کا رتبہ بڑی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ لسانیات کے ماہرین نے بھی اس ضمن میں لسانیات کی اہمیت کو شک و شبے کی نظر سے دیکھا ہے خود چامسکی کو بھی جو لسانیات کے ایک مسلمہ عالم ہیں اس بات

میں شک ہے کہ زبان کی تدریس میں لسانیات کوئی اہم رول ادا کرسکتی ہے، اوراس کے ذریعے وہ بصیرت پیدا کی جاسکتی ہے، جو زبان سیکھنے میں معاون ہو۔

زبان جاننا اور زبان کے بارے میں جاننا دو مختلف باتیں ہیں۔ زبان کی تدریس میں آخرالذکر سے مدد ملتی ہے۔ اگر عمومی حیثیت سے اس مسئلے پر نظر ڈالی جائے، تو اندازہ ہوتا ہے کہ اپنی زبان تو ہر شخص جانتا ہے لیکن زبان کے بارے میں جاننا اس کے لیے قطعی ضروری نہیں۔ لسانیات کی مدد سے زبان کے بارے میں علم فراہم ہوتا ہے۔ زبان کی ساخت، صوتیاتی نظام، آوازوں کی درجہ بندی، مصوتی اور مصمتی ڈھانچے کی تفہیم اور تحریری علامتوں کا علم حاصل ہوتا ہے، اور یہ تمام باتیں زبان کی بنیادی مہارتیں سیکھنے میں بہت مددگار ثابت ہوتی ہیں۔

دنیا کی ترقی یافتہ اور مہذب قوموں میں ایک سے زیادہ زبان سیکھنے کا رجحان بہت تیزی سے بڑھتا جارہا ہے۔ اسی لیے ایسے اصول وضوابط منضبط کرنے کی کوشش جاری ہے، جن سے زبان کی تعلیم کا مسئلہ آسان سے آسان اور دلچسپ سے دلچسپ تر ہوجائے۔ اس سلسلے میں لسانیات کا علم استاد کی رہنمائی کرتا ہے۔ اس لیے غیراردوداں کو اردو پڑھنا اور لکھنا سکھانے میں لسانیات کا مطالعہ سودمند ثابت ہوسکتا ہے۔

طریقۂ تدریس

غیراردوداں کو اردو پڑھنا اور لکھنا سکھانے کے وہی طریقے اپنائے جاسکتے ہیں جو دیگر غیرملکی اور ملکی زبانوں کو سکھانے کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ ان میں سے درج ذیل خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔

1. گفتگو کا طریقہ

غیرملکی زبان کے طور پر اردو پڑھانے کا سب سے موثر طریقہ یہ ہے کہ گفتگو اور بات چیت کو وسیلۂ تعلیم بنایا جائے یعنی اس کا آغاز گفتگو سے ہونا چاہیے۔ کسی زبان کو لکھنا پڑھنا سکھانے کا آسان اور سہل طریقہ یہ ہے کہ اس زبان میں بات چیت شروع کی جائے۔ یعنی پہلے کان الفاظ سے آشنا ہوں، پھر آنکھ۔ یعنی پہلے بولنا پھر پڑھنا اور لکھنا۔ اس طرح الفاظ سے آشنائی، واقفیت، شناخت اور مشق، اردو سکھانے کے اہم اقدام ہیں۔ آوازوں سے واقفیت پیدا کراتے وقت اس بات کو ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ اردو کا صوتیاتی نظام چونکہ بہت پیچیدہ ہے، اس لیے مفرد اور مرکب دونوں آوازوں پر اچھی طرح قدرت ہونی چاہیے۔ مادری اور غیرمادری زبان میں مماثلت، اختلاف اور امتیاز سے بھی بخوبی واقفیت پیدا کرانی ضروری ہے۔ اردو زبان میں کئی آوازیں ایسی ہیں جو دوسری زبانوں میں بھی پائی جاتی ہیں، اور بعض آوازیں ایسی ہیں جو طالب علم کی مادری زبان میں نہیں ملتیں۔ ہندی داں طلبا کو اردو پڑھاتے وقت اکثر یہ دشواری پیش آتی ہے۔ مثلاً 'غ' اور 'ف' کی آواز ہندی میں نہیں ملتی۔ اسی طرح اردو میں کئی حروف ایسے ہیں جن کی ادائیگی ایک ہی طرح ہوتی ہے مثلاً 'س' اور 'ص'، 'ط' اور 'ت'، 'ض' اور 'ظ'۔ اس دشواری کا آسان حل یہ نظر آتا ہے کہ ان حروف اور ان سے ادا ہونے والی آوازوں کی اچھی طرح مشق کرائی جائے۔ اس زبان کی بنیادی ساخت سے واقفیت پیدا کرنے کے بعد حروف اور الفاظ کی ایسی مشق کرادینی چاہیے کہ تقریر و تحریر کی بنیادی مہارتوں پر قدرت حاصل ہوجائے۔ یعنی طالب علم میں یہ صلاحیت ہوجائے کہ وہ روانی کے ساتھ بول سکے، کوئی گفتگو سن کر سمجھ سکے اور کوئی تحریر پڑھ کر مطلب اخذ کرسکے۔

گفتگو سکھانے میں ایک بات یہ ملحوظ رکھنی چاہیے

کہ فی البدیہہ گفتگو میں غلطی کا کافی امکان ہوتا ہے۔ لہٰذا غلطیوں سے مایوس ہونے کی چنداں ضرورت نہیں، بلکہ مختصر اور مربوط گفتگو کے لیے طلبا کی ہمت افزائی کرنی چاہیے۔ گفتگو کے موضوع، طوالت اور معیار پر کسی قسم کی پابندی نہیں عائد کرنی چاہیے اور طالب علم کو اس بات کی آزادی بھی ملنی چاہیے کہ اگر دورانِ گفتگو کوئی موزوں لفظ نہیں مل رہا ہے، تو اپنی مادری زبان کا لفظ استعمال کرسکے۔

زبانی اظہارِ خیال کے بعد تحریر کی طرف توجہ کرنی چاہیے۔ زبانی اظہارِ خیال سے چونکہ تحریر کا گہرا تعلق ہوتا ہے، اس لیے اگر گفتگو اور بات چیت کے متن کو لکھوایا جائے، تو مناسب ہوگا۔ بات چیت کی اکائی چونکہ جملہ ہوتی ہے، اس لیے تحریر کا آغاز بھی جملے سے کرانا چاہیے اور جملوں میں سے الفاظ اور الفاظ سے جملے لکھوانے چاہئیں۔ اردو رسم خط صوتیاتی نظام سے بڑی حد تک ہم آہنگ نہیں ہے۔ اس لیے رسم خط سکھانے میں دشواری پیش آتی ہے۔ اس دشواری پر بڑی حد تک تحریری مشقوں سے قابو پایا جاسکتا ہے۔ اصلاح اور مشق کے دوران حروف کے جوڑ، نشست، کرسی، دائرے، نقطے اور شوشے کی جانب توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ نقل نویسی کی مہارت جب اچھی طرح پیدا ہوجائے، تو املا بھی لکھوانا چاہیے۔ املا لکھوانے کا مناسب طریقہ یہ ہوتا ہے کہ املا کی عبارت پہلے مناسب رفتار سے پڑھ کر سنائی جائے، پھر املا بولا جائے اور اردو رسم الخط میں اس کو لکھا جائے۔ اس دوران اگر کوئی مشکل لفظ آجائے تو اس کے ہجے بتادیجیے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اسی طرح املا نویسی کے دوران اگر املا یا مفہوم سے متعلق کوئی سوال ذہن میں پیدا ہوجائے، تو اس کی بھی تشفی کردینی چاہیے۔ آخر میں پوری عبارت کسی قدر کم رفتار سے پڑھ کر سنانی چاہیے تاکہ اگر کوئی لفظ چھوٹ گیا ہو، تو اس کو لکھ لیا جائے، یا اگر کوئی لفظ غلط لکھ دیا گیا ہے، تو اس کی اصلاح کرلی جائے۔

املا کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ توجہ کے ساتھ سننے، ذہن میں محفوظ رکھنے اور صحت اور روانی کے ساتھ لکھنے کی مشق کرائی جائے یعنی سماعت، حافظے اور تحریر میں ہم آہنگی پیدا کی جائے۔ لیکن غیرزبان کی حیثیت سے اردو سیکھنے والوں کو املا کے ذریعے نئے الفاظ کی شناخت، حروف کے جوڑ اور صحیح ہجے کی مشق کا بھی بہت اچھا موقع ملتا ہے۔

طریقہ گفتگو کو اور زیادہ موثر بنانے کے لیے ترجمے کے طریقے سے بھی مدد لی جاسکتی ہے اس طرح کہ املا کی عبارت کا زبانی ترجمہ کرایا جائے۔ اس دوران ایسے الفاظ اور جملوں کا مفہوم بھی بتایا جاسکتا ہے، جن کی تفہیم میں دشواری محسوس کی جاتی ہو۔ ترجمے کو محض مشق کے طور پر استعمال کیا جائے، تو مناسب ہوگا۔ مشق کو موثر اور دلچسپ بنانے کے لیے یہ طریقہ بھی اختیار کیا جاسکتا ہے کہ املا کی عبارت کے حوالے کے بغیر دوبارہ اور سہ بارہ زبانی ترجمہ کرایا جائے۔

غیرزبان والے کو گفتگو کی مشق کرانے کا بہترین موقع لسانی لیبارٹری میں ملتا ہے۔ اس کے اندر ایسی ٹیپ کا انتظام ہونا چاہیے، جس میں اہلِ زبان کی گفتگو ٹیپ کی گئی ہو۔ اس کو سن کر ادائیگی الفاظ پر قدرت اور لب و لہجے سے شناسائی حاصل کی جاسکتی ہے۔ ٹیپ کے استعمال سے شروع شروع میں اکتاہٹ ضرور ہوتی ہے، اس لیے کہ ٹیپ کی گفتگو اور بغیر ٹیپ کی گفتگو میں فرق ہوتا ہے۔ جب آپ کسی شخص سے گفتگو کرتے ہیں، تو اس کے ہاتھ اور چہرے کی حرکات وسکنات سے بھی مفہوم سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ لیکن ٹیپ کی گفتگو سنتے وقت شخصی عنصر غائب ہوتا ہے۔ اس دشواری کو اس طرح دور کیا جاسکتا ہے کہ

جہاں مفہوم اخذ کرنے میں دقت محسوس ہوتی ہو، وہاں دوبارہ اور سہ بارہ ٹیپ کی گفتگو سنائی جاسکتی ہے۔

گفتگو کی مشق کا ایک اور موثر طریقہ یہ ہے کہ اہل زبان سے رابطہ قائم کیا جائے، اور ان سے بات چیت کے دوران اہل زبان کے تلفظ اور لہجے سے آشنائی پیدا کی جائے۔ اہلِ زبان سے گفتگو کرتے وقت ایسے لفظ اور جملے اچھی طرح ذہن نشین کرنے چاہئیں، جو بار بار استعمال ہوتے ہوں۔ الفاظ کے مقابلے میں جملے یاد کرنا نسبتاً زیادہ آسان ہوتا ہے، اس لیے کہ جملے بامعنی ہوتے ہیں اور الفاظ چونکہ عبارت کے سیاق وسباق سے علاحدگی کوئی حیثیت نہیں رکھتے اس لیے انھیں یاد کرنے میں دشواری محسوس ہوتی ہے۔

طریقۂ گفتگو غیرملکیوں کو اردو سکھانے میں بہت کامیاب ثابت ہوتا ہے لیکن محض گفتگو پر اکتفا کرنے سے زبان دانی کا مقصد نہیں حاصل ہوسکتا۔ اس لیے ضروری ہے کہ ساتھ ساتھ پڑھائی کی بھی مشق کرائی جائے۔ پڑھائی کا پرگرام ایسی درسی کتب سے شروع کرنا چاہیے، جو خاص طور سے اسی مقصد کے پیش نظر تیار کی گئی ہوں۔ غیر درسی مطالعے کے لیے مواد کا انتخاب کرتے وقت بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔ اکثر یہ اساتذہ بچوں کا ادب پڑھنے کی صلاح دیتے ہیں، جو مناسب نہیں ہے۔ بچوں اور بڑوں کی نفسیات میں بہت فرق ہوتا ہے۔ بچوں کا ادب عام طور سے بالغوں کو پسند نہیں آتا، اور نہ ہی بالغوں کا ادب بچوں کو۔ بچوں اور بالغوں کی پسند و ناپسند میں فرق ہوتا ہے۔ لہٰذا پڑھائی کے لیے مواد کا انتخاب کرتے وقت اس بات کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔

زبان دانی کی مشق کے لیے اخبارات کا مطالعہ بھی مفید ثابت ہوتا ہے۔ لیکن ایک دقت یہ محسوس ہوتی ہے کہ اخبارات کی زبان عصری زندگی سے قریب ہوتے ہوئے بھی کتابوں کی زبان سے کسی قدر مختلف ہوتی ہے۔ اس لیے اخبارات کے مطالعے سے خاطر خواہ کامیابی نہیں ہو پاتی۔

پڑھنا اور لکھنا سکھانے کے علاوہ اگر ادب سے بھی روشناس کرانا مقصود ہو، تو سب سے پہلے عصری ادب کے ہلکے پھلکے نمونے پڑھنے کے لیے دیے جائیں۔ ادبی نمونوں کا انتخاب کرتے وقت وقائع، محاضرات اور سوانح کو ترجیح دینی چاہیے، بشرطیکہ ان کا تعلق ماضی قریب یا عہد حاضر سے ہو۔ سلسلۂ 'تعلیم و ترقی' کی مطبوعات چونکہ مکتبہ جامعہ نے خصوصیت کے ساتھ بالغوں کے لیے شائع کی ہیں، اس لیے یہ بہتر موادِ مطالعہ فراہم کرسکتی ہیں۔ ان کتابوں کی تین اہم خصوصیات ہیں۔ اول یہ کہ موضوعات زیادہ تر عصری زندگی سے منتخب کیے گئے ہیں۔ اس لیے بالغوں کی دلچسپی کا باعث ہوتے ہیں۔ دوم یہ کہ پیرایۂ بیان سادہ، صاف اور براہِ راست ہے، اور سوم یہ کہ طباعت کے لحاظ سے بھی بہتر ہیں۔

2. طریقۂ راست

غیرملکی زبان کی حیثیت سے انگریزی اور دوسری یوروپی زبانیں سکھانے کے لیے عام طور پر طریقۂ راست استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ اس طریقۂ تدریس کے تحت عمل اور زبانی اظہار ساتھ ساتھ ہوتا ہے۔ مثلاً کسی غیر ملکی کو اگر طریقۂ راست سے اردو سکھانا مقصود ہو، تو قلم دکھا کر کہیں گے 'یہ قلم ہے' کتاب دکھا کر 'یہ کتاب ہے' اور اسی طرح کے اور جملے یا جسم کے اشاروں کو بتا کر اردو کے الفاظ اور جملوں سے واقفیت پیدا کرائی جاسکتی ہے۔ جب الفاظ اور جملوں کی مشق ہو جائے تو پڑھائی اور لکھائی سے اس کا ارتباط کیا جاسکتا ہے۔ الفاظ سے واقفیت پیدا کرنے کی وجہ سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ پڑھتے وقت الفاظ اور علامتوں

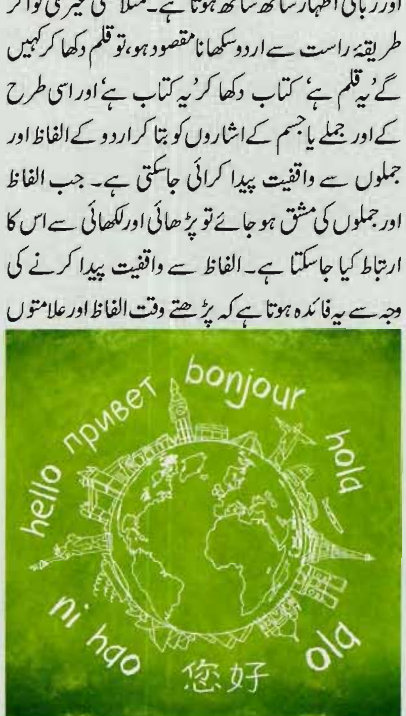

کے درمیان مطابقت پیدا کرتے وقت سہولت ہوتی ہے۔

الفاظ اور جملے سیکھنے میں طریقۂ راست سے، بہت مدد ملتی ہے، اور موضوع اور لفظ کے براہِ راست ربط سے ٹھوس اشیا اور محسوس افعال کے معنی سمجھائے جاسکتے ہیں۔ اسی طرح کسی شے اور واقعے کو بھی خیالی ربط دیا جاسکتا ہے۔ لیکن موضوع اور لفظ کے براہِ راست ربط سے ٹھوس اشیا اور محسوس افعال کے معنی سمجھائے جاسکتے ہیں۔ اسی طرح کسی شے اور واقعے کو بھی خیالی ربط دیا جاسکتا ہے۔ لیکن موضوع اور لفظ کے براہِ راست ربط سے مجرد تصورات، جذباتی کیفیات اور پیچیدہ خیالات کو سمجھانا مشکل ہے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ طریقۂ راست کی افادیت محدود ہے۔

طریقۂ راست میں گفتگو اور پڑھائی کے ساتھ ساتھ لکھائی کا کام بھی شروع کردیا جاتا ہے۔ لکھائی سکھانے کے لیے بھی طریقۂ راست کا استعمال کیا جاتا ہے۔ یعنی حروف ابجد کو سلسلہ وار لکھنا سکھایا جاتا ہے۔ حیات اللہ انصاری نے حروف تہجی سکھانے کے لیے مرکب اکائی کا طریقہ تجویز کیا ہے، جیسے 'ل' اور 'ا' کے بجائے 'لا'۔ عبدالغفار مدھولی نے بڑے چھوٹے دو خاندانوں میں حروف تہجی کو تقسیم کرکے املا کا گر سمجھایا ہے۔ لیکن ان طریقوں میں یہ خامی ہے کہ بچے بڑے اور مبتدی سب پر ایک ہی نسخہ آزمایا گیا ہے جو مناسب نہیں ہے۔

طریقۂ راست کے حامیوں نے اس کی حمایت میں بڑے بلند بانگ دعوے کیے ہیں۔ لیکن اس کی افادیت محدود ہونے کی وجہ سے بیشتر اساتذہ نے اس طریقے کو ترک کردیا ہے۔

3. ترجمے کا طریقہ

مادری زبان کے علاوہ دوسری زبانیں سکھانے کے لیے ترجمے کا طریقہ بھی تجویز کیا گیا ہے۔ لیکن اس میں ایک بڑا نقص یہ ہے کہ اس کے ذریعے گفتگو نہیں سیکھی جاسکتی اور جب تک بات چیت اور گفت وشنید پر قدرت حاصل نہ ہو، پڑھنے اور لکھنے میں بھی دشواری محسوس ہوتی ہے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ دوسری زبان جاننے والے کو اپنا مفہوم سمجھانے کا یہ نہایت جامع طریقہ ہے۔ ترجمے کے طریقے میں ایک بڑی دشواری یہ محسوس ہوتی ہے کہ ہر لفظ کا مترادف دوسری زبان میں نہیں ملتا۔ پھر یہ کہ ہر زبان کی صرف ونحو مختلف ہوتی ہے۔ اگر ایک زبان کی صرفی خصوصیات دوسری زبان میں موجود نہ ہوں، تو ترجمے میں دشواری ہوسکتی ہے۔

ترجمے کے ذریعے زبان سکھانے کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے بنیادی جملے کی تشریح کی جائے۔ اگر اس جملے کا تعلق کسی واقعے یا حادثے سے ہے، تو اس کی وضاحت ضرور کرنی چاہیے۔ اس دوران زبان کی مشکلات کو بھی دور کرنا چاہیے، اور محاورہ، لفظ اور مشکل تراکیب کی بھی تشریح کرنی چاہیے۔ اس طرح بنیادی جملے کا مفہوم سمجھانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ استاد اگر اردو سیکھنے والے کی مادری زبان سے بھی واقف ہو تو تدریس کا کام آسان ہوجاتا ہے۔

ترجمے کا طریقہ غیرزبان داں کو پڑھنا لکھنا سکھانے کا قدیم طریقہ ہے۔ اس میں حروف تہجی، ہجے اور لکھائی پڑھائی پر زور دیا جاتا ہے۔ لیکن تلفظ اور بات چیت پر نسبتاً کم توجہ صرف کی جاتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پڑھنے کی صلاحیت کے باوجود صحیح تلفظ، لب ولہجہ اور روزمرہ کی بات چیت کی صلاحیت نہیں پیدا ہو پاتی۔

■

ماخذ: اردو زبان کی تدریس: معین الدین، **پانچویں طباعت:** 2013، ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

نیاز احمد آسی

شہرِ آہن جمشید پور

(اردو زبان و ادب کے حوالے سے)

جمشید جی نوشیرواں جی ٹاٹا

ٹاٹا کمپنی کی طرف جاتی ہوئی سر سبز و شاداب سڑک

1907 میں ٹیسکو کے قیام سے پہلے جمشید جی نوشیرواں جی ٹاٹا اپنے بیٹے سردراب جی ٹاٹا کو خط لکھتے ہوئے کچھ یوں نصیحت کرتے ہیں:

''عہد کرو کہ اس شہر (جمشید پور) کی سڑکیں چوڑی بنائی جائیں گی۔ جس کے کنارے زود رد اور سایہ دار پیڑ لگائے جائیں گے۔ عہد کرو کہ میدانوں اور باغات کے لیے کافی جگہیں چھوڑی جائیں گی۔ ہندوؤں کے مندر، مسلمانوں کی مسجد اور عیسائیوں کے گرجا گھر کے لیے زمینوں کی نشاندہی کر دی جائے گی۔''

پھر ایسا ہوا... پورے ملک سے مزدور آنے لگے... ان میں مسلم بھی تھے، ہندو، سکھ اور عیسائی بھی تھے۔ یہ مختلف زبانوں، بولیوں اور تہذیبوں کے دلدادہ اور ہم نوا بھی تھے... پھر کمپنی نے مزدوروں کے لیے کوارٹر بنوائے، کشادہ سڑکیں بنوائیں۔ سڑکوں کی دونوں جوانب سایہ دار درخت لگوائے۔ ہاسپٹل، کلب، لائبریری اور اسکول بنوائے... اور دیکھتے ہی دیکھتے پورا علاقہ ایک خوبصورت شہر میں تبدیل ہوتا چلا گیا۔ کچھ لوگ اسے ٹاٹا نگر بھی کہتے ہیں۔ ہندی والے اسے اسپات نگری اور اردو والے اسے شہرِ آہن کہتے ہیں۔

شہرِ آہن کے پہلے کاتب محمد حنیف اپنے اس شعر میں جسے شاہ ایران نے بھی پسند کیا تھا، ٹاٹا کو کچھ اس طرح خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں:

ساغرِ اوّل بنامِ حضرتِ ٹاٹا بود
صنعتِ ہندوستان چوں بادہ یکتا شود

مشہور و معروف شاعر اور نثر نگار سید احمد شمیم جمشید پور کا جغرافیہ کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

''جمشید پور چاروں طرف دوڑتی ہوئی پہاڑیوں، سرسبز شاداب جنگلوں اور سورن ریکھا اور کھڑکائی جیسی رقص کرتی ہوئی ندیوں کی باہوں میں بسا ہوا ایک خوبصورت شہر ہے جس کی سڑکیں ہر سمت میں بل کھاتی ہوئی دوڑتی ہیں۔ سورج کے غروب ہوتے ہی یہ شہر بجلیوں کے ہزاروں قمقموں سے جگمگا اٹھتا ہے اور گرمیوں کے موسم میں پہاڑ پر جب آدی باسی آگ روشن کرتے ہیں تو یوں لگتا ہے کہ سرخ جگمگاتے ہوئے پھولوں کا صحرا شہر کی پیشانی پہ باندھ دیا گیا ہے۔'' (سہ ماہی شہپر، دھنباد، جھارکھنڈ میں اردو افسانہ نمبر)

مشرقی ہند کی مشہور و معروف دینی درس گاہ 'جامعہ فیض العلوم' کے بانی علامہ ارشد القادریؒ کے ذہن سے جمشید پور میں منعقدہ کشمیر کانفرنس میں کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں:

''کشمیر میں اگر چاندی کی طرح سفید و شفاف چشمے ہیں۔ یہاں بھی فولاد کا چشمۂ سیال ہر وقت رواں دواں رہتا ہے۔ کشمیر کی سرزمین اگر زعفران اور سرخ پھولوں سے رنگین نظر آتی ہے تو یہاں بھی ہتھوڑوں کی ضرب سے چنگاریوں کے پھول جھڑتے ہیں۔ کشمیر میں اگر برف کی سفید چٹانیں انسان کو ٹھنڈا رکھتی ہیں تو یہاں آگ کی سرخ چٹان زندگی کی تپش کو ہر وقت برقرار رکھتی ہے۔ کشمیر اگر خون پیدا کرنے والے پھولوں کا دیس ہے تو یہاں کے مزدوروں کا پسینہ چند مرحلوں کے بعد سارے ملک کی رگوں میں دوڑ جاتا ہے۔''

کہنہ مشق شاعر شہاب قاضی پوری مرحوم اپنی طویل نظم 'ساغر جمشید' میں جمشید پور کو ایک انوکھا شہر قرار دیتے ہوئے کچھ اس طرح دعائیں دیتے ہیں:

برِاعظم ایشیا کا دل ہے یہ جمشید پور
صنعتوں کا تحفۂ کامل ہے۔ یہ جمشید پور
اس کی صنعت سے ہے وابستہ یہاں کی زندگی
صاف سڑکوں کے کنارے ماہ پاروں کی بہار
کوہساری سلسلے، جھیلوں میں تاروں کی بہار
اس انوکھے شہر میں ہر دم بہار آتی رہے
اس پہ ہر دم رحمتِ پروردگار آتی رہے

جھیل، جھرنوں، جنگلوں، آبشاروں اور کہساروں سے گھرا شہر، جمشید پور کو صنعتوں کا شہر اور جھارکھنڈ کی صنعتی راجدھانی کا اعزاز حاصل ہے۔ سچ کہا جائے تو جمشید جی نوشیرواں جی ٹاٹا نے اس علاقے میں اگر فولادی کارخانہ قائم نہ کیا ہوتا تو آج بھی یہ علاقہ جنگلستان ہی ہوتا اور پورے ملک میں دوڑنے والی ٹاٹا کی گاڑیاں اور دیگر مصنوعات (Products) نظر نہ آتیں۔ ٹیسکو کے علاوہ یہاں ٹاٹا کی اور بھی کمپنیاں قائم ہیں۔ جیسے ہتاچی کنسٹرکشن مشینری کارپوریشن لمیٹڈ، ٹاٹا پگمنٹ لمیٹڈ، ٹن پلیٹ، ٹاٹا ٹمکین، ٹاٹا بلواسکوپ، ٹاٹا پاور اور دی انڈین اسٹیل وائر پروڈکٹس لمیٹڈ، ٹی آر ایف، ٹاٹا اسٹیل پروسیسنگ اینڈ ڈسٹری بیوشن لمیٹڈ اور ٹایو جیسی بڑی بڑی کمپنیوں میں ہزاروں مزدور کام پر لگے ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ آدتیہ پور میں آئیڈا علاقے میں ایشیا کی سب سے بڑی اسمال اسکیل انڈسٹریز قائم ہیں۔ یہاں 150 سے 200 چھوٹی بڑی فیکٹریاں قائم ہیں، جہاں لاکھوں مزدور کام کرتے ہیں۔

جھارکھنڈ کے روزنامہ 'فاروقی تنظیم' کے ورکنگ ایڈیٹر خورشید پرویز صدیقی 19 جنوری 2002 کے اپنے اداریے میں جمشید پور کو ایک زندہ شہر قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں:

جمشید پور ہمیں ایک متحرک اور زندہ شہر لگتا ہے۔ زندگی کے نغمے پر تھرکتا شہر۔ یہاں کے مسلمان زندہ ہی نہیں، جاوید ہیں۔ یہ بڑے اچھے، کامیاب، باوقار اور سرگرم دینی اور فلاحی ادارے چلا رہے ہیں۔ ان کا سب سے باکمال اہم پہلو یہ ہے کہ ان اداروں سے صرف مسلمان ہی نہیں بلکہ دوسرے بھی مستفیض ہو رہے ہیں اور

نیشنل میٹرولوجیکل لیباریٹری، جمشید پور

یہی نہیں جھارکھنڈ میں کہیں اردو تھوڑی بہت زندہ ہے تو وہ ہے جمشید پور۔

جب بات چلی ہے... اردو ادب کی تو جمشید پور میں اردو لکھنے، پڑھنے اور بولنے والوں کی آمد کا سلسلہ بیسویں صدی کی پہلی دہائی سے شروع ہوتا ہے۔ 1920 میں مولانا فرح کمالی جمشید پور تشریف لاتے ہیں اور نخلسانِ اردو میں بہار آجاتی ہے۔ پھر ہوتا ہے ادبی نشستوں کا آغاز۔ یہ آغاز بھی ہوتا ہے۔ دامودر روڈ، ساکچی کے لیمپ پوسٹ کی روشنی سے۔ اس طرح بتایا جاتا ہے کہ شہر آہن میں اردو کا سب سے پہلا مشاعرہ 1923 میں رونق دکنی سیمابی کی سر براہی میں ہوتا ہے جس کی طرح تھی:

ذکرِ حبیب کم نہیں وصلِ حبیب سے

اور پھر پہلا کل ہند مشاعرہ 27-26 جون 1943 کو چودھری عبداللہ اختر اور محبوب عالم (ڈپٹی کلکٹر) کی جانب سے 'بزم ادب' کے زیر اہتمام میلانی ہال میں ہوتا ہے۔ تب سے آج تک جمشید پور میں اردو زبان وادب کبھی ڈگمگائی کشتی، کبھی کھو گیا کنارہ کے مصداق رواں دواں ہے۔

جمشید پور میں ابتدا تا حال اردو زبان و ادب کی خدمات میں مسلمانوں کے ساتھ ساتھ غیر مسلم بھائیوں کے رول کو ہم نظر انداز نہیں کر سکتے ہیں (اس کی تفصیلات نزہت پروین کی تصنیف 'جھارکھنڈ کے غیر مسلم قلمکار' میں دیکھ سکتے ہیں) مسٹر بی ڈی اچھا پوریا، مسٹر کے ایم کویاجی نہ صرف اردو داں تھے بلکہ فارسی داں بھی تھے۔ آج بھی ان کی عنایت کردہ کتابیں مسلم لائبریری میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ آر ڈبلیو ماتھر، ڈاکٹر گھنشیام سنگھ چوکر، پریم کلین، سردار ملکیت سنگھ اور بعد میں گربچن سنگھ، آزاد گورداسپوری، ہربنس سنگھ دوست، جی ایس رگل، جوگا سنگھ انور، رام پرشاد کھوسلہ ناشاد، کرشن کمار کھوسلہ، شیدا چینی جیسے غیر مسلم شعرا وادبا کی لسانی وادبی خدمات کو ہم فراموش نہیں کر سکتے ہیں۔

جمشید پور میں رام پرشاد کھوسلہ ناشاد کے دیوان 'نالۂ ناشاد' کو سب سے پہلے میں نے جمشید پور ہی نہیں پورے جھارکھنڈ کی پہلی تصنیف قرار دیا تھا۔ بعد میں منظر حسین (شعبۂ اردو رانچی یونیورسٹی) اسلم بدر وغیرہ نے اپنے مضامین میں یہ بات دہرائی ہے۔ نالۂ ناشاد کو ان کے بیٹے کرشن کمار کھوسلہ (اسسٹنٹ جنرل منیجر، ٹاٹا کمپنی) نے 1950 میں شائع کیا تھا... جمشید پور میں سب سے پہلا ناول طلعت بدر فاطمہ (دو بہنیں طلعت+فاطمہ) کی مشترکہ کاوشوں کا نتیجہ تھا۔ یہ ناول جو 1950 میں 'قندیل' کے نام سے منظر عام پر آیا تھا، اسے ماہنامہ 'بانو' کے ایڈیٹر انور دہلوی نے شائع کیا تھا جسے بعد میں 'بانو' کو ادارہ 'شمع' نے لے لیا تھا۔ مذکورہ ناول تقسیم ملک کے پس منظر میں پھوٹ پڑنے والے فسادات پر مبنی ایک مسلم یتیم لڑکی کو موضوع بنا کر لکھا گیا تھا۔ جس کے ماں باپ فسادات میں مارے جاتے ہیں اور جسے ایک ہندو پڑوسی پال پوس کر جوان کرتا ہے اور پھر مذہبی رسم ورواج کے ساتھ اس کی شادی ایک مسلم لڑکے سے کر دی جاتی ہے۔ آج بھی ہندوستانی معاشرے میں ایسے کرداروں کی جھلک وقتاً فوقتاً دیکھنے کو ملتی رہتی ہے۔

عصمت چغتائی ناچیز کے نام اپنے ایک خط میں ایک جگہ لکھتی ہیں:

"میں نے آج تک کوئی کہانی دل سے گڑھ کر نہیں لکھی۔ میری کہانیوں میں پھول پتوں، سہانی شاموں کا ذکر نہیں ہوتا۔ کیونکہ میں ذرا بد مذاق ہوں۔ بس کیمرہ جیسا دماغ ہے۔ (شاعر ہم عصر اردو ادب نمبر، ص 600، 1999)

دراصل یہ خط عصمت چغتائی نے 1979 میں شہر میں پھوٹ پڑنے والے فسادات سے متاثر ہو کر لکھا تھا۔ اس فساد میں فسادیوں نے ایک ایمبولنس کے دروازہ کو بند کر کے پٹرول چھڑک کر آگ کے حوالے کر دیا تھا جس میں سوار 110 سے زائد خواتین اور بچے زندہ جل کر راکھ ہو گئے تھے۔ اس سازش کو فسادیوں نے پولیس کی سر براہی میں کاشی ڈیہہ پل کے اوپر انجام دیا تھا۔ آج بھی بیتی رات کو اطراف کے لوگ بچے اور خواتین کے چیخنے، چلانے کی آوازیں سنتے ہیں۔ اس فساد نے عصمت چغتائی کے دل کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ وہ فسادات کے موضوع پر کچھ لکھنا چاہ رہی تھیں۔ اس لیے مجھ سے اپنے خط میں فرمائش کی تھی کہ "بس جو کچھ دیکھا ہے۔ بے تکلف لکھ بھیجیے۔"

شہر آہن پر جوگا سنگھ انور کے اس شعر پر بہت سے لوگوں نے ناک بھوں چڑھائی تھی۔ اِسے 79 سے بہت پہلے جوگا نے کہا تھا۔ جو آگے چل کر ان کی روشن ضمیری کی علامت بن گیا:

شیشے کا جگر لے کے کیوں نکلے ہو انور
اس شہر کے انسان تو پتھر کے بنے ہیں

اس شہر نے فسادات کے علاوہ 15 مارچ 1920 میں ہڑتالی مزدوروں پر گولی چلنے کے حادثے میں 5 مزدوروں کو مرتے ہوئے دیکھا ہے۔ مزدور تحریک کے لیڈروں حاجرہ سنگھ، عبدالباری اور وی جی گوپال کو جامِ شہادت پیتے ہوئے دیکھا ہے۔ جمشید پور ایمبولنس حادثے کی طرح جو بلی پارک آتش زنی اور مانگو پل میں سیکڑوں خواتین اور بچوں کی ہلاکت کا بھی گواہ ہے۔ پروفیسر کمال احمد، صحافی الیاس احمد اور ٹیچر سراج انور خاں کو بھی اس شہر نے قریب سے قتل ہوتا ہوا دیکھا ہے۔

ایک دور تھا جب Telco, Tisco میں مزدوروں کو بہلا پھسلا کر لایا جاتا تھا۔ یہاں ایک لاکھ سے زائد مزدور کام کرتے تھے۔ مزدوروں کی فلاح و بہبود پر کمپنی خصوصی توجہ دیتی تھی۔ جدید ٹیکنالوجی کی آمد، گلوبلائزیشن اور عالمی بازار میں مقابلہ آرائی نے کمپنی کی صورت ہی بدل کر رکھ دی ہے۔ کمپنی نے ESS اور VRS لاگو کر کے مزدوروں کو چھانٹتے چھانٹتے 7 ہزار پر پہنچا دیا ہے۔ اب تو کمپنی کا ڈھیر سارا کام Jusco کرتی ہے۔ جہاں مزدوروں کی تنخواہ ٹیسکو کے مقابلے آدھی کی آدھی بھی نہیں ہوتی ہے۔

یہ سارا کھیل جے جے ایرانی کے وقت میں شروع ہوا جے جے ایرانی مزدور مخالف تھا۔ جس نے نوشیرواں جی کے انسانیت نوازی کے خواب کو چور چور کرنے میں ایک اہم رول ادا کیا۔ کمپنی میں ESS اور VRS اسی نے لاگو کیا۔ نوشیرواں جی کی انسانیت نوازی کا ذکر MR Lala نے اپنی کتاب The Creation of Weath میں کچھ اس طرح کیا ہے:

"ہمارے نزدیک دولت جمع کرنے سے زیادہ اہم دولت کو انسانی فلاح و بہبود کے لیے خرچ کرنا ہے۔ ہم محض لوہے کی تجارت کی غرض سے کارخانہ نہیں بنا رہے

ہیں۔ ہماری کچھ انسانی اور سماجی ذمے داریاں بھی ہیں۔''

ایسا کچھ ہونے کے باوجود جمشید پور دہلی کے بعد اچھی اسکولی تعلیم کے لیے مشہور ہے۔ انجینئر نگ کی تعلیم کے لیے عالمی شہرت یافتہ کالج XLRI یہیں موجود ہے:

National Institute Of Technology
National Meterlogical Laboratory
Indian Institute of Metal

جمشید پور کی جان ہے... جمشید پور، جھارکھنڈ اور بہار کا خوبصورت اور صاف ستھرا شہر سمجھا جاتا ہے۔ اسے Green City بھی کہا جاتا ہے۔ تنوشری دتہ، کرینہ کپور، امتیاز علی، بچیندری پال، بی زیڈ مائل، سید احمد شمیم، ذکی انور، جے نند، کمل اور سی بھاسکر راؤ جیسی شخصیتوں نے اس شہر کو ایک الگ ہی پہچان دی ہے۔

بی زیڈ مائل: بی زیڈ مائل کے شعری مجموعہ 'گلِ رنگ' میں 'عرضِ حال' کے تحت شمس صدیقی رقمطراز ہیں:

جناب بی زیڈ مائل کی ذاتِ گرامی اسی سرزمینِ سنگ و آہن میں بلا شبہ ایک مینارۂ نور تھی۔ آپ نے جمشید پور میں اردو زبان و ادب کی جو خدمات انجام دی ہیں، انھیں اس شہر کی تاریخ کبھی بھلا نہیں سکے گی۔

ان کے بعض اشعار آج بھی زبان زد عام ہیں۔ مثلاً:

جہاں تیرگی کو دیکھا وہیں اپنے گھر کو پھونکا
مرا یہ جنونِ خدمت کوئی لے سکے تو لے لے

فسانے جا کے کس دامن میں منہ اپنا چھپائیں گے
حقیقت نے جو چادر رُخ سے سرکائی تو کیا ہوگا

چمن میں آئی ہے فصلِ بہار کیا کہیے
ترس رہے ہیں گُلِ لالہ تازگی کے لیے

لطفِ زیست پاؤ گے
غم میں مسکراؤ تو

لذتِ سوز میسّر نہیں پروانے کو
وہ سمجھتا ہے بقا، عشق میں جل جانے کو

یہ ہے انجام بزمِ آرائی
ہم نے جاں دی، کسی کا نام ہوا

بی زیڈ مائل کے ایک شعر— کسی کو اب کسی کا غم نہیں ہے/کسی کا غم کسی سے کم نہیں ہے۔ پر کسی نے فلمی گیت ہی لکھ دیا ہے۔ یہ فلمی نغمہ آج بھی سنا جاتا ہے۔

ایک طرف شہرِ آہن کا ایک مظلوم شاعر شاہد جمشید پوری شہر کے خود ساختہ استادوں اور منافقینِ ادب سے اتنا دل برداشتہ ہوا کہ شعر تک کہہ ڈالا:

ناداں سخن وروں کی جہاں میں کمی نہیں
اس شہر میں خود ساختہ استاد بہت ہیں

اور دوسری طرف بی زیڈ مائل نے 'مائل سنبھل کر چلیے یہ جمشید پور ہے'' کہہ کر لوگوں کو ہوشیار کرنے کی کوشش کی...

اور آج بھی ہمارے شہر میں منافقینِ ادب اور خود ساختہ استادوں کی کمی نہیں ہے۔ جھارکھنڈ میں جوں جوں اردو رسم الخط کا دائرہ سمٹتا جارہا ہے، ہمارے شہر میں ادب کے ڈاکٹر اب اتنی ہی تیزی سے پیدا ہو رہے ہیں۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

بننے لگے ہیں ادب میں یہاں جتنے ڈاکٹر
اردو زبان اتنی ہی بیمار ہوگئی

سید احمد شمیم: سید احمد شمیم شہرِ آہن کے ان خوش نصیب قلمکاروں میں اپنی ایک انفرادی حیثیت رکھتے ہیں۔ جو بیک وقت نثر و نظم میں نہ صرف دسترس رکھتے ہیں بلکہ یہ فرق کرنا خاصا دشوار ہو جاتا ہے کہ شاعری اچھی کرتے ہیں کہ نثر اچھی لکھتے ہیں۔ شمیم صاحب کے دو

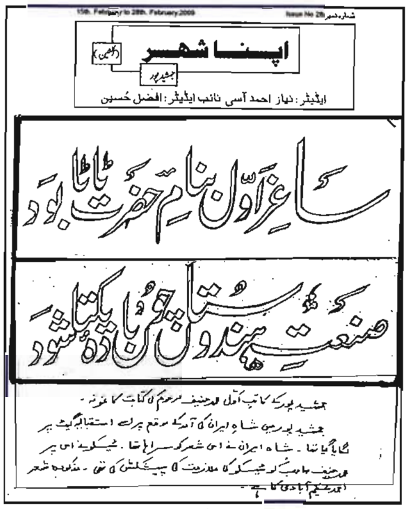
15th. February to 28th. February 2009 — Issue No 29 شمارہ نمبر

اپنا شہر

(انتخاب) جمشید پور

ایڈیٹر: نیاز احمد آسی نائب ایڈیٹر: افضل حسین

ساغرِ اول بنامِ حضرت ٹاٹا بود
صنعتِ ہندوستاں چوں بادہ یکتا شود

جمشید پور کے کاتبِ اول محمد حنیف مرحوم کی کتابت کا نمونہ۔
جمشید پور میں شاہِ ایران کی آمد کے موقع پر اسے استقبالیہ گیٹ پر لگایا گیا تھا۔ شاہِ ایران نے اس شعر کو سراہا تھا۔ ٹسکو نے اس پر محمد حنیف صاحب کو ٹسکو کی ملازمت کا سپیشلسٹ کی تھی۔ مذکورہ شعر امجد نعیم آبادی کا ہے۔

شعری مجموعے بے در و دیوار/ ڈوبتی شام اور نثری مجموعے ارژنگ اور بند آنکھوں کا تماشہ شائع ہو چکے ہیں۔ 'حرف حرف آئینہ' سید احمد شمیم پر لکھی گئی تحریروں کا انتخاب ہے۔ جو ریسرچ اسکالروں کے کام آسکتا ہے۔

ان کے بعض اشعار آفاقی حیثیت کی حامل نظر آتے ہیں:

کتنی عمریں بیت چکیں تو ایک یہی سچ جانا ہے
دنیا ریت ہے مٹھی بھر کی کیا کھونا کیا پانا ہے

مسافرت کی تھکن اٹھائے، میں آج حیرت زدہ کھڑا ہوں
تمام اطراف گم ہوئے ہیں، سفر بھی بے راستہ ملا ہے

کچھ تو میری فطرت میں ہے، مجبوری انا کی
کچھ ناز اٹھانے کا سلیقہ بھی نہیں ہے

آئینہ لے کے ہاتھ میں رونے لگے شمیم
ملنے کو اپنے آپ سے جی ترس گیا

اُس نے شمیم دل سے مجھے یوں بھلا دیا
سگریٹ جیسے پھینک دے کوئی بجھی ہوئی

امجد علی: جمشید پور کے موجودہ نثر نگاروں میں امجد علی کا نام سامنے آتا ہے۔ امجد علی کمیونسٹ پارٹی سے منسلک تھے۔ 1964 میں رونما ہونے والے فسادات سے دل برداشتہ ہو کر پاکستان ہجرت کر گئے۔ جمشید پور کے مزدوروں کے مسائل پر ان کا ناول 'مٹی کا قرض' بہت مقبول ہوا۔ ان کی آخری تخلیق ان کی 'آپ بیتی' تھی...

دوسرا نام شمیم چواروی کا ابھر کر سامنے آتا ہے۔ جو اپنے حادثے کا اکیلا گواہ تھا۔ ان کی شخصیت کے کربناک پہلو کو شاہد جمشید پوری کے اس شعر سے سمجھا جا سکتا ہے:

سیاہ رات کے ناگوں نے ڈس لیا مجھ کو
میں اپنی موت کا خود آپ ذمے دار رہا

شمیم چواروی کی زبان بڑی خوبصورت تھی۔ ان کے افسانوں میں جمشید پور کی مٹی کی مہک رچی بسی تھی۔ 'اور بوجھ بڑھتے ہیں' ان کا پہلا اور آخری افسانوی مجموعہ تھا۔

محمود واجد ان دنوں پاکستان میں ہیں *''خزاں کے پھول اور بہار کے دن'' ان کا افسانوی مجموعہ ہے۔ محمود واجد صحافی کی حیثیت سے اپنی ایک پہچان بنا چکے ہیں۔ ل م شاہد اور حمید عالم نے بہت کم کہانیاں لکھیں اور گوشۂ گمنامی میں چلے گئے۔

ذکی انور: اردو کا وہ مظلوم افسانہ نگار ہے جسے 1979 کے فساد میں اُن کے پڑوسیوں نے اُنھیں مار کر اُسی کنویں میں پھینک دیا، جس کنویں سے وہ اپنے پڑوسیوں کے گھر میں لگی آگ بجھا رہے تھے۔ ذکی انور کا قتل جمشید پور کے فساد کا ایک دردناک باب ہے۔ فساد کے بعد جب شریمتی اندرا گاندھی جمشید پور تشریف لائی تھیں تو ذکی انور کے جلے ہوئے گھر بھی گئی تھیں اور اس جلی ہوئی کرسی پر بیٹھی تھیں جس پر بیٹھ کر ذکی انور کہانیاں لکھتے تھے۔ ذکی انور نے خوب لکھا۔ کہا جاتا ہے 500 کے قریب افسانے لکھے۔ 32 ناول اور کئی ڈرامے تحریر کیے۔ اپنی زود نویسی کے لیے مشہور ذکی انور کی پہلی کہانی 1945 میں کلکتہ کے 'جدید اردو' میں شائع ہوئی تھی۔

گربچن سنگھ: گربچن سنگھ بھی ذکی انور کی طرح بسیار نویس تھے۔ ل م شاہد کی طرح محفل سے گھبراتے تھے۔ بعد میں ہندی میں بھی لکھنا شروع کیا۔ ہندی والوں نے کچھ پزیرائی کی۔ ان کا پہلا افسانہ 1945 میں 'جانے کب؟'، 'ساقی' میں شائع ہوا تھا۔ ان کے دو

* نوٹ: نجم ثمانی ایڈیٹر 'سب رنگ' دھنباد کی اطلاع کے مطابق محمود واجد کا انتقال ہوگیا ہے (آبشار، کولکتہ، 29 ستمبر 2013)

افسانوی مجموعے 'بھوکا سورج' اور 'ببلو کے پاپا' شائع تو ہوئے مگر مقبول نہ ہوسکے۔ ان کا ایک ناولٹ 'بن پاکھی' بھی شائع ہوا تھا۔ گربچن سنگھ کی تحریروں میں پنجابی ماحول اور کردار کی بھرپور عکاسی نظر آتی ہے۔ ان کا ہندی مضمون 'سفرنامۂ پاکستان' مقبول ہوا تھا۔

1970 کے بعد انور امام، تنویر اختر رومانی، ناچیز (نیاز احمد آسی) ناصر راہی، ارمان شاب، حیدر راحت، اختر آزاد جیسے افسانہ نگار بڑے طمطراق سے افسانوی ادب میں ابھر کر سامنے آئے۔ مگر اختر آزاد اور نیاز احمد آسی کے علاوہ سارے لوگ افسانوی منظر سے غائب ہوگئے۔

نیاز احمد آسی: ناچیز شہرِ آہن کا وہ خوش نصیب قلمکار ہے جس کا قلم ذکی انور کی طرح چلتا رہتا ہے۔ ناچیز کے 200 سے زائد افسانے، مضامین ملک کے مختلف اخبارات و رسائل میں شائع ہوچکے ہیں۔ 'تکلف برطرف' ناچیز کا مستقل کالم ہے جو پچھلے کئی برسوں سے روزنامہ 'فاروقی تنظیم' رانچی میں شائع ہورہا ہے۔ ناچیز کے افسانوں یا مضامین کا مجموعہ اب تک کتابی شکل میں منظرِ عام پر نہیں آیا ہے۔

اختر آزاد: مجموعوں کی اشاعت کے لحاظ سے شہر کا سب سے بڑا افسانہ نگار ہے۔ ان کا قلم بھی رواں، دواں ہے۔ یہ ادب میں Expriment کے قائل ہیں۔ زبان کو چھان پھٹک کر خوبصورت لفظوں کی پھلجھڑیوں سے سجانے، سنوارنے کی کوششوں میں اصل تھیم سے بھٹک جاتے ہیں اور بھومیکا اتنی طویل باندھتے ہیں کہ افسانے سے اصل روح غائب ہوجاتی ہے اور افسانے سے پھوہڑپن صاف جھلکنے لگتا ہے... مگر اختر آزاد کے ساتھ ایک بات بہت اچھی ہے کہ وہ فطرتاً محنتی واقع ہوئے ہیں اور زمانے کی نبض کو بھی پہچانتے ہیں۔ اسی لیے خود کو High light کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں۔ 'جوتے سے پیر کے درمیان' ان کی ایک اچھی کہانی کہی جاسکتی ہے۔

تنویر اختر رومانی: تنویر اختر رومانی کی افسانہ نگاری کی مدت بہت مختصر ہے۔ افسانہ نگاری کے فن اور لوازمات سے واقف تنویر اختر رومانی ایک ذہین اور کامیاب افسانہ نگار ہوسکتے تھے مگر انھوں نے 'جماعتِ اسلامی' میں جائے پناہ تلاش کرلی ہے اور افسانہ نویسی سے توبہ کرلی ہے۔

مہتاب عالم پرویز: مہتاب عالم پرویز نے لگ بھگ 15 سال خلیج میں ملازمت کے بعد اپنا سائبر کیفے کھول رکھا ہے۔ خالی وقت میں افسانہ لکھتے ہیں اور اپنا مجموعہ شائع کرواتے ہیں۔ دو سال کے اندر ان کے دو افسانوی مجموعے شائع ہوچکے ہیں۔ تیسرا مجموعہ زیرِ اشاعت ہے۔

انور امام: ناصر راہی کی طرح کم لکھتے ہیں۔ ان کا ایک افسانوی مجموعہ 'ہمزاد' شائع ہوچکا ہے۔ اس مجموعہ میں شامل ان کی ایک کہانی 'ماسٹر دینا ناتھ' اچھی کہانی کہی جاسکتی ہے۔

اردو صحافت

جمشید پور میں اردو صحافت بے جڑ کے پودے کی طرح رہی ہے۔ کل بھی کچھ لوگ شوقیہ رپورٹنگ کرتے تھے اور آج بھی یہی حال ہے۔ ویسے بھی اردو اخبارات عام طور پر رپورٹروں اور قلمکاروں کو کوئی نذرانہ نہیں دیتے ہیں۔ اسی لیے دوسری زبان کے مقابلے اس پیشے میں اردو کی نئی نسل نایاب ہے۔ جمشید پور سے مظفر حسن نے روزنامہ 'صدائے ہاتف' نکالنے کی کوشش کی مگر مقدمہ بازی کی وجہ سے ناکام ہوگئے۔ اس وقت ایم ندیم احسن اور م ش م جمشید پوری اردو رپورٹنگ کا پرچم بلند کیے ہوئے ہیں۔

تعلیمی ادارے

جمشید پور میں اردو اور تعلیم کو عام کرنے میں کریمیہ ٹرسٹ کی اپنی ایک تاریخ رہی ہے۔ اس کے بعد کبیر اسکول، پبلک ویلفیئر اسکول، مدرسہ فیض العلوم جیسے تعلیمی ادارے آج بھی اپنی شان بان اور آن کے ساتھ اپنی روشنی بکھیر رہے ہیں۔

علامہ ارشد القادری کی زیر تعمیر مزار

خطیب بے مثال

جمشید پور میں دو خطیب ایسے گزرے ہیں جن کی تقریریں سننے کے لیے ہزاروں، لاکھوں کی تعداد میں لوگ امڈ پڑتے تھے اور جن کی تقریریں ضلع انتظامیہ ٹیپ کیا کرتی تھی۔ میری مراد علامہ ارشد القادریؒ اور ڈاکٹر نورالزماں خاں سے ہے۔

جمشید پور میں اردو زبان و ادب کی موجودہ صورت حال

آج سے 30-35 سال قبل تک جمشید پور میں اردو زبان و ادب کا عروج تھا۔ جب کہ اُس وقت مسلمانوں کی آبادی آج سے آدھی تھی۔ کلکتے سے کئی اردو کے روزنامے مثلاً آزاد ہند، عصرِ جدید، غازی اور پٹنہ سے سنگم کثیر تعداد میں آتے تھے۔ جو سب کے سب لیتھو میں چھپتے تھے اور ہاتھوں ہاتھ لیے جاتے تھے۔ ہفت روزوں میں نشیمن، نئی دنیا اور بلٹز کی دھوم تھی۔ رسالوں میں شمع، روبی، بیسویں صدی، خاتونِ مشرق، فلم اور اسپورٹس کی ہزاروں کاپیاں فروخت ہوجاتی تھیں۔ اُس دور میں ہندی کے اخبارات محدود پیمانے پر کولکتہ اور پٹنے سے آتے تھے۔ انگریزی میڈیم کے اسکولوں کی تعداد انگلیوں پر گنی جاتی تھی۔ صرف اور صرف اردو/ ہندی میڈیم کے اسکول نظر آتے تھے اور اب حالات بدل چکے ہیں۔ حالانکہ اب اردو کے اخبارات (جو رنگین آفسیٹ پر کمپیوٹر کمپوزنگ کیے ہوئے شائع ہوتے ہیں۔ رسالے بھی ملٹی کلر ہوگئے ہیں) محدود پیمانے پر آتے ہیں۔ اردو اخبارات پڑھنے والوں 90 فیصدی افراد کی عمر 60 سے اوپر کی ہوتی ہے۔ یہی حال اردو میڈیم اسکولوں کا ہے۔ پچھلے 30-25 برسوں میں ایک بھی نئے اردو میڈیم اسکول کا قیام عمل میں نہیں آیا ہے اور چند بچے کھچے اردو میڈیم اسکول ہیں بھی تو وہ حالتِ نزع میں ہیں۔ بچے ندارد۔ جمشید پور میں اردو ادب کی کیا صورتِ حال ہے اس کا اندازہ اسی بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ 'آزاد کتاب گھر' میں 'شاعر' کی 5 کاپیاں 50 برسوں سے منگائی جاتی ہیں، جسے فروخت ہونے میں کبھی کبھی مہینوں لگ جاتے ہیں۔ 'آجکل' کی 10 کاپیاں نہیں بکتی تھیں۔ مجبوراً دکاندار نے بند کردیا۔ 2 روپے کا تعمیر ہریانہ پڑھنے والے اس شہر میں 10 افراد نہیں تھے۔ اسے بھی بند کردیا گیا۔ یہاں کی مسلم لائبریری میں اب اردو کی کتابیں پڑھنے والے نہیں ہیں۔ آج سے 30 سال قبل ہندوؤں کی دکانوں کے سائن بورڈ میں اردو نظر آتی تھی۔ اب مسلمانوں کی دکانوں کے سائن بورڈوں اور دعوت ناموں سے اردو غائب ہوچکی ہے۔

آخر میں اپنی بات صدیق مجیبی کے ان اشعار سے ختم کرنے کی اجازت چاہتا ہوں:

کوئی تو اس بے حسی کو توڑے — کوئی تو روشن دماغ کھولے
اندھیرا ذہنوں میں بس رہا ہے — کوئی تو چراغ لے کر نکلے
یہ شہر مسکن تھا آگہی کا — یہ شہر گہوارۂ ادب تھا
یہاں کی تہذیب مرگئی کیوں — کہیں تو کچھ سراغ نکلے

■

Neyaz Ahmad Aasi, Home No2, Road No 10/B, Azad Nagar, Jamshedpur- 832110 (Jharkhand)

سید سجاد حسین

تمل ناڈو میں اردو صحافت - ماضی اور حال

تمل ناڈو میں اردو صحافت کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے جتنی ہندوستان کی دیسی زبانوں میں صحافت کی تاریخ۔ ہندوستانی زبانوں میں صحافت کا آغاز سب سے پہلے بنگالی زبان میں ہوا جب اپریل 1818 میں بنگالی زبان میں 'ڈگ درشن' کے نام سے ایک ماہانہ اخبار شائع ہوا تھا۔ اگر چہ اردو اور فارسی کا چھاپہ خانہ ہندوستانی پریس کے نام سے ڈاکٹر جان گلکرائسٹ نے 1801 میں قائم کیا تھا مگر ہفتہ وار 'جامِ جہاں نما' کی اشاعت کلکتہ میں 27 مارچ 1822 کو عمل میں آئی۔ اردو صحافت کو کلکتہ سے دلی پہنچنے میں چودہ سال لگ گئے کیونکہ دلی کا پہلا اردو اخبار 'دلی اردو اخبار' 1836 میں جاری ہوا تھا۔ دلی سے اردو صحافت اپنی منزلیں طے کرتی ہوئی پانچ سال کے اندر مدراس پہنچ گئی اور اس نے 1841 میں یہاں 'جامع الاخبار' کی اشاعت کے ساتھ اپنا سکہ جمالیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ اتر پردیش، پنجاب، گجرات، مہاراشٹرا، آندھرا پردیش اور کرناٹک میں لوگ ابھی اردو صحافت سے آشنا نہیں ہوئے تھے۔ بقول پروفیسر عابد صفی:

''گویا رودِ گنگا سے نیچے اردو صحافت سب سے پہلے مدراس میں رونما ہوئی''

اس وقت صرف شہر مدراس سے بیسیوں اخبار و رسائل آسمانِ صحافت پر نمودار ہوئے اور کئی سال تک اپنے وجود سے مدراس اور بیرون مدراس کے ماحول کو منور کرتے رہے۔ تمل ناڈو میں آغاز ہی سے اخبار و رسائل ایک خاص مقصد کے تحت نکلے اور وہ اپنے مقصد پر آخر تک کار بند رہے۔ 'جامع الاخبار' کے بعد 1841 سے 1850 تک دس سالوں کے اندر شہر مدراس سے حسبِ ذیل اخبار جاری ہوئے۔

مرآۃ الاخبار	1845
صادق الاخبار	1845
اعظم الاخبار	1848
رئیس الاخبار	1849
تیسیر الاخبار	1849
آفتاب عالم تاب	1849
عمدۃ الاخبار	1849
مخزن الاخبار	1850

ان تمام اخباروں نے اپنی شناخت صرف تمل ناڈو کی سرحد تک محدود نہیں رکھی بلکہ یہ سب کے سب تمل ناڈو سے باہر بھی دور دور تک پہچانے جاتے تھے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ تمل ناڈو کے ان اخباروں کی خبریں دلی، رام پور، آگرہ سے نکلنے والے اخباروں میں نقل کی جاتی تھیں۔ یہ اخبار نہ صرف دور دراز علاقوں میں مقبول تھے بلکہ خود کفیل بھی تھے۔ انھیں کافی تعداد میں خریدار بھی میسر تھے۔ 1848 میں جاری ہوئے 'اعظم الاخبار' کو مدراس کے ایک بہت ہی اہم اخبار کی حیثیت حاصل ہوگئی تھی اس میں اس زمانے کے تعلیمی، تمدنی اور سیاسی حالات پر مبنی خبریں شائع ہوتی تھیں۔ اس اخبار کی سب سے بڑی خوبی یہ بتائی جاتی ہے کہ اس نے ذات پات کے فرق کو مٹانے اور مختلف مذاہب کو ماننے والوں میں اتحاد کو بڑھانے کے لیے بحسن و خوبی اپنا کردار نبھایا ہے۔ 1851 سے 1860 کے دوران مدراس کے صحافتی افق پر مزید سات اخبار نمودار ہوئے؛

نعیم الاخبار	1851
صبح صادق	1855
طلسمِ حیرت	1856
مدراس پنچ	1856
مظہر الاخبار	1856
خلاصۃ الاخبار	1857
اور	
شمس الاخبار	1859

ان میں 'طلسمِ حیرت'، 'مدراس پنچ'، اور 'شمس الاخبار' نے ہندوستان گیر شہرت پائی۔ ان اخباروں نے پچاس سال سے بھی زیادہ عمریں پائیں۔ اس طویل مدت تک تمل ناڈو میں ان اخباروں کی اشاعت نے ایک ایسا تاثر قائم کیا کہ یہاں صحافت کی تاریخ ایک نئی کروٹ لیتی نظر آتی ہے۔ ماہانہ کے بجائے اب یہ تمام اخبار ہفتہ وار یا عشرہ وار ہوگئے تھے۔ مہینے میں تین یا چار بار بڑے تزک

واحتشام کے ساتھ چھپتے تھے۔ان کی زبان بھی صاف، شستہ اور رواں ہوتی تھی۔ ہر طرح کی خبریں ان میں جگہ پاتی تھیں۔خبروں کے علاوہ دلچسپ مضامین بھی شائع ہوتے تھے۔

مدراس سے نکلنے والے اخباروں میں 'شمس الاخبار' کو سب سے زیادہ اہمیت اس لیے بھی حاصل تھی کہ یہ وہ مایہ ناز قدیم اخبار ہے،جس نے پچاس برس سے بھی زیادہ کی عمر پائی اور دور دور تک اپنی پہچان بنالی تھی۔ 1878 میں روم اور روس کی جنگ کے زمانے میں اس اخبار نے حکومتِ ترکی کی امداد کی ترغیب دلائی جس کے نتیجے میں ملک کے گوشے گوشے سے ہزار ہا روپے چندہ جمع ہوا جسے اس اخبار کے وسیلے سے سلطنت عثمانیہ کی خدمت میں روانہ کیا گیا۔ یہاں پر یہ بات بھی واضح کرتا چلوں کہ روم اور روس کی جنگ کے زمانے میں 'شمس الاخبار' روزانہ چھپتا رہا۔ اس طرح تمل ناڈو کی سرزمین سے نکلنے والا پہلا روزنامہ ہونے کا شرف بھی اسے حاصل ہے۔

1861 سے 1870 کے درمیان نکلنے والے اخباروں میں 'نیر اعظم' 1864 اور 'عمدۃ الاخبار' 1863 بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔یہ دونوں اخبار ہفتہ وار تھے۔ پرانے اخباروں میں 'صادق الاخبار'، 'طلسم حیرت' اور 'شمس الاخبار' اس دہائی میں بھی جاری تھے۔'نیر اعظم' کے تعلق سے یہ بات مشہور ہے کہ یہ اخبار کتابت وطباعت کے لحاظ سے اپنے عہد کا ایک نفیس اخبار مانا جاتا تھا۔اس میں نثر ونظم دونوں حصے بڑے ہی دلکش ہوتے تھے۔اخبار 'صبح صادق' سے اس کی معاصرانہ چشمک رہتی تھی۔ کبھی کبھی یہ چشمک اس قدر تلخی اختیار کر جاتی تھی کہ 'نیر اعظم' تہذیب واخلاق کا جامہ اتار پھینکنے پر آمادہ ہوجاتا۔'ماہِ نو' 1864 ، 'ریاض الاخبار' 1866 اور 'مفید عام' 1869 اس دہائی کے دوسرے اخبار ہیں۔ان میں 'مفید عام' خواتین کے لیے مخصوص تھا۔ اس کا واحد مقصد عورتوں کی تعلیم و تربیت تھا۔

1870 کے بعد جاری ہونے والے اخبارات کی فہرست میں 'یادگارِ زمانہ' 1871 'صفیرِ مدراس' 1874 'جریدۂ روزگار' 1875 اور 'مظہر العجائب' 1878 شامل ہیں۔ان میں سے صرف 'جریدۂ روزگار' اور 'مظہر العجائب' زیادہ دور دور تک مشہور ہوئے۔ جنگ عظیم کے دوران 'جریدۂ روزگار' روزانہ چھپنے لگا اور ساتھ ہی ساتھ اس میں حیدرآباد کی خبریں بھی زیادہ سے زیادہ جگہ پاتی تھیں۔ 1881 سے 1890 کے درمیان تقریباً بارہ نئے اخباروں کا اضافہ ہوا لیکن بقول ڈاکٹر عبدالحق مدراسی:

'' 1880 کے بعد شائع ہونے والے اخبارات زیادہ مدت تک جاری نہ رہ سکے اور میدانِ صحافت میں یہ جدید اخبارات پرانے اخبارات کے مقابلے کی تاب نہ لاکر اکثر وبیشتر سال یا دو سال کے عرصے میں بند ہوگئے۔''

1883 میں ایک اور ہفتہ وار اخبار 'حاکم' جتنی آب و تاب کے ساتھ جاری ہوا تھا اتنی ہی تیزی سے بند بھی ہوگیا۔ اس اخبار کی کوئی کاپی دستیاب نہ ہوسکی اس سے متعلق مزید تفصیل دینے سے قاصر ہیں۔

1884 میں 'اتفاق' جاری ہوا۔ یہ ہفتے میں دو مرتبہ چھپتا تھا۔اس اخبار کے بانی میر ہمایون جاہ، انجمن اسلام کے میر مجلس تھے۔اس اخبار کی مانگ کے پیش نظر ایک سال بعد 1885 میں یہ روزانہ چھپنے لگا۔اس طرح اسے تمل ناڈو کا دوسرا روزنامہ ہونے کا امتیاز حاصل ہے۔

1880 کے بعد شائع ہونے والے اخبارات زیادہ مدت تک جاری نہ رہ سکے اور میدانِ صحافت میں یہ جدید اخبارات پرانے اخبارات کے مقابلے کی تاب نہ لاکر اکثر و بیشتر سال یا دو سال کے عرصے میں بند ہوگئے۔

1884 میں مدراس سے کئی اور اخبار نکلے جن میں 'اتحاد'، 'دبیر مدراس' اور 'تحفہ' کا ذکر کیا جاتا ہے۔'اتحاد' سے متعلق ڈاکٹر عبدالحق مدراسی لکھتے ہیں؛

''جنوری 1884 میں ترملکھری موجودہ نام ٹرپلی کین، میں ایک مجلس احباب قائم ہوئی تھی جس کے سکریٹری عبدالوہاب صاحب تھے۔ان کی سعی وکوشش سے مجلس کی جانب سے 'اتحاد' نامی ہفتہ وار نکلنے لگا جو ہر دوشنبہ کو شائع ہوتا تھا۔''

اس اخبار نے سیاسی خبروں کے ساتھ ادبی وتنقیدی مضامین کی اشاعت سے قارئین میں اپنی ایک علاحدہ شناخت قائم کرلی تھی۔'دبیر مدراس' مدراس سے نکلنے والے اخباروں میں 'طلسم حیرت' اور 'مدراس پنچ' کے بعد دوسرا اہم اخبار ہے جو اپنے اندر طنز ومزاح اور ظرافت کی چاشنی لیے ہوتا تھا۔منشی محی الدین خاں تسنیم اس اخبار سے منسلک تھے ڈاکٹر عبدالحق لکھتے ہیں کہ ان کی ادارت میں 'دبیر مدراس' کو ادبی حلقوں میں کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔لیکن تسنیم صاحب کی اس اخبار سے علاحدگی کے بعد یہ اخبار بند ہوگیا۔ کہا جاتا ہے کہ تسنیم صاحب بعد میں اخبار 'دبیر ہند' سے منسلک ہوگئے اور 1885 میں 'دکن پنچ' کے عنوان سے اس اخبار سے ایک ضمیمہ جاری کر کے علمی اور ادبی مضامین لکھتے رہے۔

شہر مدراس کے پندرہ روزہ اخباروں میں اخبار 'تحفہ' کو اپنے مضامین کی نوعیت اور زبان و بیان کے اعتبار سے خاص و عام میں کافی مقبولیت حاصل رہی۔ اس سے متعلق اس کے قارئین کے حلقوں میں یہ بات مشہور تھی کہ یہ علوم وفنون کا مخزن، مباحث علمی کا معدن، سیاسی معاملات کا واقف کار، شعر وسخن کی تشہیر کا ضامن اور دینی و دنیوی افکار کا مبلغ تھا۔

مدراس سے شائع ہونے والے پندرہ روزہ رسائل میں 'نورِ جنوب' بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ یہ رسالہ علیم صبا نویدی کی ادارت میں 2000 میں جاری ہوا اور تقریباً تین سال تک شائع ہوتا رہا۔ 2005 سے 'نورِ جنوب' سہ ماہی میں تبدیل ہوگیا اور 2007 تک اس کے صرف سات شمارے منظر عام پر آسکے۔

ایک شہر مدراس ہی پر موقوف نہیں تمل ناڈو کے دیگر شہروں سے بھی اخبار و رسائل جاری ہوئے جن کے تذکرے کے بغیر تمل ناڈو میں اردو صحافت کی تاریخ نامکمل سمجھی جائے گی۔ اگرچہ مدراس میں اردو صحافت کی ابتدا 1841 میں 'جامع الاخبار' کی اشاعت کے ساتھ ہوچکی تھی مگر اسے مدراس سے وانمباڑی تک کا راستہ طے کرنے کے لیے تقریباً سولہ سترہ سال کی مزید مدت درکار ہوئی۔ مولوی خطیب عبدالجلیل کا کہنا ہے کہ وانمباڑی کا اولین مطبوعہ رسالہ 'الیتامیٰ' ہے جسے یتیم خانۂ اہل اسلام، وانمباڑی نے 1857 میں جاری کیا تھا۔ اس رسالے کی اشاعت کے تقریباً بیس سال تک وانمباڑی کے آسمانِ صحافت پر کوئی اخبار یا رسالہ نمودار نہیں ہوا۔ البتہ 1886 میں حکیم سید عقیل علی نے 'گلزارِ سخن' کے نام سے ایک رسالہ مرتب کیا جس میں وانمباڑی میں منعقد ہ چھ مشاعروں کی روداد اور کلام شامل ہے۔ اس مطبوعہ رسالے میں حکیم سید عقیل علی کے پیش لفظ کے علاوہ خطیب قادر باشاہ اور مولوی شاہ ولی اللہ کی تقاریظ بھی شامل ہیں۔

رسائل وجرائد کی اشاعت سے قطع نظر وانمباڑی میں صحافت کا باقاعدہ آغاز اخبار 'ظہیر' کے اجرا سے ہوا۔ یہ اخبار 1900 میں محمدیہ پریس وانمباڑی میں طبع ہوکر شائع ہوتا تھا۔ پروفیسر جلال کڑپوی کا بیان ہے کہ یہ اخبار ٹائپ میں چھپتا تھا اس اخبار کے مدیر کا نام کیا تھا یہ اخبار کب تک جاری رہا، اس کے بارے میں نہ کوئی معلومات

حاصل ہوسکیں اور نہ ااس اخبار کا کوئی شمارہ دستیاب ہے۔

وانمباڑی کا دوسرا اخبار ہفت روزہ 'نصیر' ہے جو 6اگست 1906 کو ظہور پذیر ہوا۔ یہ اخبار بڑی پابندی سے ہر دوشنبہ کو حکیم صابر بنگلوری کی ادارت میں شائع ہوتا تھا۔ اس اخبار کے مالک محمد ابراہیم تھے۔ اخبار 'نصیر' سیاسی، معاشرتی، اخلاقی اور مذہبی موضوعات پر محیط ایک مکمل اخبار تھا۔ دنیا بھر کی خبریں، مقامی خبریں، صنعت و حرفت اور تجارتی معلومات وغیرہ اس کے مستقل کالم تھے۔ معاصر اخبارات میں 'آفتاب دکن' (مدراس)، 'وکیل ہند' (دلی)، 'مخبر' (امرتسر)، 'نیر اعظم' (مرادآباد)، 'برق سخن' (بنگلور) اور 'مفید عام' (آگرہ) نے اخبار 'نصیر' کے بارے میں نہ صرف اچھی رائے کا اظہار کیا ہے بلکہ اس کے معیار اور مضامین کی پیش کش کو سراہا بھی ہے۔ 'وکیل ہند' (دلی) سے ایک مثال یہاں پیش کی جاتی ہے:

''ہمارے پاس اخبار 'نصیر' (وانمباڑی) کے چند نمبر بغرض تبادلہ موصول ہوئے۔ یہ اخبار اپنے حجم میں ہر دلعزیز ہونے کا وثوق دلاتا ہے، بلحاظ مضامین اور دلچسپ خبروں کے مدراس احاطہ کے اردو اخباروں میں بہت اچھا ہے۔ اردو سلیس اور بامحاورہ ہے۔ اس کے ایڈیٹر حکیم صابر صاحب اسی طرح سے کوشاں رہیں تو یقین راسخ ہے کہ بہت جلد ترقی کرے گا۔''

اخبار 'نصیر' کے مفید اور مثبت کردار کے پیش نظر وانمباڑی میں اس کے بعد بھی ایک عرصے تک اچھے اخبار کی طلب باقی رہی اس کے نتیجے میں 21 سال کے طویل انتظار کے بعد 25اپریل 1927 کو ہفت روزہ 'رہبر' جلوہ نما ہوا۔ اس کے مدیر و مالک وانمباڑی کے مشہور شاعر منور عبدالقادر خالص تھے۔ یہ اخبار مدیر موصوف کے ذاتی پریس میں چھپ کر دفتر رہبر محمد علی بازار وانمباڑی سے ہر ہفتہ دوشنبہ کے دن شائع ہوتا تھا۔ اس اخبار کے اجرا سے متعلق قطعات تاریخ سے چند شعر ملاحظہ کیجیے جن سے اس کے معیار و مرتبے کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے؛

شکر خدائے خالق اکبر
ہے زیب عالم اخبار 'رہبر'
اب وانمباڑی کا ستارہ
چمکا مثال خورشید انور
سعی بلیغ مولانا خالص
لائی ہے کیا ہی رنگ مفخر
ہیں جمع اس میں ارباب ملت
اس کا نہ کیوں ہو پایا قوی تر

آزادی کے بعد وانمباڑی سے نکلنے والے رسائل وجرائد میں ماہنامہ 'حنا' ڈائجسٹ 1973، ہفت روزہ 'زحل' 1974 ماہنامہ 'صداقت' 1977 پندرہ روزہ 'شمشیر' 1991، پندرہ روزہ 'جواہر ہند' 1995، ماہنامہ 'صدف' 1996 اور ہفت روزہ 'آمادہ' 1977 خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ 1977 میں وانمباڑی سے ایک ماہنامہ 'آشیاں کے تنکے' بھی جاری ہوا۔ سی۔ محمد یعقوب اس کے مدیر و مالک تھے۔ اس ماہنامہ کو یعقوب اسلم عمری اور انور کمال کی سرپرستی بھی حاصل تھی۔ اگرچہ کہ ہندوستان کے اہم ترین شعرا اور ادبا کی تخلیقات اس میں جگہ پاتی رہیں لیکن بعض نامساعد حالات کے سبب یہ زیادہ مدت تک جاری نہ رہ سکا۔ آج سے بارہ سال قبل وانمباڑی سے ماہنامہ 'نشان منزل' جو بڑی پابندی سے پی۔ عبدالباری کی ادارت میں

> **مدراس سے نکلنے والے اخباروں میں 'شمس الاخبار' کو سب سے زیادہ اہمیت اس لیے بھی حاصل تھی کہ یہ وہ مایہ ناز قدیم اخبار ہے جس نے پچاس برس سے بھی زیادہ کی عمر پائی اور دور دور تک اپنی پہچان بنالی تھی۔ 1878 میں زوم اور روس کی جنگ کے زمانے میں اس اخبار نے حکومت ترکی کی امداد کی ترغیب دلائی جس کے نتیجے میں ملک کے گوشے گوشے سے ہزارہا روپے چندہ جمع ہوا جسے اس اخبار کے وسیلے سے سلطنت عثمانیہ کی خدمت میں روانہ کیا گیا**

شائع ہونا شروع ہوا تھا آج بھی پورے آب و تاب کے ساتھ جاری ہے۔ محدود وسائل کے باوجود عبدالباری صاحب اپنی ہمت مردانہ سے اس ماہنامہ کو جلا بخش رہے ہیں۔ اس کے پبلشر حکیم سید عبدالستار ہیں جن کا مالی تعاون اس ماہنامہ کی اشاعت کا سبب ہے۔ اس میں دینی و مذہبی موضوعات کے ساتھ ساتھ اردو دنیا کی خبریں اور ادبی مضامین بھی شائع ہوتے ہیں۔ اردو رائٹرس گلڈ کے زیر اہتمام سہ ماہی 'چراغ اردو' پہلی بار ستمبر 2011 کو وانمباڑی سے جاری ہوا۔ اس کے مدیر و مالک محمد یعقوب اسلم عمری تھے۔ ان کی ادارت میں صرف دو ہی شمارے نکلے تھے کہ آپ کا انتقال ہوگیا۔ اس کے بعد آپ کے فرزند محمد جاوید اکرم نے ادارت کی ذمے داری سنبھالی اور اپنے والد محترم کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اس سہ ماہی رسالے کو پابندی سے شائع کر رہے ہیں۔

ریاست تمل ناڈو میں وانمباڑی کی مانند اردو کے چند جزیرے اور ہیں جو تمل آبادی کے سمندر میں گھرے ہوئے ہیں۔ ایسا ہی ایک جزیرہ عمرآباد بھی ہے جہاں کی مشہور و معروف دینی علوم کی درسگاہ 'جامعہ دار السلام' تشنگان علم و دین کو سیراب کر رہی ہے۔ اس درسگاہ کے سابق شیخ الجامعہ مولانا شاکر نائطی نے 1935 میں ماہنامہ 'مصحف' جاری کیا تھا۔ ابتدا میں یہ ماہنامہ جامعہ دارالسلام عمرآباد کے اہل قلم طلبا اور اساتذہ کے مضامین کی اشاعت تک محدود تھا۔ بعد ازاں اس کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کے پیش نظر علامہ شاکر نائطی نے اسے نہ صرف قومی صحافت کے معیار پر لا کھڑا کیا بلکہ ہندوستان کے چوٹی کے فنکاروں مثلاً مولانا ماہر القادری، سرشار کسمنڈوی، نوح ناروی، کوثر چاندپوری، الطاف مشہدی، ملا رموزی، عرش ملسیانی، مولوی نصیرالدین ہاشمی اور ڈاکٹر محی الدین قادری زور کی تازہ ترین تخلیقات کو شائع کر کے اسے ایک دستاویز کی شکل دے دی۔ جامعہ دارالسلام عمرآباد کی درسگاہ سے نکلنے والا دوسرا رسالہ ماہنامہ 'راہ اعتدال' ہے جو 1981 سے بلاناغہ مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی کی ادارت میں شائع ہو رہا ہے۔ اس کے علاوہ اس درسگاہ سے ایک سالنامہ 'دارالسلام' بھی بڑی پابندی سے شائع ہوتا ہے۔

اردو کا ایک اور جزیزہ میل وشارم آرکاٹ سے متصل ایک چھوٹا سا قدیم شہر ہے یہاں کے اردو داں طبقے کے باذوق قارئین کی تشنگی مٹانے کے لیے 1952 میں علامہ محوی صدیقی نے دو ماہنامے 'معیار ادب' اور 'الارشاد' جاری کیے۔ ان میں اول الذکر خالص ادبی اور ثانی الذکر مذہبی و دینی افکار پر مشتمل تھا۔ 1960 میں محمد زکریا ذکی کے زیر ادارت یہاں سے ایک اور ماہنامہ 'گلستان' بچوں کے لیے جاری ہوا جو تقریباً ایک سال تک جاری رہا۔ اس کے کل گیارہ شمارے ہی منظر عام پر آسکے۔ 1963 کے لگ بھگ محمد عمر فاروق نے ایک ماہنامہ 'باغ و بہار' بچوں کے لیے جاری کیا یہ بھی تقریباً ایک سال تک جاری رہا پھر نامساعد حالات کے سبب اس کی اشاعت موقوف ہوگئی۔ اب صرف ایک ماہنامہ 'ندائے نیز' اپنی سخت جانی کا ثبوت دیتے ہوئے میل وشارم میں اردو کی ترجمانی کر رہا ہے۔ اس کے مدیر کنیار عزیز باشاہ ہیں۔ یہ خالص اسلامی اخبار ہے لیکن اس میں وقت ضرورت اردو اداروں کی سرگرمیوں سے متعلق خبریں بھی شائع ہوتی ہیں۔

ضلع ویلور کے صنعتی شہر آمبور کی مجلس جامع الخیر کا دینی، علمی و اصلاحی ترجمان ماہنامہ 'الخیر' مفتی محمد صلاح

الدین قاسمی کی ادارت میں گزشتہ دس سال سے بلا ناغہ نکل رہا ہے۔ اس میں اگر چہ ادبی مضامین کم ہوتے ہیں مگر جو بھی علمی و اصلاحی مضامین شائع ہوتے ہیں وہ معلوماتی ہونے کے ساتھ زبان و بیان کے اعتبار سے معیاری وٹکسالی ہوتے ہیں۔ ضلع ویلور کے ایک مردم خیز شہر پرنامبٹ سے 'اذانِ حرم' 1994 میں سہیل راشد کی ادارت میں جاری ہوا۔ یہ پندرہ روزہ علمی، ادبی و اصلاحی رسالہ تھا۔ اس میں مقامی اہل قلم جوش وخروش سے شریک ہوتے تھے۔ 'اذانِ حرم' میں قرآن، حدیث، فقہ اور اسلامی تعلیمات کے ساتھ ساتھ علمی، سیاسی، ادبی اور اصلاحی مضامین بھی شائع ہوتے تھے۔ نو سالہ صحافتی سفر کے دوران 'اذانِ حرم' نے شہر پرنامبٹ کی نئی نسل میں شعر و ادب کا ذوق پیدا کرنے میں اہم رول ادا کیا۔ افسوس کہ یہ رسالہ نو سال تک اپنی گراں قدر صحافتی خدمات انجام دے کر بعض نا گزیر حالات کے سبب بند ہوگیا۔ ایک اور ماہنامہ 'دعوۃ الحق' پرنامبٹ سے مئی 2005 کو مجلس دعوۃ الحق کی سرپرستی میں جاری ہوا۔ اس کے نگران مولانا قاضی محمد اسد اور مدیر مسئول مولانا قاری محمد عارف ہیں۔ یہ رسالہ نہایت عمدہ ٹائٹل، نفیس کاغذ، کمپیوٹر کمپوزنگ کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔ شاید پورے ملک میں اپنی نوعیت کا واحد رسالہ ہے جو مفت تقسیم ہوتا ہے۔ یہ خالص دینی و اصلاحی رسالہ ہے۔ اس کا واحد مقصد تبلیغ دین ہے۔

ویلور دارالسرور تمل ناڈو کا ایک تاریخی شہر ہے جو اپنے بطن میں اردو زبان و ادب کی ڈھائی سو سالہ تاریخ رکھتا ہے۔ شہر ویلور میں واقع دارالعلوم لطیفیہ تمل ناڈو کی سب سے قدیم درسگاہ ہے۔ سال نامہ 'اللطیف' اسی دارالعلوم لطیفیہ کا ترجمان ہے جو 1960 میں جاری ہوا۔ اس کے سرپرست حضرت مولانا سید شاہ محمد باقر قادری تھے۔ اب یہ رسالہ بڑی پابندی کے ساتھ ڈاکٹر سید عثمان قادری کی سرپرستی میں شائع ہو رہا ہے۔ اس کے مدیران مسئول محمد ابوبکر ملیباری اور مولانا ڈاکٹر بشیر الحق قریشی ہیں۔

شہر ویلور کی ایک اور دینی درسگاہ باقیات صالحات سے دو سالنامے جاری ہوئے۔ سالنامہ 'صفیر' 1970 میں ڈاکٹر راہی فدائی کی ادارت میں جاری ہوا اور 1988 تک شائع ہوتا رہا۔ سالنامہ 'نفیر' 1989 سے جاری ہوا۔ اسے انجمن ابنائے قدیم مدرسہ باقیات صالحات اپنی سرپرستی میں شائع کرتے رہے۔ یہ دونوں رسالے مواد ومعیار کے اعتبار سے دستاویزی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان میں تمل ناڈو کے برگزیدہ ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات اور تنقیدی وتحقیقی مضامین شائع ہوتے تھے۔ یہ دونوں رسالے کئی سال تک اپنی صحافتی خدمات انجام دینے کے بعد بند ہوگئے۔

ابھی دو سال قبل مدراس سے مارچ 2011 میں روزنامہ پیس وائس (امن کی آواز) جاری ہوا۔ یہ سہ لسانی اخبار ہے جو انگریزی تمل اور اردو تینوں زبانوں میں بڑی پابندی سے فاطمہ مظفر کی ادارت میں شائع ہو رہا ہے۔ اردو انجمنوں اور تعلیمی اداروں کی سرگرمیوں کے ساتھ

سیاسی خبریں بھی اس میں شائع ہوتی ہیں۔ ابتدا میں ایک سال تک یہ پندرہ روزہ اخبار تھا جب قارئین میں اس کی مانگ بڑھنے لگی تو اسے روزنامہ میں منتقل کردیا گیا ہے۔

تمل ناڈو میں اردو صحافت کے اس شاندار ماضی کو دیکھنے کے بعد جب ہم موجودہ صورت حال کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں بڑی مایوسی ہوتی ہے۔ ایک صدی قبل جہاں سے اردو کے 110 ماہنامے اور اخبار نکلا کرتے تھے وہاں اب ان کی اشاعت صرف دو چار ماہنامے اور روزناموں تک محدود ہوگئی ہے۔ صرف روزنامہ 'مسلمان' وہ واحد اخبار ہے جو پورے تمل ناڈو میں اردو صحافت کی نمائندگی کر رہا ہے۔ 1927 میں صدر کانگریس ڈاکٹر مختار احمد انصاری کے ہاتھوں روزنامہ 'مسلمان' کا اجرا عمل میں آیا تھا اور آج تک یہ پابندی سے شائع ہو رہا ہے۔ سید فضل اللہ اس کے مدیر اعلیٰ اور مالک تھے اب ان کے فرزند سید عارف اللہ بحیثیت مدیر و پبلشر روزنامہ 'مسلمان' کی ذمے داری سنبھالے ہوئے ہیں۔ صوبائی حکومت روزنامہ 'مسلمان' کو تمل ناڈو کے مسلمانوں کا ترجمان سمجھتی ہے اور اسے قدر کی نگاہوں سے دیکھتی ہے۔ 1964 میں شری چھاگلہ نے جو اس وقت مرکزی وزیر تعلیم تھے یو این او (UNO) میں ہندوستانی وفد کے لیڈر کی حیثیت سے تقریر کرتے ہوئے ہندوستانی رائے عامہ کے نمائندے کے طور پر اس اخبار کا ذکر کیا اور اپنی تقریر کی تائید میں روزنامہ 'مسلمان' کے اداریہ کو پیش کیا تھا۔ اس وقت روزنامہ 'مسلمان' کے اداریے بڑے جاندار و شاندار ہوا کرتے تھے۔ روزنامہ 'مسلمان' سے وابستہ سابق مدیروں میں ابوالجلال ندوی، مولانا سید سلطان محی الدین بہمنی، عبدالطیف فاروقی، ایس ایم فاضل اور علی حسین بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کے علاوہ روزنامہ 'مسلمان' سے کئی ایک نامہ نگار مثلاً ابوالحسنات، عبدالوہاب صوفی، احمد الدین، عثمان غنی، حیات افتخار، سید سجاد حسین، احمد ندیم اور قاضی حبیب احمد بھی وابستہ رہے۔ ان میں احمد الدین اور عثمان غنی ہنوز اس اخبار سے جڑے ہوئے ہیں۔

بحیثیت مجموعی تمل ناڈو کے گزشتہ ڈیڑھ سو سالہ علمی، مذہبی، تہذیبی، ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں کا اندازہ لگانے کے لیے یہاں سے شائع ہونے والے اخبار و رسائل ہی ہماری صحیح رہنمائی کرسکتے ہیں۔ یہاں کے اہل قلم نے جہاں شعر و ادب کی آبیاری کی وہاں صحافتی میدان میں بھی ایسے کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں جن کو اردو صحافت کی تاریخ میں کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

مراجع و مصادر:

1. ہسٹری آف انڈین جرنلزم، جے نٹراجن
2. خطبات گارسان دتاسی، مطبوعہ: انجمن ترقی اردو
3. مدراس میں اردو، نصیرالدین ہاشمی
4. مدراس میں اردو ادب کی نشو ونما، افضل الدین اقبال
5. تمل ناڈو میں اردو صحافت، ڈاکٹر سید صفی اللہ
6. اردو اخبارات ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد میں، عتیق صدیقی
7. رسالہ اردو، اپریل 1941
8. فہرست اخبارات ہند، منشی محبوب عالم

Dr. Syed Sajjad Husain, Dept of Arabic, Persian and Urdu, Marina Campus, Chennai - 600005 (TN)

شمس الاسلام فاروقی

خود کو صحت اور کامیابی سے ہمکنار کیجیے

ہمارا یہ جسم تقریباً ایک سوٹریلین سیلس پر مشتمل ہے۔ خوردبینی ہونے کے باوجود ہر سیل ایک بے حد منظّم اکائی کی مانند ہے جو ہمارے جسم کی بنیاد بناتا ہے۔ ایک جیسے سیلس مل کر ٹشوز بناتے ہیں اور ایک جیسے ٹشوز اعضا۔ کئی اعضا باہم مل کر کسی نظام کی تشکیل کرتے ہیں جیسے تنفّسی نظام، ہضمی نظام، دورانی نظام اور عصبی نظام وغیرہ۔ باوجود اس حقیقت کے کہ ہمارے جسم کے یہ سیلس خودمختار اکائیاں ہیں یہ مل کر کام کرتے ہیں لیکن جب کبھی ان کی ہم آہنگی میں فرق آجاتا ہے، ہمارا جسم کسی نہ کسی بیماری کا شکار ہوجاتا ہے۔

ہر سیل کی کارکردگی اور ہم آہنگی اسی کی نیوکلیس میں موجود ایک کرشماتی مالیکیول کے ذریعے کنٹرول ہوتی ہے جسے ڈی این اے کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یہ مالیکیول تقریباً تین بلین اجزا پر مشتمل ہوتا ہے جو اس کے اندر ایک مخصوص ترتیب میں سلسلہ وار جڑے ہوتے ہیں۔ ٹکنیکی زبان میں ہر جز ایک نیوکلیوٹائیڈ کہلاتا ہے۔ ایک ہزار سے ایک لاکھ چھیاسی ہزار نیوکلیوٹائیڈس مل کر ایک گروپ بناتے ہیں جسے جین کہتے ہیں اور ہر جین کسی فرد کی کسی ایک خصوصیت کے لیے ذمے دار ہوتا ہے۔ ڈی این اے مالیکیول میں جینس کی اوسط تعداد تیس ہزار ہوتی ہے۔ اس طرح ہر سیل کے ڈی این اے مالیکیول میں اس فرد کی پیدائش سے موت تک اس کی ساخت اور خصوصیات سے متعلق کل انفارمیشن نیوکلیوٹائیڈس اور جینس کی شکل میں موجود ہوتی ہیں جن کے مطابق ہی وہ اپنی زندگی گزارتا ہے۔ ہر سیل کا ڈی این اے مالیکیول بالکل ایک جیسا ہوتا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارا جسم واحد سیل سے وجود میں آتا ہے اور اس میں موجود ڈی این اے مالیکیول بھی سیل کی ہر تقسیم کے وقت اپنا ایک ہمزاد تیار کرلیتا ہے اور اس طرح جسم کے تمام سیلس میں جو تقسیم در تقسیم کے ذریعے وجود میں آتے ہیں اصل ڈی این اے مالیکیول ہی کی کاپیاں موجود ہوتی ہیں۔ جسم کے تمام سیلس کے درمیان ہم آہنگی کی بھی یہی وجہ ہے۔

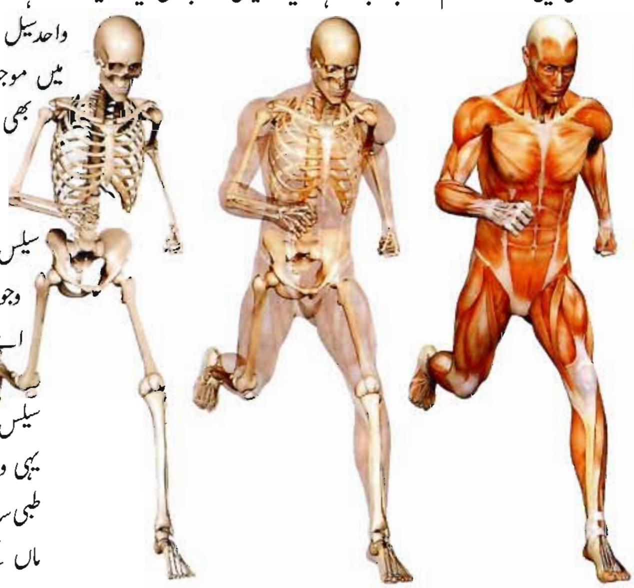

طبی سائنس کے مطابق نوزائیدہ بچہ ماں کے جذبات اور احساسات لیے ہوئے پیدا ہوتا ہے کیونکہ وہ پیدائش سے پہلے ہی ماں کے ذریعے اس کے سیلس میں منتقل ہوچکے ہوتے ہیں۔ ابتداءً اسے اپنی بقا کا ڈر ہوتا ہے۔ آئندہ سالوں میں ماحولیاتی دباؤ کے تحت اس کے اندر دوسری طرح کے خوف بھی پیدا ہوسکتے ہیں جن کا سدِّ باب یا تو اس کی صحیح تربیت یا پھر خود اس کی اپنی ذات پر موقوف ہوتا ہے۔ جو سیلس پیدائش سے پہلے ماں کے جذبات اور احساسات کے طابع تھے، پیدائش کے بعد خود اس کے طابع ہوجاتے ہیں اور اب وہ اپنے بارے میں جس طرح سوچتا ہے اس کے سیلس اسی کے مطابق عمل پیرا ہوتے ہیں۔

آپ کی ہر سوچ آپ کے عصبی نظام پر اثر انداز ہوتی ہے اور پھر آپ کا عصبی نظام دوسرے اعضا کو متاثر کرتا ہے۔ اس لیے آپ سے جب بھی کوئی پوچھے کہ آپ کیسے ہیں تو ہمیشہ جواب دیجیے کہ خدا کا شکر ہے میں بالکل تندرست ہوں۔ یقین مانیے آپ کے یہ الفاظ آپ کے سیلس پر ایک مثبت اثر چھوڑیں گے اور وہ خود کو عین آپ کی توقعات کے مطابق تندرست بنانے کا کام کریں گے لیکن اس کے برخلاف اگر آپ اپنی خرابی صحت کا رونا روئیں اور کہیں کہ میری صحت اتنی خراب ہے کہ اب شفایابی کی کوئی امید نہیں تو آپ کے سیلس آپ کی توقعات کے مطابق آپ کی بیماری کو مزید بڑھاوا دیں گے اور آپ کی صحت پہلے سے بھی زیادہ خراب ہوجائے گی۔

آپ کے جسم کے سیلس آپ کی سوچ کے مطابق ہی کام کرتے ہیں۔ سمجھ لیجیے کہ آپ ایک آبدوز کے کمانڈر ہیں اور باہری حالات کا جائزہ لے کر آبدوز کے اندر بیٹھے ہوئے دیگر لوگوں کو اطلاعات فراہم کررہے ہیں۔ آپ

انھیں بتاتے ہیں کہ آبدوز کے چاروں طرف دشمن موجود ہیں، سامنے برف کی ایک چٹان ہے، پیچھے گہرا اور نیچے گہرا سمندر ہے۔ بتایئے ان اطلاعات کے بعد اندر بیٹھے ہوئے لوگوں پر کیا اثر پڑے گا۔ وہ یقیناً مایوسی سے دوچار ہوں گے اور یہی سوچیں گے کہ ان حالات میں تو ان کے لیے کوئی کوشش کرنا بھی بیکار ہے۔ اب شاید مرنا ہی ان کی قسمت ہے۔ اسی طرح اگر آپ اپنے بارے میں مایوس کن باتیں کہیں گے اور اپنے جسم کے سیلس کا حوصلہ نہ بڑھائیں گے تو ان کا حال بھی کچھ ایسا ہی ہوگا۔

بعض لوگ بے حد مایوسی اور ناامیدی کی باتیں کرتے ہیں۔ انھیں دنیا میں کوئی بھی خوشگوار بات نظر نہیں آتی۔ ہر قدم پر دشواریاں اور مشکلات ہی دکھائی دیتی ہیں۔ کوئی دوست اور غم خوار نظر نہیں آتا۔ ہر آدمی دھوکے باز اور دشمن دکھائی دیتا ہے۔ ان کے یہ خیالات اور احساسات فی الواقعہ ان کے سیلس پر اثرانداز ہوتے ہیں اور ان اشخاص کے سیلس میں ان کی زندگی کو بہتر بنانے کی جو بھی صلاحیت موجود ہوتی ہے وہ اس کا بھی استعمال نہیں کرپاتے اور ان لوگوں کی توقعات کے مطابق خرابیٔ صحت کو مزید بڑھاوا دیتے ہیں نتیجتاً وہ لوگ سوئے ہضم کا شکار ہوتے ہیں، ان کے دورانی نظام میں رکاوٹیں پیدا ہوجاتی ہیں، تنفسی نظام بگڑ جاتا ہے اور عصبی نظام انھیں ڈپریشن میں مبتلا کردیتا ہے۔ غرض ایسے لوگ بہت جلد اس مقام پر پہنچ جاتے ہیں جہاں سے واپسی ممکن نہیں ہوتی۔

اس کے برخلاف پرامید خیالات رکھنے والے لوگ زندگی کے ہر محاذ پر کامیابی سے ہمکنار ہوتے ہیں کیونکہ ان کے مثبت خیالات ان کے سیلس میں زندگی بھر دیتے ہیں اور وہ انھیں کے مطابق خود کو بہتر سے بہتر بنانے میں لگ جاتے ہیں۔ اس لیے یاد رکھیے کہ آپ کبھی بھی مایوسی اور ناامیدی کی باتیں نہیں کریں گے بلکہ آپ کی ہر بات سے حوصلہ اور ہمت کا اظہار ہوگا۔ کبھی مت کہیے کہ آپ فلاں کام نہیں کرسکتے یا آپ کی صحت اتنی خراب ہے کہ شفایابی محال ہے۔ اس کے برخلاف پورے حوصلے اور ہمت سے کہیے کہ میں ہر کام بخیر و خوبی انجام دے سکتا ہوں، میرے لیے کچھ بھی مشکل نہیں۔ اپنی صحت کی طرف سے ہمیشہ پرامید رہیے اور یہی کہیے کہ الحمدللہ میں بہت بہتر ہوں اور ان شاء اللہ جلد ہی مکمل طور پر شفایاب ہوجاؤں گا۔

یہ محض نفسیاتی درس نہیں جس کی آپ کو تلقین کی جارہی ہے بلکہ یہ وہ حقائق ہیں جس کی توثیق جدید سائنس کرتی ہے۔ بلاشبہ مجادلے ڈی این اے مالیکیول میں ہماری ہر خصوصیت کے لیے ایک جین موجود ہے اور وہ جب بھی متحرک ہوتا ہے تب کوئی نہ کوئی خصوصیت عود

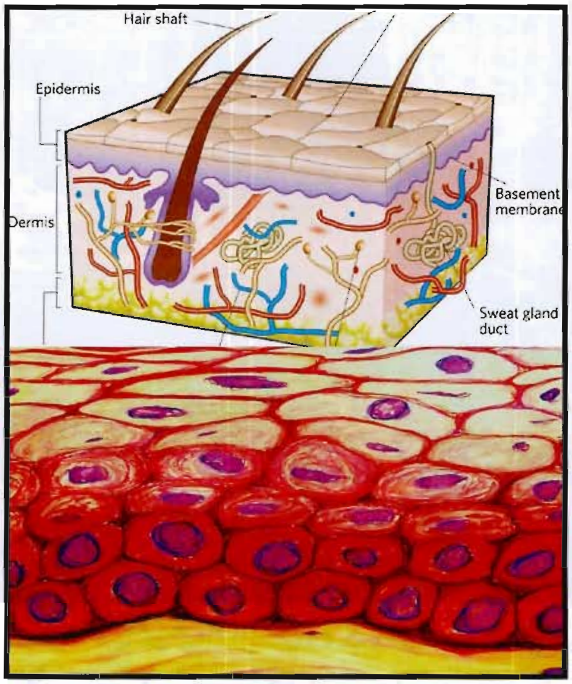

بعض لوگ بے حد مایوسی اور ناامیدی کی باتیں کرتے ہیں۔ انھیں دنیا میں کوئی بھی خوشگوار بات نظر نہیں آتی۔ ہر قدم پر دشواریاں اور مشکلات ہی دکھائی دیتی ہیں۔ کوئی دوست اور غم خوار نظر نہیں آتا۔ ہر آدمی دھوکے باز اور دشمن دکھائی دیتا ہے۔ ان کے یہ خیالات اور احساسات فی الواقعہ ان کے سیلس پر اثرانداز ہوتے ہیں اور ان اشخاص کے سیلس میں ان کی زندگی کو بہتر بنانے کی جو بھی صلاحیت موجود ہوتی ہے وہ اس کا بھی استعمال نہیں کرپاتے

کرآتی ہے۔ خواہ وہ ہماری کوئی اچھی عادت ہو یا بری یا پھر صحت یا بیماری وغیرہ۔ جیسا کہ پہلے کہا گیا ہمارے ڈی این اے میں کوئی تیس ہزار جینس موجود ہیں۔ ان میں سے بہت سے جینس زندگی بھر خاموش پڑے رہتے ہیں اور متحرک ہی نہیں ہوتے جس کے نتیجے میں ان کی متعلقہ خصوصیات کبھی بھی ظاہر نہیں ہوتیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان جینس کو متحرک کرنے والا بھی کوئی وسیلہ موجود ہونا چاہیے اور حقیقت بھی یہی ہے۔ جدید تحقیقات کے مطابق ہر ڈی این اے مالیکیول کے باہر اوپر کی طرف ایک اور کیمیائی مادّہ ہوتا ہے جسے تکنیکی زبان میں اپی جینیٹک مارک کہتے ہیں۔ اس کا کام ڈی این اے مالیکیول میں موجود کسی بھی جین کو آن یا آف کرتا ہے یعنی جب اپی جنیٹک مارک ایک جین کو حکم دیتا ہے تب وہ متحرک ہوکر متعلقہ خصوصیت کو ظاہر کرتا ہے لیکن اس کے خلاف جب وہ کسی متحرک ہونے والے جین کو غیر متحرک ہونے کا حکم دیتا ہے تو وہ جین خاموش اور غیر متحرک ہوجاتا ہے اور اس کی متعلقہ خصوصیت ظاہر نہیں ہوجاتی۔

سائنسدانوں کے مطابق اپی جنیٹک مارکس کسی بھی شخص کے ماحول، خیالات اور عادات وغیرہ سے متاثر ہوتے ہیں اور پھر اسی کے مطابق ڈی این اے مالیکیول کے جینس کو آن یا آف ہونے کا حکم صادر کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر اگر ایک شخص صاف ستھرے اور پاکیزہ ماحول میں رہتا ہے، اس کے خیالات اور عادات اچھی ہیں تو وہ صرف اچھے جینس ہی کو آن کرے گا لیکن اگر اس کا ماحول گندہ اور کثیف ہے، خیالات اور عادتیں بد ہیں تو اس کے نتیجے میں اپی جنیٹک مارک ڈی این اے کے بڑے جینس کو متحرک کرے گا۔ دیکھا گیا ہے کہ ضرورت سے زیادہ کھانے والوں میں بسیارخوری کا جین متحرک ہوجاتا ہے اور پھر وہ ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل ہوکر بسیارخوری کی عادت کو بڑھاوا دیتا ہے۔ ایسے لوگوں کی اولاد میں بسیارخوری کی عادت پیدائشی طور پر ہی نمایاں ہوجاتی ہے۔

ان سب کی روشنی میں ہمیشہ یہی کوشش کریں کہ اپنے ماحول کو صاف ستھرا اور خیالات کو پاکیزہ رکھیں۔ ہمیشہ گندی عادتوں سے خود کو بچائیں اور اپنی سوچ ہمیشہ مثبت رکھیں جس میں مایوسی اور ناامیدی نہ ہو بلکہ ہر بات میں امید اور حوصلے کا عنصر شامل ہوتا کہ اس کے مطابق ہمارے ڈی این اے کے صرف اچھے جینس ہی متحرک ہوں اور ہماری آنے والی نسلیں بھی مایوسی، ناامیدی اور ڈپریشن کا شکار نہ ہوکر کامیابیوں سے ہمکنار ہوں۔

■

Dr. Shamsul Islam Farooqi 90-B/1, Ahata Tablib, Gali No.1, Noor Nagar, Jamia Nagar, Okhla, New Delhi - 110025

قومی اردو کونسل کی کتابیں

کلیاتِ جوش (جلد اوّل)

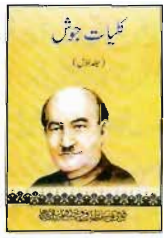

مرتبین: قمر رئیس، جاوید نسیمی

صفحات: 1138، قیمت: 347 روپے، سنہ اشاعت: 2013

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: کوثر مظہری، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

زیرِ تبصرہ کتاب 'کلیاتِ جوش' شاعرِ انقلاب وشباب جوش ملیح آبادی کے تین شعری مجموعے روحِ ادب، نقش ونگار اور شعلہ وشبنم پر مشتمل ہے۔ اس کلیات کا پیش لفظ ڈیڑھ صفحے کا ہے اور دیباچہ پونے تین صفحات پر مشتمل ہے۔ پیش لفظ قومی کونسل کے ڈائرکٹر نے تحریر کیا ہے جسے کہ ایک منصبی ذمے داری کے طور پر تسلیم کیا جانا چاہیے۔ لیکن دیباچے میں اس کلیات کے غرض وغایت اور طریقۂ کار پر مزید تفصیلی اور جزئیات کے ساتھ روشنی ڈالی جاسکتی تھی۔ اصل کام چوں کہ فرہنگ تیار کرنا تھا، اس لیے مرتب جاوید نسیمی صاحب نے دیباچے میں زیادہ شرح وبسط کے ساتھ کچھ لکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

مرتبین نے اس کلیات میں جوش کے شعری متون کی صحیح قرأت پر پوری توجہ مرکوز رکھی ہے اور اس لیے بہت سی جگہوں پر اعراب بھی لگائے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''ساتھ ہی جہاں جہاں ضروری سمجھا گیا وہاں الفاظ پر اعراب کا خصوصی اہتمام کیا گیا ہے تاکہ طلبہ لفظ کی صحیح قرأت کرسکیں۔'' (ص: vi)

اس کلیات کی فرہنگ سازی میں ایک ہی لفظ یا تلمیح کے بار بار استعمال ہونے میں جو تناظر خلق ہوا ہے، مرتبین نے اس کے معنی ومفہوم اسی تناظر میں درج کیے ہیں تاکہ مفہوم کی ترسیل میں التباس پیدا نہ ہو۔ پھر بھی کہیں کہیں احتیاط کی کمی کے سبب قارئین کے لیے دقتیں ہوسکتی ہیں، بالخصوص وہ قارئین جن کا پیشہ درس وتدریس نہیں ہے یا پھر یہ کہ جن کے لیے اعراب کے ساتھ متن پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ص: 8 پر فارسی کا شعر درج ہے جس کا مصرعِ اولیٰ ہے: بیاور ید گر ایں جا بود سخن دانی یہاں 'بیاورید' کو 'بیا و رید' لکھا گیا ہے۔ اگر یہاں کوئی قاری لفظ 'رید' پڑھ لے تو کیسی مضحکہ خیز صورت پیدا ہوجائے گی۔ یہاں احتیاط کی ضرورت تھی۔ اسی طرح فرہنگ والے باب میں ص: 1107 پر نظم 'حقیقت دل' کے آغاز میں فارسی کے اشعار ہیں۔ پہلے شعر کا پہلا مصرع ہے: عاشقی چیست بہو بندہ جاناں بودن۔ یہاں لفظ 'بہو' کے بجائے صحیح لفظ 'بہم' ہے۔ لیکن 'بہو' پڑھ کر معنی یابی کی کوئی صورت نہیں ہوگی۔ آگے ص: 1111 پر فارسی شعر کا پہلا مصرع ہے: شہریست پُر ظریفاں و زہر طرف نگارے۔ یہاں بھی 'زہر' ایک ساتھ ہے جب کہ 'ز' از کا مخفف ہے اور یہ 'ہر' کے بجائے 'ز' کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے گا یعنی:

'شہریست پُرظریفاں وز ہرطرف نگارے'

ص: 1128 پر فارسی کے دو شعر ہیں۔ دوسرے شعر کے پہلے مصرع: درد ہر چو من یکے دآنہم کافر میں لفظ 'دہر' کی دال 'در' سے مل گئی ہے جس سے لفظ 'درد' بن گیا ہے اور ایسے میں لفظ 'ہر' بے معنی اور معلق ہوکر رہ گیا ہے۔

کچھ الفاظ ایسے ہیں جن پر اعراب لازمی طور پر لگائے جانے چاہیے تھے جیسے: زمہریر (ص: 1122)، روضۂ رضوان (ص: 1123)، فرِ کنگرۂ قصرِ برتری (ص: 1123)، اطلس (ص: 1117)۔ یعنی زمہریر میں 'ز' پر زبر ہے، زیر ہے یا پیش۔ اسی طرح 'روضۂ رضواں' میں لفظ 'روضہ' میں 'ر' پر زبر ہے یا پیش، لفظ 'کنگرہ' میں حرف 'ک' پر زبر ہے یا پیش۔ لفظ 'اطلس' میں 'ا' پر زبر ہے کہ پیش۔ یہ محض چند مثالیں ہیں۔

اگر اس کلیات میں صرف دو مجموعے کی فرہنگ دی جاتی تو بہتر ہوتا۔ چونکہ جوش ایک مشکل شاعر ہے۔ ان کا ڈکشن ہمیں بار بار ڈکشنری کھولنے کی طرف لے جاتا ہے۔ اگر اس میں فرہنگ شامل کرنا تھا تو مزید توجہ کی ضرورت تھی، کیونکہ جتنے الفاظ کے معانی ومفاہیم دیے گئے ہیں اس سے تین گنے ایسے الفاظ رہ گئے جو محتاج معانی ہیں۔ پھر بھی یہ کلیات کارآمد ہے۔ آئندہ اگر دوسری جلد شائع ہو تو قارئین کی توقع ہوگی کہ فرہنگ پر مزید توجہ کی جائے گی۔ کتاب کی قیمت 347 روپے ہے جو ضخامت کے لحاظ سے بہت مناسب ہے۔

شاہنامہ کی کہانیاں

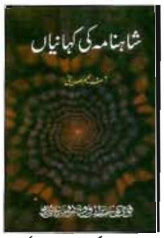

مصنف: آصف نعیم صدیقی

صفحات: 95، قیمت: -/20 روپے، سنہ اشاعت: 2013

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: ارشد گوڑ، A-121، پاکٹ ڈی 2، میوو ہار، فیز III، دہلی 96

آج کے دور کی تو بات ہی کیا بچوں کے لیے کتابوں کی کمی اس وقت بھی محسوس کی جاتی تھی جب کارٹون نیٹ ورک اور پوگو جیسے ٹیلی ویژن چینل ہندوستان کے عوام کو دستیاب نہیں تھے۔ ایسے میں بچوں کے لیے علمی اور ادبی کتابیں شائع کرنے کا قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا فیصلہ ہر طرح سے قابلِ تعریف ہے۔

'شاہنامہ کی کہانیاں' کتاب میں آصف نعیم صدیقی صاحب نے فردوسی کے کارنامے شاہنامہ کی کہانیوں کو اختصار کے ساتھ ایسے انداز میں پیش کیا ہے جسے بچے تو سمجھ ہی سکتے ہیں اسے بڑے بھی پڑھ سکتے ہیں جو شاہنامے کی کہانیوں میں دلچسپی رکھتے ہیں۔

کتاب کے مقدمہ میں منصور بن حسن 'فردوسی' کی زندگی کے مختصر حالات کے ساتھ شاہنامہ کی ابتدا کے بارے میں بھی بتایا گیا ہے:

''شاہنامہ کی ابتدا کب اور کیسے ہوئی یہ ایک دلچسپ کہانی ہے۔ بعض محققین کا کہنا ہے کہ شاہنامہ کی سب سے پہلی کہانی 'داستان بیژن ومنیژہ' ہے اور شاہنامہ کی ابتدا کا سبب وہ کہانی ہے جو فردوسی نے داستان کے شروع میں مقدمہ کی صورت میں پیش کی ہے۔ ایک رات اس کو نیند نہیں آرہی تھی جب اس کی الجھن حد سے بڑھ گئی تو اس نے ایک 'مہربان' کو آواز دی کہ شراب اور شمع لے کر آ وہ شمع اور شراب لے کر آگئی پھر اس نے فردوسی کو داستان بیژن ومنیژہ سنائی اور کہا کہ تم اب اس کو نظم کرڈالو۔ فردوسی اس داستان سے اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے فوراً اسے نظم کرنا شروع کردیا۔ جب یہ مکمل ہوئی تو لوگوں نے اس کی اتنی تعریف کی کہ اس نے اور داستانیں بھی نظم کرڈالیں۔'' (صفحہ: 8-7)

اس کے اختتام کے سلسلے میں مختلف آرا کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے۔ شاہنامے کی تاریخی اور

ادبی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے آصف نعیم صدیقی صاحب نے ایمانداری سے بتایا ہے کہ اس تعارفی مضمون میں انھوں نے کسی ذاتی تحقیق کو پیش نہیں کیا بلکہ ذبیح اللہ صفا کی تاریخ ادبیات ایران، علامہ شبلی نعمانی کی شعرالعجم اور حافظ محمود شیرانی کی کتاب مقالات شیرانی میں فردوسی اور شاہنامے سے متعلق جو مباحث پیش کیے گئے ہیں ان کو اپنے طور پر لکھ ڈالا ہے۔ بہرحال اس مقدمہ میں فردوسی اور شاہنامہ سے متعلق تمام ضروری معلومات ملتی ہے۔

داستان پڑھنے اور سننے میں اب بھی بچے اور بڑے تقریباً یکساں دلچسپی رکھتے ہیں۔ کتاب کے عنوانات قاری کے دل میں تجسس کے ساتھ ساتھ ایک خاص طرح کے لطف کا احساس بھی پیدا کرتے ہیں جس سے کہانیاں اور داستانیں پڑھنے والے بخوبی واقف ہیں۔ داستانِ ضحاک، داستان رستم وسہراب، داستان ہفت خوان رستم، ہفت خوان اسفندیار، گشتاسپ کی بادشاہی اور اسفندیار کی موت عنوانات پر مشتمل یہ کتاب بچوں کے ساتھ ساتھ میری رائے میں ان بڑوں کو بھی ایک بار تو پڑھ ہی لینی چاہیے جنھوں نے نہ تو شاہنامہ پڑھا ہے اور نہ اس کی کہانیاں۔

بھارت کا آئین

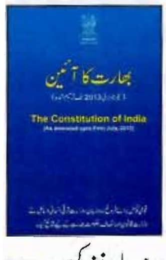

مصنف: وزارات قانون وانصاف

صفحات: 505، قیمت: 176 روپے، سنہ اشاعت: 2013

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان،

وزارت ترقی انسانی وسائل حکومت ہند

مبصر: عابد انور، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی

ہندوستان میں سب سے زیادہ مشکلات کے شکار لوگ قانون نہ جاننے کی وجہ سے ہوتے ہیں۔ انگریزی اور ہندی حلقے کے لیے تو کسی قدر کتابیں مل جاتی ہیں تاہم وہ بھی مشکل زبان و پیچیدہ جملے کا بار کیے ہوتی ہیں۔ ایسی صورتِ حال میں اردو والوں کے لیے 'بھارت کا آئین' نامی کتاب قومی اردو کونسل برائے فروغ اردو زبان (مرکزی وزات فروغ انسانی وسائل حکومت ہند) نے قانون کے موضوع پر شائع کی ہے۔ اس سے پہلے بھی یہ کتاب شائع ہو چکی ہے۔ یہ پانچویں اشاعت ہے اس کی خوبی یہ ہے کہ یکم جولائی 2013 تک کے ترمیم شدہ قوانین درج ہیں۔

زیرِ تبصرہ کتاب 'بھارت کا آئین' کی افادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر خواجہ محمد اکرام الدین نے پیش لفظ کے تحت لکھا ہے کہ ''آئین کی اہمیت بنیادی ہے کیوں کہ یہ تمام ملکی قوانین کا منبع ومخرج ہے۔ یہ بات ذہن نشیں کرنے کی ہے کہ آئین کی رو سے مذہب وملت، ذات پات، علاقہ اور رنگ ونسل سے قطع نظر ہندوستان میں تمام لوگوں کو برابر حقوق حاصل ہیں اور سب کو پھلنے پھولنے کا حق ہے۔ جمہوریت کے قیام کے لیے جمہور میں خود اعتمادی اور قانون پسندی بنیادی اجزا ہیں۔ ہر ہندوستانی کو آئین سے واقفیت ہونی چاہیے تاکہ وہ اپنے حقوق بھی جانے اور فرائض سے بھی آگاہ ہو۔ 'بھارت کا آئین' کی اشاعت کا مقصد اردو خواں طبقوں میں خود اعتمادی کو بڑھانا بھی ہے۔ اس سے امن، قومی یکجہتی، اور خوش حالی کے سلسلے استوار ہوتے ہیں''۔ خواجہ صاحب کے اس پیش لفظ سے کتاب کی اہمیت وافادیت ظاہر ہو جاتی ہے۔

زیرِ تبصرہ کتاب کے 22 حصے ہیں۔ جن میں بعض کے ذیلی ابواب ہیں۔ اس کتاب کا آغاز دفعات (آرٹیکل) سے ہوا ہے۔ اس کا پہلا حصہ یونین اور اس کا علاقہ ہے جس میں یونین کا نام اور علاقہ، جدید ریاستوں کا داخلہ یا قیام وغیرہ کا ذکر ہے۔ دوسرا حصہ شہریت ہے۔ جس میں شہریت، آئین کا تاریخی نفاذ، حقوق شہریت بعض ایسے اشخاص کے جو پاکستان سے ترک وطن کر کے بھارت آ گئے ہوں، حقوق شہریت بعض بھارتی نژاد اشخاص کے جو بیرون بھارت کے باشندے ہوں۔ حقوق شہریت کا برقرار رہنا وغیرہ، تیسرا حصہ بنیادی حقوق ہے جس میں تعریف، بنیادی حقوق کے متناقض یا ان کو کم کرنے والے قوانین اور ذیلی عناوین میں حق مساوات کے تحت قانون کی نظر میں مساوات، مذہب، نسل، ذات، یا جنس یا مقام پیدائش کی بنا پر امتیاز کی ممانعت، سرکاری ملازمت کے لیے مساوی مواقع، چھوت کا خاتمہ، خطابات وتمغات اور حق آزادی کے تحت آزادی تقریر وغیرہ سے متعلق بعض حقوق کا تحفظ، اقبال جرم میں تحفظ، جان اور شخصی آزادی، تعلیم کا حق، بعض صورتوں میں گرفتاری اور نظر بندی سے تحفظ، اسی طرح اس کے ذیلی عنوان استحصال کے خلاف حق، آزادی مذہب کا حق ثقافتی اور تعلیمی حقوق کے عنوان کے تحت اقلیتوں کے مفادات، اقلیتوں کو تعلیمی ادارے قائم کرنے اور ان کا انتظام کرنے کا حق حاصل ہے۔ حصہ چار میں مملکت کی حکمت عملی کے ہدایتی اصول، چوتھا حصہ الف بنیادی فرائض، پانچواں حصہ یونین جس میں پانچ ابواب ہیں۔ پہلا باب صدر اور نائب صدر جس میں صدر کا انتخاب، یونین کا عاملانہ اختیار اور صدر اور نائب صدر سے متعلق تمام اختیارات، فرائض، حقوق، طریقہ کار، وزیروں کی کونسل، بھارت کا اٹارنی جنرل اور حکومت کے کام کا طریقہ شامل ہیں۔ جب کہ باب دوم میں پارلیمنٹ سے متعلق توضیحات ہیں۔ تیسرا باب قانون سازی کے اختیارات، چوتھا باب یونین کی عدلیہ، پانچویں باب میں کمپٹرولر اور آڈیٹر جنرل ہے۔ چھٹا حصہ ریاستیں ہے جس میں گورنر، وزیروں کی کونسل، ریاست کا ایڈووکیٹ جنرل، ریاستی مجلس قانون ساز، کام کا طریقہ، ارکان کی نا اہلیتی، قانون سازی کا طریقہ کار، مالیاتی امور میں طریق کار، عام طریقہ، ماتحت عدالتیں جیسے ابواب ہیں۔ آٹھواں حصہ یونین کے علاقے، نواں حصہ پنچایت، نواں حصہ الف میں میونسپلٹیاں، دسواں حصہ درج فہرست اور قبائلی رقبے، گیارہواں حصہ یونین اور ریاستوں کے مابین تعلقات، بارہواں حصہ مالیات، جائداد اور معاہدات اور مقدمات، تیرہواں حصہ بھارت کے اندر تجارت اور لین دین، چودہواں حصہ یونین اور ریاستوں کے تحت ملازمتیں، پندرہواں حصہ انتخابات، سولہواں حصہ بعض طبقوں سے متعلق خصوصی توضیعات، سترہواں حصہ سرکاری زبان، اٹھارہواں حصہ ہنگامی حالت سے متعلق توضیعات، انیسواں حصہ متفرق، بیسواں حصہ آئین کی ترمیم، بائیسواں حصہ مختصر نام، تاریخ نفاذ، مستند ہندی متن اور تنسیخات وغیرہ ہیں۔

کتاب میں بنیادی حقوق سے متعلق دفعہ 25 سے لے کر 30 تک دفعات کی تشریح کی گئی ہے۔ اقلیتوں کے تعلق سے ان دفعات کا بیشتر موقعوں پر تذکرہ کیا جاتا ہے جس کی مدد سے تمام شہریوں بشمول اقلیتوں کو تمام اختیارات دیے گئے ہیں۔ دفعہ 25 کے مطابق امن عامہ، اخلاق عامہ، صحت عامہ نیز دیگر توضیعات کی روشنی میں تمام اشخاص کو آزادی ضمیر، مذہب قبول کرنے، اس کی پیروی، تبلیغ کرنے کا مساوی حق ہے۔ دفعہ 30 کے مطابق تمام اقلیتوں کو، خواہ وہ مذہب کی بنا پر ہوں یا زبان کی، اپنی پسند کے تعلیمی ادارے قائم کرنے اور ان کا انتظام کرنے کا حق ہوگا۔ اس کی تشریح بھی کی گئی ہے۔

مجموعی طور پر یہ کتاب قابل مطالعہ ہے اور ہر اردو داں طبقے کے گھر میں یہ کتاب ہونی چاہیے۔ کتابت، طباعت بہت عمدہ ہے اور کاغذ کا بھی اچھا استعمال کیا گیا ہے۔ قیمت بھی مناسب ہے بلکہ سستی ہے۔ اگر کتاب مزید سلیس اور ذیلی تشریح کے ساتھ ترتیب دی جاتی تو اردو قارئین کے لیے تفہیم مزید آسان ہو جاتی ہے۔ کتاب کی اشاعت کے لیے یقیناً قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان مبارکباد کی مستحق ہے۔

دیگر کتابیں

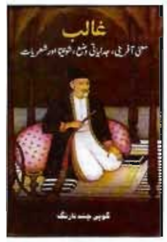

غالب-معنی آفرینی، جدلیاتی وضع، شونیتا اور شعریات

مصنف: گوپی چند نارنگ
صفحات: 678، قیمت: 450 روپے، سنہ اشاعت:
ناشر: ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی
مبصر: فرحت احساس

غالب فہمی کی پہلی شمع یعنی 'یادگارِ غالب' کی روشنی پر ایک صدی سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے۔ اس دوران اس چراغ سے کتنے ہی چراغ روشن ہوئے، غالب کی زبان، کیا اردو کیا فارسی، محاورے اور لغات، تشبیہ، پیکر، استعارے، مضمون سازی و معنی آفرینی، سماجی سروکار، تاریخی معنویت اور دانش ورانہ افتاد وغیرہ پر کیا کیا کچھ نہیں لکھا گیا، ان کی پرشکوہ شعری عمارت کے سامان تعمیر کی ایک ایک چیز پر کیا کیا بحثیں قائم نہیں کی گئیں مگر اس سب کے باوجود ایسا کیوں لگتا ہے کہ حالی نے مرزا غالب کی تخلیقیت کے دوسرے سرے پر کوندتی ہوئی بجلیوں اور امنڈتے ہوئے طوفانوں کی طرف جو اشارے کیے تھے ان کو سمجھنے یعنی ان کے تخلیقی سرچشموں اور متن سازی کی جائے پیدائش تک رسائی پانے کی کوئی سعیِ مشکور نہیں کی گئی۔

مقام شکر ہے کہ ہماری تنقید کی کارگاہِ تعقل میں چند دیوانے بھی پائے جاتے ہیں جو شہرِ خرد کے باہر پھیلے ہوئے لاشعور کے جنگلوں میں دبکے ہوئے نیم روشن منطقوں اور لفظوں کے خارزاروں میں الجھے ہوئے معنی کے زخموں اور تجزیہ کار عقل کے پردۂ سنگ کے پرے لرزتے ہوئے وجدان کی پرچھائیوں میں تاک جھانک کرتے یعنی حقیقت کے نہاں خانوں کے گریبان پر ہاتھ ڈالتے رہتے ہیں۔ ہمارے گوپی چند نارنگ صاحب یقیناً اور بلاشبہ ان عقل مستوں اور جنوں دماغوں کے میرِ کارواں ہیں۔ سو انھوں نے برسوں اپنی دشتِ فہم وفکر نوردی کے انعام میں ایک ایسا اسمِ جنوں حاصل کرلیا ہے جو کلامِ غالب کے تخلیقی طلسم زار اور قفلِ ابجد کی ایک ایسی کلید کا حکم رکھتا ہے جو اب تک کسی کے ہاتھ نہیں لگی تھی۔ اردو تنقید نے نہ جانے کس لمحۂ قبولیت میں دعا مانگی ہوگی کہ اس پر بابِ اجابت بے دریغ کھل گئے اور اس کا گوش خامہ نوائے سروش سے سیراب ہوگیا۔ حرفِ تنقید ایسا معنی یاب، تجزیے کی تلوار ایسی آب دار، اخذِ معنی کی رفتار ایسی برق پاش اور بیان کی روانی ایسی سبک سیر کہ نہ دیکھی نہ سنی۔ یہی نہیں بلکہ استدلال اور دلائل اور فراہمیِ جواز تمام تر محکمی کے باوجود اپنے ضروری ہونے کی انکاری ہے کہ اندیشہ یقین کی ایسی ایسی عرش نشینیوں کو مس کررہا ہے جہاں ہر طرف جذب وکیف اور لطف ونشاط کا عالم طاری ہے کہ گمان اور شک وشبہ کو تابِ گویائی نہیں۔ لہٰذا غالب تنقید کی زمین پر کوئی صحیفۂ آسمانی (اگر آسمان کا کوئی وجود ہو) اتر سکتا ہے تو نارنگ صاحب کے تازہ ترین تنقیدی کارنامے 'غالب: معنی آفرینی، جدلیاتی وضع، شونیتا اور شعریات' کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے۔ یہ کتاب بلاشبہ تنقید کے تخلیقی حرف اجتہاد کے منصب پر فائز کی جاسکتی ہے۔

نارنگ صاحب کے ذہن پر اس کتاب کے اوراق نے اترنے سے پہلے غالب کے شعری متن کے خانۂ طلسم میں داخلے کے بعد اس کے عقبی دروازوں سے نکل کر اس متن سے لگے ہوئے لاشعور اور ورائے تعقل کی دشت پیمائی کے دوران غالب کی تخلیقی مٹی کے سِروں کو پکڑے پکڑے اس مٹی کی کوکھ یعنی دانشِ ہند کی فکری زرخیزیوں تک رسائی حاصل کی ہے۔ یہ ساری سرگرمی کوئی اچانک یا اتفاقاً واقع نہیں ہوئی۔ اس میں ہندوستان کی تاریخ کے پچھلے پانچ ہزار برسوں کے دوران اٹھنے والی بصیرتوں کے شعلوں کا فیضان کارفرما ہے جنھوں نے حقیقت اور مجاز کے درمیان حائل تمام پردوں کو جلا ڈالا ہے اور وہم وگمان کے پتھروں کو توڑ کر آگہی کا وہ آبِ رواں جاری کیا ہے جو آج بھی انسانی عقل کو وجدان کے چراغوں سے روشن کیے ہوئے ہے۔ نارنگ صاحب نے کتاب کے دیباچے میں کلام غالب کی اسرار کشائی کی نسبت سے اپنے منصوبے کی صراحت کرتے ہوئے حالی کے حوالے سے کہا ہے کہ انھوں نے "کہیں مضمون آفرینی کی داد دی ہے، کہیں خیال بندی کی، کہیں تمثیل نگاری کی، کہیں نزاکتِ خیالی وطرفگیِ بیان کی، کہیں استعارہ سازی وتشبیہ کاری کی، کہیں نکتہ رسی، تیز نگاہی، بذلہ سنجی وشوخی وظرافت کی، تو کہیں ندرت وجدت واسلوب وادا کی۔ بے شک یہ شعری لوازم، نیز ان جیسے دیگر کئی لوازم غالب کی معنی آفرینی وحسن کاری کی شعری گرامر کے ارکان اساسی قرار دیے جاسکتے ہیں"... مگر "ہماری کوشش یہ رہی ہے کہ ان رسومیاتِ شعری کے پس پشت کیا کوئی اضطراری و لاشعوری حرکی تخلیقی عنصر یا افتادِ ذہنی ایسی بھی ہے، یا دوسرے لفظوں میں کوئی ناگزیر شعری یا بدیعی منطق ایسی بھی ہے جو غالب کی نادرہ کاری یا طرفگیِ خیال کی تخلیقیت میں تہہ نشیں طور پر اکثر وبیشتر کارگر رہتی ہے اور غالب کے جملہ تخلیقی شعری عمل کی شیرازہ بندی کرتی ہے۔" (ص 15) یہاں نارنگ صاحب کا اصل سوال حالی اور بعد کے تمام غالب نقادوں سے یہ ہے کہ "غالب کے یہاں خیال نیا اور اچھوتا کیسے بنتا ہے، یا غالب کے یہاں پہلے سے چلے آرہے مضمون سے نیا اور اچھوتا مضمون (مضمون آفرینی) یا معمولہ خیال سے یکسر نیا خیال (خیال بندی) یا اس کا کوئی اچھوتا، ان دیکھا، انوکھا، نرالا، طلسماتی پہلو کیسے پیدا ہوتا ہے جو معنی کے عرصے کو برقیا دیتا ہے یا نئے معنی کی وہ چکاچوند پیدا کرتا ہے جسے عرف عام میں سابقہ تنقید 'طرفگیِ خیال' یا 'ندرت وجدتِ مضامین' سے منسوب کرتی ہے۔" (ص 16)

سامنے کی بات ہے کہ غالب کے کلام کا غالب حصہ مسلمات پر ضرب لگانے اور ہر معمولہ اور موصولہ اور دی ہوئی بات یا خیال میں شگاف ڈالنے اور نفی پر اثبات اور اثبات پر نفی کے نقش قائم کرنے سے عبارت ہے۔ جیسا کہ خود حالی نے زور دیا ہے کہ غالب کو روش عام اور پیش پا افتادہ راستوں پر چلنے سے خلقی وفطری عار ہے۔ اُگلے ہوئے نوالوں سے خواہ وہ ارضی ہوں یا سماوی لطف اندوز ہونا غالب کی سرشت میں ہے ہی نہیں، غالب کا کلام اور ان کی شخصیت بھی گزشتہ دو صدیوں سے مسلسل آواز دے رہی ہے کہ مجھ میں موجزن اس جدلیات پر نظر ڈالو اور اس کی کُنہ تک پہنچنے کی کوشش کرو مگر اس جدلیات کو محض قولِ محال کے شعری وسیلے کا ثمرہ کہہ کر اکتفا کیا جاتا رہا۔ نارنگ صاحب نے غالب کی افتادِ نہاد میں جاگزیں اس نفی درنفی کی حرکیات یا جدلیاتی جوہر سے متعلق سوالوں کا پیچھا کرتے کرتے سبکِ ہندی کی روایت میں سرگرم فکری وبدیعی عناصر کی تہہ لی اور اس سے غالب کے تہ نشیں رشتوں کی گرہ کشائی کا سلسلہ شروع کیا۔ اس طرح سبکِ ہندی کی شعریات اور اس میں بیدل کی مرکزی حیثیت سے آگہی کے در کھلے اور پھر یہاں سے جدلیاتی فکر کے اس آر کی سرچشمے تک پہنچنا کچھ بعید نہیں تھا جو بودھی فکر کی عہد ساز بصیرتوں کے فیضان کی صورت روشن ہے۔

مغل دور کے ہندوستان کی فارسی شاعری جسے تحقیراً سبکِ ہندی کا نام دیا گیا خیال بندی، مضمون آفرینی، دقت پسندی اور تمثیل نگاری سے عبارت ہے۔ فارسی شاعری کا یہ طور خالص ہندوستان کی عطا ہے جسے ایک زمانے تک اہلِ ایران نے لائق اعتنا نہیں سمجھا بلکہ کم تر جانا۔ لیکن اب یہ بات خود ایرانی ماہرین شعر بھی تسلیم کررہے ہیں کہ سبکِ ہندی اور دانشِ ہند، خاص طور پر بودھی فکر کے درمیان گہرے رشتے رہے ہیں بلکہ یہ دونوں لازم وملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ غالب شروع سے ہی سبکِ ہندی سے حد درجہ متاثر رہے ہیں مگر اس کے اثرات ان کے ہاں بیدل کے توسط سے پہنچے اور بیدل کے بنیادی فکری سروکار اور وجدانی بصیرتیں غالب کے تخلیقی عمل کی بنیاد ساز بنیں۔

نارنگ صاحب نے اپنی اس کتاب میں فکروآگہی کے ساتھ ساتھ وجدانی خاموشیوں کی تہوں کو ایک ساتھ اس طرح چھوا ہے کہ ان میں مفکر کی عقل صوفی کے آئینۂ ادراک میں صبح کے تازہ پھول کی صورت بہار آفریں نظر آتی ہے۔ زبان اور خاموشی کا ذکر کرتے ہوئے انھوں

نے ان دونوں کے باہمی تعلق اور انحصار کو جن وجد آفریں لفظوں میں بیان کیا ہے وہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ کہتے ہیں ''دیکھا جائے تو زبان معنی کے افتراق اور التوا کا کھیل خاموشی کے اندھیرے کی مدد سے کھیلتی ہے۔ زبان کی اصل کی طرح معنی کی اصل بھی خاموشی ہے۔ خاموشی نہ ہوتو نہ معنی پاشی ممکن ہے نہ معنی در معنی اور نہ پس معنی۔ دوسرے لفظوں میں معنی آفرینی کو جو چیز ممکن بناتی ہے وہ خاموشی ہی ہے۔ گویا زبان میں معنی حاضر و معنی غائب سب غیاب ہی سے ممکن ہے۔ لفظ محدود ہے اور خاموشی لامحدود۔ خاموشی لفظ کو اس تحدید سے آزاد کراتی ہے اور معلوم میں نامعلوم کا در کھولتی ہے، خاموشی کا عمل زبان کے عامیانہ پن سے تصادم کا عمل ہے، یہ رواجِ عام یا مذاقِ عام سے ٹکراؤ کی صورت ہے جو بہ اعتبارِ نوع جدلیاتی ہے۔'' (ص 658)

غالب کی شاعری میں لفظ اور اس کے دوسرے سرے پر موجود خاموشی کے باہمی تفاعل کو نشان زد کرتے ہوئے نارنگ صاحب نے گویا حرف آخر کہہ دیا ہے۔ دنیا میں سرگرم مختلف زبانوں کی موجودگی میں کسی بھی زبان کے نہ ہونے اور مختلف زبانوں کے مذہبی شناختوں میں اسیر ہوجانے پر تاسف کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں ''... گویا خدا بھی ایک دوسرے کی زبان نہیں سمجھتے یعنی کوئی زبان اصل زبان نہیں ہے۔ ایسے میں طلسم کدۂ کائنات فقط ایک زبان سے کھلتا ہے، یعنی خاموشی کی زبان سے اور انسان اسی زبان کو بھول گیا ہے۔ غالب کا کارنامہ یہ ہے کہ غالب کی تخلیقیت اس محاورے کی بازیافت کرتی ہے۔ زبان کی آلودگی نے انسان کو چھوٹا، محدود اور تنگ نظر بنادیا ہے، شخصیتیں سکڑ گئی ہیں، انسان اپنے اندر بند ہوگیا ہے۔ غالب کی شاعری انسان کے چھوٹا اور پایاب ہوجانے کے خلاف احتجاج ہے۔ غالب کا محاورہ عرفان و سلوک کا نہیں، معنی آفرینی، حسن پروری اور کثیر الجہتی کا ہے اور اس کی گرہ وہاں کھلتی ہے جہاں عمومیت اور کثافت گرد کی طرح زبان سے گر جاتی ہے اور انسانیت اپنی فطری معصومیت کی بےلوث زبان سے گلے ملتی ہے۔'' (ص 465)

صد جلوہ روبرو ہے جو مژگاں اٹھایئے طاقت کہاں کہ دید کا احساں اٹھایئے

ایوانوں کے خوابیدہ چراغ

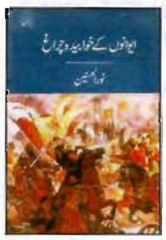

مصنف: نورالحسنین

صفحات: 381، قیمت: 380 روپے، سنہ اشاعت: 2013

ناشر: عرشیہ پبلی کیشنز، نئی دہلی

مبصر: حسین الحق، سرسید کالونی، نیا کریم گنج، گیا (بہار)

تاریخی ناول میں نے کم پڑھے ہیں۔

ایامِ طفلی میں جب گھر کی خواتین اسلامی کتابوں کے علاوہ تاریخی ناول بھی پڑھ لیا کرتی تھیں، یا پڑھ سکتی تھیں تب غالباً والدہ یا کسی خالہ کے طفیل کچھ پڑھا، ایسا کہیں لاشعور کے کسی کونے میں موجود ہے یا پھر مدرسے میں داخل ہوا تو اپنے سینیئرس کو دیکھا کہ وہ بطور تفریح تاریخی ناول ہی پڑھتے ہیں۔ مگر یہ سب کچھ کم سنی کے کھاتے ہی میں جائے گا کیونکہ جب تھوڑا بہت ہوش گوش والا ہوا تو ذہن نے پہلا سوال یہی کیا کہ آخر ہر ناول میں غیر مسلم ہیروئین ہی مسلم ہیرو کے عشق میں کیوں گرفتار ہوجاتی ہے، کیا ہماری خواتین کا خانۂ قلب بالکل خالی تھا، اُس میں کوئی داخل ہی نہیں ہوتا تھا، دوسرا الٹ پٹا پن یہ محسوس ہوا کہ مسلم ہیرو ہمیشہ بہتر اور خوبصورت صفات کا مجموعہ ہوتا تھا، آج یوں کہہ سکتے ہیں Typed ہوتا تھا۔

جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آہستہ آہستہ تاریخی ناولوں سے جی اُچاٹ ہوگیا۔

بعد کے دنوں میں تاریخی ناول 'خالد بن ولید' کی صورت میں سامنے آیا، جہاں صورتِ حال کو صورتِ حال واضح نہیں کرتی تھی، الفاظ کا شکوہ واضح کرتا تھا۔ قاضی عبدالستار کی جادوگری کا میں قائل ہوگیا مگر ظاہر ہے کہ جادو کے اثر کو تو کبھی نہ کبھی زائل ہونا ہی تھا، سو وہ اثر بالآخر رفع دفع ہوگیا۔ (جبکہ 'شب گزیدہ' کا اثر باقی رہ گیا)

البتہ 'آگ کا دریا' اور 'کئی چاند تھے سرِآسماں' کی سحرکاری شاید کچھ الگ نوعیت کی ہے، میں بالعموم 'تراشیدم، پرستیدم، شکستم' کا قائل ہوں، یہ دونوں ایسی 'خاک تراشیدہ' کا نمونہ ہیں کہ بار بار کی اُٹھا پٹخ کے بعد بھی یہ توڑنے سے بھی نہیں ٹوٹتے۔ ان دونوں میں جہاں تک 'آگ کا دریا' کا معاملہ ہے وہاں تاریخ سے زیادہ تاریخیت ہے اور 'کئی چاند تھے سرآسماں' میں تاریخیت سے زیادہ تاریخ ہے مگر تخلیقی بصیرت کے ساتھ۔

نورالحسنین کا نیا ناول 'ایوانوں کے خوابیدہ چراغ' اپنے عنوان کے لحاظ سے تاریخیت، تاریخی شعور اور تخلیقی شعور تمام اوصاف کی طرف اشارے کرتا ہے۔ اپنی ابتدا سے آخر تک نورالحسنین ایک کامیاب قصہ گو کی طرح قاری کو اپنے قصّے سے باندھے رکھتے ہیں اور صفحہ (10) پر ایک کردار کے ذریعے جو بات کہی جاتی ہے کہ ''انگریز مرے گا اور نہ اس دیش سے جائے گا... اُسے ہمیں ہی بھگانا ہوگا۔''

انگریزوں کو اپنے ملک سے نکال باہر کرنے کی یہ شدید تمنا پورے ناول میں جاری و ساری ہے اور شاید اس ناول کا Life force یہی ہے کیونکہ صفحہ (376) پر یہ ناول اس خوش کن نوٹ پر ختم ہوتا ہے کہ، ''ایک فرنگی تو کیا ہر سامراجی طاقت کو یہاں سے جانا ہوگا۔''

صفحہ 10 سے صفحہ 376 تک یہی جذبہ رواں دواں ہے۔ بہت نیک جذبہ ہے مگر سوال یہ ہے کہ ابھی ابھی یہ ناچیز حسین الحق ایک جملہ لکھ گیا "Lifr Force" جبکہ اس کی جگہ قوتِ حیات بھی لکھا جاسکتا تھا، پھر قوتِ حیات اُس وقت ذہن میں کیوں نہیں آیا؟ ایمانداری کی بات یہ ہے کہ معاملہ ترجیحات کا ہے، میرے لاشعور نے لائف فورس کو ترجیح دیا، کچھ لوگوں نے زوالِ روس کو ترجیح دیا نتیجہ سامنے ہے، آپ خواہش کرتے رہیں کہ ''ہر سامراجی طاقت کو یہاں سے جانا ہوگا'' مگر برق کی عبادت کرکے حاصل پر افسوس مضحکہ خیز عمل ہے۔ 1857 کے تھوڑا آگے سے 1857 کے کچھ پیچھے تک کی تاریخ، تہذیبی تاریخ اور ہندوستانی مسلمانوں کے مختلف قسم کے تفاعل کا اگر ایمانداری سے جائزہ لیا جائے تو احساس ہوتا ہے کہ ہمارے اتحاد کے اصل سبب 'گنگا جمنی تہذیب' کو تارپیڈو یا تاراج کرنے کا انتظام انگریزوں نے کم کیا اور ہندوستانیوں نے زیادہ کیا۔ نورالحسنین نے خواہ مخواہ پیر علی کی قربانی کو سید احمد شہید کے کھاتے میں ڈال دیا۔ جب حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے زمانے میں ہندوستانی مسلمانوں کا ایک طبقہ احمد شاہ ابدالی کو بھی خوش آمدید کہتا ہے۔ جب بڑی خوش اخلاقی اور عقلمندی اور خوش اسلوبی کے ساتھ مسلم یونیورسٹی کے بالمقابل دارالعلوم دیوبند قائم کردیا جاتا ہے۔ شریعتی تحریک اور سید احمد شہید کی اصلاحی تحریک سامنے آتی ہے تو یاد آتا ہے کہ محمد تغلق نے جب ابنِ تیمیہ کے سفیر کا استقبال کیا تھا اور جب محمد تغلق کے دربار میں ابنِ تیمیہ کے سفیر اور حضرت نظام الدین اولیاؒء کے درمیان 'مناظرے کی طرح کچھ' ہوا تھا، لائن تو اُسی دن کھنچ گئی تھی۔ ایک طرف صوفیا تھے جو سنتِ نبویؐ کی پیروی میں مقامی تہذیب سے بیر و دشمنی نہ رکھنے کی علامت تھے۔ لہٰذا خانقاہوں میں ہمیشہ 'مشترکہ ہندوستانی تہذیب' کو قبول کیا گیا اور دوسری طرف ابنِ تیمیہ اور اُن کے ہندوستانی ہم نوا تھے جو دنیا سے 'عالمی محمدؐ' کے بجائے 'محمد عربیؐ' کو روشناس کرانے کی کوشش میں لگے رہے اور آج تک ہیں۔

1857 کے بعد سے ہندوستان کی تقسیم تک، پھر تقسیم ہند سے بابری مسجد کی شہادت تک، ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کا یہی وہ Fundamentalist co group۔

محمد ایوب واقف-ایک مطالعہ

ڈاکٹر سیفی سرونجی

صفحات: 111، قیمت: 150، سنہ اشاعت: 2013

ناشر: انتساب پبلی کیشنز، سیفی لائبریری سرونج (ایم پی)

مبصر: شاکر علی صدیقی، ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی

ڈاکٹر سیفی سرونجی کی تازہ ترین کتاب 'محمد ایوب واقف-ایک مطالعہ' اشاعتی

زیورات سے آراستہ ہوکر حلقۂ ارباب ادب میں لائق توجہ ہے۔ یہ کتاب دراصل محمد ایوب واقف کی شخصیت اور ادبی خدمات کے سرسری جائزے کو محیط ہے۔ اس کے مطالعے سے ایک طرف مصنف کی ذہانت و فطانت تو دوسری طرف مشاہیر ادب میں واقف صاحب کی مقبولیت اور پذیرائی کا اظہار ہوتا ہے۔ مصنف کا کمال یہ ہے کہ ایوب واقف کی ادبی خدمات اور شخصی قدر و منزلت ''مشاہیر کی زبانی'' کا تاثراتی جائزہ لیا ہے۔ اس کتاب کے علاوہ بھی سیفی سرونجی متعدد کتب و مضامین کے مصنف اور مرتب ہیں، جن کا ایک منفرد انداز اور لب و لہجہ ہے۔ ان کی کتابوں میں ''محمد ایوب واقف کی شخصیت اور ادبی خدمات، انتساب کا واقف نمبر، تنقید مجھے نہیں آتی، خالد محمود شخصیت اور فن'' وغیرہ دیگر کتابیں اور مضامین منظر عام پر آچکے ہیں، جن کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ سیفی سرونجی کو لکھنے کا ایک جنون ہے۔ بہر کیف وہ جس درجہ میں لکھنے پڑھنے میں مشغول اور منہمک ہیں، قابل اعتنا ہے۔

زیر تبصرہ کتاب درحقیقت ایک نیا تجربہ ہے، یہ اس لحاظ سے کہ بقول مصنف ''میں اپنے محسن و کرم فرما محمد ایوب واقف کی خدمت میں یہ کتاب پیش کر کے خراج تحسین ادا کرنے کی کوشش کر رہا ہوں''۔ (ص 106) ظاہر ہے کہ خراج تحسین کے کچھ بنیادی فرائض حسنہ ہوتے ہیں، لہٰذا ان فرائض کا خیال رکھتے ہوئے مصنف نے تہنیت کے آدابی جملے اور فقرے، نیز شخصی عظمت کے ثانوی ذرائع کو اپنے اظہار کا آلہ بنایا ہے۔ اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ جب مصنف نے واقف صاحب کے سرسری جائزے سے قبل باضابطہ دو کتابیں ''محمد ایوب واقف شخصیت اور ادبی خدمات اور دوسری کتاب انتساب کا ''واقف نمبر'' جس میں محمد ایوب واقف کی شخصیت اور ادبی خدمات کا مفصل احاطہ کیا جا چکا ہے، تو پھر سرسری جائزہ کیا معنی رکھتا ہے؟ آئیے اس کا جواب خود مصنف کے ہی قلم سے سنیے!

ادب میں کالی داس گپتا رضا ماہر غالبیات مانے جاتے ہیں، عبدالحق ماہر اقبالیات، ایوب واقف ماہر جگن ناتھ آزاد اس طرح اب مجھے لوگ ماہر واقفیات کہنے لگے ہیں کہ میں نے اب تک ایوب واقف صاحب پر سہ ماہی انتساب کا ضخیم ایوب واقف نمبر اور محمد ایوب واقف شخصیت اور ادبی خدمات اور تازہ کتاب محمد ایوب واقف ایک مطالعہ، ادب کی دنیا میں پیش کرنے کی جرات کی ہے اور مجھے اس بات پر فخر ہے کہ میں نے ایک بڑی شخصیت اور ان کے کارناموں کا بغور مطالعے کے بعد یہ قدم اٹھایا اور ماہر محمد ایوب واقفیات کی فہرست میں شامل ہوا۔ (ص 7-106)

ادب کی روایت میں 'ماہر' یا 'شناس' کا لقب، کثرت تعداد کے بجائے شخصیت کے فکری اور عملی مختلف النوع نکات کے انکشافی مطالعے پر دال ہے۔ بہر حال کتاب مختصر تر سوانح اور نسب نامے سے شروع ہوکر شماراتی تصنیفات و تالیفات سے ہوتی ہوئی مشاہیر کے خطوط، اقتباسات اور منظوم پر اختتام پذیر ہوتی ہے۔ جس کے مابین 6 خطوط اور کم و بیش 69 طویل و مختصر تاثراتی اقتباسات (واقف صاحب کی کتابوں اور مضامین کے مختلف حوالوں سے) نقل کیے گئے ہیں، نیز خراج تحسین میں چند اشعار اور 3 نظمیں شامل ہیں۔ پہلا خط گوپی چند نارنگ کا ہے، اس میں مضمون کی منظوری کے سلسلے میں جواب نہ آنے کی تشویش کا اظہار ہے۔ دو خط علی سردار جعفری کے ہیں، ایک میں نظم ''بغاوت'' کی تفہیمی نارسائی کی شکایت اور اس کی وضاحت پر مبنی ہے۔ دوسرے میں رسالہ ''نیا سفر'' کے خود نوشت نمبر میں مضمون لکھنے کی سفارش کی ہے۔ دو خط ڈاکٹر خلیق انجم کے ہیں، پہلے خط میں حصول مضمون کی اطلاع ہے اور دوسرے خط میں (واقف صاحب کا مضمون ''اردو اور نئی نسل'') کی تعریف کی ہے۔ ایک خط شمس الرحمٰن فاروقی کا ہے، اس میں کتاب کی حصول یابی رسید اور (واقف صاحب کا مضمون ''اردو رسم الخط'') کو تعریفی کلمات سے نوازہ گیا ہے۔ مزید تفصیل سے گریز کرتے ہوئے بلا خوف تردد میں کہنا چاہتا ہوں کہ اگر محمد ایوب واقف کی ادبی خدمات کو ان کی بے بہا تصنیفات اور تالیفات کی روشنی میں سنجیدگی اور امعان نظری سے مطالعہ کر کے معنی خیز نتائج برآمد کیے جاتے تو قارئین کے لیے زیادہ نفع بخش ہوتا۔ اس کے باوجود یہ کتاب محمد ایوب واقف کو اوپری سطح سے سمجھنے کے لیے نہایت سودمند ہے۔

ڈاکٹر سیدہ جعفر (فن اور شخصیت کا مطالعہ)

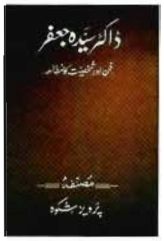

مصنف: پرویز شکوہ
صفحات: 132، قیمت: 100 روپے، سنہ اشاعت: 2013
ناشر: نظامی آفسیٹ پریس لکھنؤ
مبصر: راحت افزا، ریسرچ اسکالر، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

زیر تبصرہ کتاب ڈاکٹر سیدہ جعفر فن اور شخصیت کا مطالعہ لکھنؤ یونیورسٹی کے اسکالر پرویز شکوہ کے ایم اے اردو کا مقالہ ہے۔ پرویز نے اپنے مقالے کے لیے ایک ایسی مشہور و معروف شخصیت کو منتخب کیا جو کہ ادبی دنیا کے لیے محتاج تعارف نہیں۔ ڈاکٹر سیدہ جعفر نے تنقید و تحقیق کے میدان میں بڑے کارنامے انجام دے کر اردو ادب میں گراں قدر اضافہ کیا۔ شاہ تراب کی تصنیف 'من سمجھاون' کو اردو حلقے میں متعارف کرانے کا سہرا سیدہ جعفر ہی کے سر جاتا ہے۔ سیدہ جعفر مختلف یونیورسٹیوں سے وابستہ رہی ہیں اور ساتھ ہی مختلف اکادمیوں نے انھیں ایوارڈ سے سرفراز کیا ہے۔ اس کتاب میں پرویز شکوہ نے سیدہ جعفر کی ہمہ جہت شخصیت اور ان کے علمی اور ادبی کارناموں کا احاطہ کرنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔

یہ کتاب پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ باب اوّل میں پرویز شکوہ نے سیدہ جعفر کے حالاتِ زندگی کو بڑی خوبی سے قلم بند کیا ہے اور ان تمام امور کی نشاندہی کی ہے جو سیدہ جعفر کی شخصیت کی تکمیل میں معاون ثابت ہوئیں۔ مصنف نے سیدہ جعفر کی شخصیت کا بھرپور مطالعہ کر کے ان کی زندگی کے قریب قریب سبھی پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ البتہ اگر مصنف خود موصوفہ سے انٹرویو یا ملاقات کے ذریعے کچھ باتیں اخذ کر کے انھیں کوٹ کر دیتے تو ان کی سوانح سے متعلق مزید معلومات میں اضافہ ہوسکتا تھا۔

دوسرے باب میں سیدہ جعفر کی تصانیف کا تعارف پیش کیا ہے۔ مصنف نے اس بات کو واضح کیا ہے کہ سیدہ جعفر وہ پہلی مصنفہ ہیں جنھوں نے یہ ثابت کیا کہ ماسٹر رام چندر اردو کے پہلے مضمون نگار ہیں۔ سرسید نے محض اس کی توسیع کی ہے۔ یہ کہنا بجا ہوگا کہ سیدہ جعفر تحقیق و تنقید کے میدان میں معروف شخصیت ہیں۔ ان کی بیشتر تصانیف ان کے تنقیدی شعور کا پتہ دیتی ہیں۔ سید احتشام حسین اور گیان چند جین جیسے اعلیٰ پائے کے نقادوں نے ان کی خصوصیت کا لوہا مانا ہے۔

کتاب کا تیسرا باب سیدہ جعفر کے تحقیقی کارناموں پر مبنی ہے۔ سیدہ جعفر دکن سے تعلق رکھتی ہیں اور دکنی زبان پر قدرت ہونے کی وجہ سے ان کی تحقیق کا میدان بھی زیادہ تر دکنی ہی ہے۔ وجہی، غواصی، نصرتی اور دکن کی دوسری تخلیقات کا تجزیہ کر کے اپنی تحقیق کا محور بنایا پرویز اس بات پر دلیل دیتے ہیں کہ 'دکن میں تنقید کی روایت' کے موضوع پر سیدہ جعفر نے سب سے پہلے قلم اٹھایا۔ مصنف نے سیدہ جعفر کی تمام تصانیف کا تعارف پیش کرتے ہوئے مستند حوالوں کے ذریعے ان کے تحقیقی نقطۂ نظر کی تردید کی ہے۔

آخری باب میں پروفیسر سیدہ جعفر کے علمی و ادبی کارناموں کا مجموعی تاثر پیش کیا گیا ہے اور مصنف نے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ سیدہ جعفر محض ایک محقق یا نقاد ہی نہیں ہیں بلکہ ترجمہ اور تخلیق کے میدانوں میں اپنی شناخت قائم کر چکی ہیں۔ ان کی تحریر انشا پردازی سے آراستہ ہے۔ اسلوب نہایت دلفریب اور پراثر ہے۔ ریڈیو اور ٹی وی سے بھی وابستہ رہی ہیں۔ تاریخ سے بھی شغف رکھتی ہیں۔ اس طرح یہ باب سیدہ جعفر کی

ہمہ گیر شخصیت کی تصویر پیش کرتا ہے۔ اس مختصر مقالے میں پرویز شکوہ نے سیدہ جعفر کے قریباً سبھی اہم گوشوں کو منور کرنے کی کوشش کی ہے۔

ہمیں امید ہے کہ اس کتاب کے ذریعے پروفیسر سیدہ جعفر جیسی ممتاز شخصیت کی طرف متوجہ ہوکر ان کی علمی و ادبی تحریروں سے آشنائی ہوسکے گی اور پرویز شکوہ کی یہ کتاب اہم معلومات کے باعث ادبی حلقوں میں اپنا مقام حاصل کرنے میں کامیابی ہوگی۔

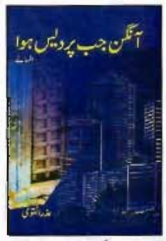

آنگن جب پردیس ہوا

مصنف: عذرا نقوی

صفحات: 151، قیمت: 200 روپے، سنہ اشاعت: 2013

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی

مبصر: امتیاز احمد علیمی، ریسرچ اسکالر شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

عذرا نقوی بیک وقت مضامین اور اخبار میں کالم کے علاوہ افسانہ بھی لکھتی ہیں اور شاعری بھی کرتی ہیں۔

زیر نظر کتاب 'آنگن جب پردیس ہوا' عذرا نقوی کا افسانوی مجموعہ ہے جو 2013 میں ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی کے ذریعے چھپ کر منظر عام پر آچکا ہے۔ اس مجموعے کا انتساب مصنفہ نے 'اپنے ابا جان قیصر نقوی صاحب اور امی سیدہ فرحت صاحبہ کے نام جنھوں نے حرف و معنی سے متعارف کرایا' کے نام کیا ہے۔ انیس افسانوں پر مشتمل مجموعے کے ٹائٹل سے ہی اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں شامل بیشتر افسانوں کا تعلق ہجرت کے مسائل سے ہوگا اور یہی درست بھی ہے کیونکہ بیشتر افسانوں کا تعلق ان مہاجرین سے ہے جو زیست کے لیے تلاش معاش میں ایک ملک سے دوسرے ملک ہجرت کرتے ہیں اور اس سلسلے میں درپیش مسائل کیا ہوتے ہیں، کن کن اذیتوں کو برداشت کرنا پڑتا ہے، کتنے مصائب و آلام سے گزرنا ہوتا ہے، اس برق رفتار اور مصروف معاشرے میں تنہائی کا کرب کیا ہوتا ہے، اپنی اور پرائی زمین سے لگاؤ کتنا ہوتا ہے، ان سب کا اندازہ اس مجموعے کے پہلے افسانے 'دوگز زمین' سے کیا جاسکتا ہے۔ آج کی زندگی میں انسان کا اپنا ہی آنگن پردیس بنتا نظر آرہا ہے جس کا اندازہ ذیل کے اقتباس سے کیا جاسکتا ہے:

''کتنا کہا کہ رہنے دے میں روز کوئی سالن پکا دیا کروں گی مگر نہیں.. سب خود ہی کرے گی۔ اتوار کے روز دن بھر کھڑے ہوکر ہفتے بھر کے لیے کھانا پکا پکا کر فریز میں رکھ دے گی، اے ہے! یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ روز روز کھانا پکانے سے گھر میں پیاز اور مسالوں کی بوبس جاتی ہے... دوپہر میں علی آئے گا اسکول سے، خود ہی فریز سے اپنی وہ اسپگیٹی یا pizza نکالے گا، Microwave میں خود ہی گرم کرے گا اور کھالے گا...'' ص 25

اس کے علاوہ عورت کے اپنے مسائل کیا ہیں، ایک عورت اپنی زندگی میں کیسے کیسے خواب دیکھتی ہے خصوصاً غریب خاندان کی وہ لڑکیاں جو امراء و روسا کے سایہ عاطفت میں رہ کر ان کی جوتیاں سیدھی کرتے کرتے شباب کی منزلیں طے کرتی ہیں تو انھیں 'چمکیلی تصویریں' کس قدر دلفریب لگتی ہیں، اپنی خواہشات کو سینے میں کس طرح دبائے رکھتی ہیں۔ اس کا اندازہ اپنی حیثیت کو جان کر کشمکش میں مبتلا ہوکر اپنے آپ کو کوستی ہوئی عفت بیگم نظر آتی ہے۔

اس مجموعے میں شامل ایک افسانہ 'بوگن ویلیا کی اوٹ سے' بیانیہ تکنیک میں لکھا ہوا ایک اچھا افسانہ ہے جس میں ہمارے ارد گرد پھیلی ہوئی بدنمائی کے بیج اگائی ہوئی بوگن ویلیا کی بیل کو جلد یا دیر ڈھیر ہو جانے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ افسانہ 'رین چوک' موضوع اور اسلوب کے اعتبار سے بہتر ہے۔ افسانہ 'رانی'، 'واپسی کا سفر'، 'الہ دین کا چراغ' اور '460 ایلمر اسٹریٹ' وغیرہ رپورتاژ سے بہت حد تک قریب نظر آتا ہے۔ جب کہ 'dead end'، 'بے خانما'، 'آنگن جب پردیس ہوا' ایسے افسانے ہیں جس میں درد بھی ہے اور چبھن بھی، کسک بھی ہے اور طنز بھی، تنہائی کا کرب بھی ہے اور سماجی بندشیں بھی وغیرہ۔ اس مجموعے کے بیشتر افسانوں میں ہجرت کے مسائل اور موضوعات قلمبند کیے گئے ہیں جن میں سے زیادہ تر مسائل طبقہ نسواں سے تعلق رکھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کی زیادہ تر کہانیوں کے کردار نسوانی ہیں اور ہر نسوانی کردار ان کا اپنا کردار لگتا ہے کیونکہ وہ جس کردار کو جنم دیتی ہیں اسے پہلے اپنے اوپر جھیل لیتی ہیں اور اس کی خوگر ہوکر خود وہ کردار بن کر جیتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے نسوانی کرداروں میں تنویر زہرا، سلوی، عفت بیگم، مسز ملز، میری این، جارج، ثمینہ، رانی وغیرہ ایسے ہیں جن کے ذریعے عورت کے مختلف مسائل کی عکاسی کی گئی ہے۔

عذرا نقوی کے زیادہ تر کردار اپنے وطن، اپنی زمین، اپنے آدرش اور تہذیب و ثقافت سے جدائی کا دکھ سہنے والے کردار ہیں لیکن مصنفہ کی انفرادیت یہ ہے کہ انھوں نے بعض کرداروں میں جان ڈال دی ہے۔ اس مجموعے میں شامل قریب قریب سبھی افسانے Readable ہیں ان افسانوں کو پڑھ کر بہت زیادہ تو نہیں لیکن کچھ تو فائدہ ضرور ہوگا۔ البتہ اس مجموعے کو پڑھتے ہوئے جملے کی بے ربطگی، تذکیر و تانیث کی اغلاط، املے کی عدم درستگی کا بہت زیادہ احساس ہوا، ممکن ہے کہ یہ ٹائپنگ کی غلطیاں ہوں۔ مگر فنی نقطہ نظر سے تجسس، ربط و تسلسل اور وحدت تاثر کی حد درجہ کمی کا احساس ہوا۔ البتہ بعض افسانے ایسے ہیں جس میں کچھ تجسس پایا جاتا ہے لیکن یہ خال خال ہی ہیں۔ بہر حال مذکورہ تمام خامیوں سے قطع نظر یہ اردو افسانے میں جہاں ایک اضافے کی حیثیت رکھتا ہے وہیں اردو افسانے کی روایت میں اسے کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اس کتاب کا سرورق دیدہ زیب ہے کاغذ بھی درست ہے مگر 151 صفحات پر مشتمل کتاب کی ضخامت کے اعتبار سے قیمت مناسب نہیں ہے کیونکہ 200 روپیہ طلبہ کے جیب پر گراں بار ثابت ہوگا۔ امید ہے کی ادبی حلقوں میں اس کی پذیرائی ہوگی۔

سفید بالوں والا بوڑھا

مصنف: رضوان رضوی

صفحات: 176 قیمت: 200 روپے

ناشر: منظور بک ڈپو 2880 بلبلی خانہ، دہلی۔6

مبصر: ڈاکٹر عزیز احمد خان، جی 50، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی

بچوں کے مثبت اقدار کی نشوونما میں کہانیوں کا اہم کردار رہا ہے۔ نہ صرف بچے بلکہ سماج کا ہر طبقہ ان سے لطف اندوز ہوتا ہے اور سبق بھی حاصل کرتا ہے۔ ماضی میں بچوں کی کردار سازی کے لیے بہت سے ادیبوں نے گراں قدر خدمات انجام دیں لیکن موجودہ دور میں اس طرف توجہ بہت کم دی گئی۔

رضوان رضوی بچوں کے اندر بہتر اقدار پیدا کرنے کے لیے اس سے پہلے بھی مختلف کتابیں لکھ چکے ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب 'سفید بالوں والا بوڑھا' میں 18 کہانیاں، 5 ڈرامے، 4 مضامین اور 12 پہیلیاں اور ذہنی مشق کے لیے سوالات شامل ہیں۔ کتاب میں مقدمہ کے طور پر شامل 'بچوں سے باتیں' نہایت ہی ہمدرد، تجربہ کار اور حساس شخص کے ذہن سے نکلی باتیں ہیں۔

رضوان رضوی نے بچوں کو نادر مثالوں کے ذریعے یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ مطالعہ انسان کے ذہن اور اس کی صلاحیت میں اضافے کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ وہ اپنی مثال پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ 'جب میں آٹھویں جماعت میں تھا تبھی میری کہانی ماہنامہ ''حرم'' لاہور کے فروری 1943 کے شمارے میں شائع ہوئی تھی۔'' اس طرح رضوان

صاحب ہر طرح سے اس بات کے متمنی نظر آتے ہیں کہ بچوں میں لکھنے پڑھنے کا شوق پیدا ہو۔

زیر تبصرہ کتاب میں پہلی کہانی کا عنوان ''ایک بہادر بچہ'' ہے۔ کہانی نہایت مختصر اور جامع ہونے کے ساتھ ساتھ بچوں کے اندر بہادری پیدا کرنے اور ذمے داری کے تئیں حساس ہونے کا جذبہ بیدار کرتی ہے۔ دوسری کہانی 'ننھا برنی' ہے۔ یہ ایک ایسے بچے کی کہانی ہے جس کا چچا ایک افسانہ نگار ہے۔ ننھا برنی مستقبل میں پائلٹ، شیف، انڈومولوجسٹ وغیرہ بننا چاہتا ہے اور اپنی خواہش کا اظہار اپنے چچا سے کرتا ہے۔ اس کے چچا ان پیشوں میں آنے والی پریشانیوں کا ذکر کرتے ہیں جس سے وہ ڈر جاتا ہے ساتھ ہی ساتھ چچا سے مرعوب ہوتا ہے کہ یہ اتنی جانکاری کہاں سے رکھتے ہیں۔ آخر میں اسے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان تمام پیشوں سے منسلک نہیں رہے بلکہ مطالعے کے ذریعے انھیں اتنی معلومات حاصل ہوئی ہیں۔

اگلی کہانی ''سفید بالوں والا بوڑھا'' ہے۔ اس کہانی میں جانوروں، پرندوں غرضیکہ تمام مخلوق کے ساتھ رحم کرنے کی نصیحت کی گئی ہے اور ساتھ ہی اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ اس کا بہتر بدلہ ملتا ہے۔ آخر میں ایک مچھیرا کی کہانی ہے جو رحم دل اور نیک انسان ہے۔ وہ ایک کچھوے کو چند شرارتی بچوں سے آزاد کرادیتا ہے جس کے نتیجے میں کچھوا اسے اپنے دیش لے جاتا ہے اور خوب سیر کراتا ہے۔ وہاں کی شہزادی بھی اس کی خوب آؤ بھگت کرتی ہے۔ کچھ دنوں بعد وہ اپنے وطن واپس آنے کی خواہش ظاہر کرتا ہے تو اسے واپسی پر شہزادی ایک صندوقچہ دیتے ہوئے نصیحت کرتی ہے کہ اسے ہمیشہ اپنے ساتھ رکھنا اور کبھی نہ کھولنا، لیکن مچھیرا جب واپس آتا ہے تو یہاں کے حالات دیکھ کر وہ پریشان ہو جاتا ہے اور پریشانی کے عالم میں صندوقچے کا ڈھکن کھول دیتا ہے۔ اس کے کھلتے ہی مچھیرا سفید بالوں والا بوڑھا آدمی بن جاتا ہے۔ اس طرح اس کہانی میں ایک طرف رحم دلی اور نیکی کے بدلے کو واضح کیا گیا ہے تو دوسری طرف وعدہ خلافی کی سزا کو بیان کیا گیا ہے۔

'نیٹ فرینڈ' نام کی کہانی میں ایک بچہ اپنے والدین کے سمجھانے کے باوجود نیٹ فرینڈ بنالیتا ہے۔ لیکن ایک دن وہی دوست اس کے والدین کی عدم موجودگی میں اسے یرغمال بنا کر گھر سے تمام زیورات اور روپے وغیرہ لوٹنا چاہتا ہے۔ اس کے پڑوسی کو اس کی چیخ سنائی دیتی ہے اور وہ موقع پر پہنچ جاتا ہے اس طرح بہت بڑا حادثہ ہونے سے بچ جاتا ہے۔ اس کہانی میں بھی بچوں کو نصیحت کی گئی ہے کہ وہ والدین کی باتوں کو مانیں اور کوئی ایسا کام نہ کریں جو مصیبت کا پیش خیمہ ہو۔ ''ٹیری اور جیکی'' دو بہادر بچوں کی کہانی ہے۔ اس کتاب میں ایک کہانی ''داداگیری'' کے نام سے شامل ہے۔ یہ کہانی بچوں کی نفسیات کو ظاہر کرتی ہے۔ ندامت کے آنسو، تین سوال وغیرہ کہانیاں بھی دلچسپ ہیں۔ دو اور کہانیاں قابل ذکر ہیں۔ 'لالہ جی اور بھوت' دوسری کہانی 'کرشمہ علم کا' ہے۔ اس کہانی میں ستی پرتھا کی رسم کو ختم کرنے کا ذکر ہے جسے علم کی برکت نے آسانی سے ختم کر دیا۔

کتاب کا دوسرا حصہ ڈراموں پر مشتمل ہے۔ اس کے بعد مضامین شامل ہیں جن میں دو معلوماتی اور دو تاریخی مضامین ہیں۔ کتاب کے آخر میں ''بتاؤ تو بھلا'' کے عنوان سے پہیلیاں شامل ہیں۔ اس طرح یہ کتاب بچوں کے ادب میں نہایت ہی اہم اضافہ ہے۔

چسکا (افسانوی مجموعہ)

مصنف: حسن رہبر

صفحات: 128، قیمت 150 روپے

ناشر: مصنف

مبصر: عذرا نقوی، علی گڑھ

حسن رہبر کے افسانوں کا یہ دوسرا مجموعہ ہے۔ اس مجموعے میں اکیس کہانیاں شامل ہیں۔

مجموعے کا پہلا افسانہ 'ہارا ہوا کارگل' ہے۔ جس میں ایک گم شدہ فوجی افسر (جس کو حکومت نے بھگوڑا قرار دے دیا تھا) کی بیوہ، پانچ سال تک پریشانیاں اٹھانے کے بعد، دوسری شادی کرلیتی ہے اور قسمت کی ستم ظریفی دیکھیے کہ عین اپنی دوسری شادی کی سالگرہ کے دن ٹی وی پر وہ اپنے پہلے شوہر کے زندہ ہونے اور دشمن کی قید سے رہا ہونے کی خبر سنتی ہے۔

اس مسئلے پر اس کتاب کے ایک افسانے 'موت کا سوداگر' میں دو حسین و جوان لڑکیوں کے ذریعے، ہوٹل میں کمرہ لے کر، عیاش لڑکیوں کے انداز میں لڑکوں کو پھنسا کر، ان کے گردوں کی چوری کی کچھ عجیب سی داستان ہے۔

مجموعے میں شامل کچھ افسانوں انسانی رشتوں کی خوبصورتی و نزاکت، پیچیدگی، خودغرضی کا اظہار ہے۔ افسانہ 'بگولہ' کا ہیرو دو لڑکیوں سے جذباتی طور پر جڑا ہوا ہے۔ حالات کچھ ایسے ہوتے ہیں کی ان میں سے کوئی بھی لڑکی اس کی نہیں ہو پاتی۔ تینوں کرداروں کی جذباتی کشمکش کو کہانی میں بخوبی پیش کیا گیا ہے۔ اس کہانی میں کوئی ویلن نہیں ہے، تینوں کرداروں سے قاری کو ہمدردی ہو جاتی ہے۔

اس مجموعے میں جانے پہچانے سماجی مسائل کے اردگرد گھومتی کہانیوں کے درمیان۔ افسانہ ''چسکا'' چونکا دیتا ہے۔ یہ موضوع اس نئے دور کی ایک حقیقت ہے۔ افسانہ 'چسکا' خلیجی ممالک میں جا کر نوکری کرنے والی ایک لڑکی کی داستان ہے جو اپنے گھر کی کفالت کے لیے وہاں جاتی ہے اور دھیرے دھیرے اپنی کمپنی کے شیخ، اس کے بیٹے اور یہاں تک کہ ان کے ڈرائیور تک کے ساتھ ناجائز تعلقات رکھتی ہے اور مستقل ایک احساس جرم میں بھی مبتلا رہتی ہے۔ آخر کار ایک دن سوچتی ہے کہ کب تک میں یہ ذلیل زندگی گزاروں گی، اب تو میں نے کافی پیسہ بھی کما لیا ہے۔ یہ سوچ کر وہ نوکری چھوڑ کر واپس اپنے وطن آجاتی ہے۔ چھوٹی بہن کی شادی دھوم دھام سے کرتی ہے، اپنا نیا مکان بنواتی ہے۔ پیسہ ختم ہونے لگتا ہے، تب وہ ایک بار پھر وہاں نوکری کرنے کی درخواست بھیجتی ہے اور اسی دلدل میں واپس جانے کی تیاری کرنے لگتی ہے۔

'کانٹے بن گئے پھول' ایک غیر مانوس موضوع پر لکھا گیا بہت اچھا افسانہ ہے۔ ایک جوان بیٹے کی بیوہ ماں جب دوسری شادی کرنے کا فیصلہ کرتی ہے تو وہ شروع میں تو یہ بات برداشت نہیں کر پاتا لیکن پھر خود ہی اسے خیال آتا ہے اور وہ ماں کی خوشی میں شامل ہو جاتا ہے۔ ان موضوعات پر افسانے ذرا کم ہی لکھے جاتے ہیں۔ انسانی رشتوں کی نزاکتیں اس کہانی میں بہت نفاست سے لکھی گئی ہیں۔

مجموعے میں شامل دیگر انسانی رشتوں پر مبنی افسانے جانے پہچانے موضوعات پر ہیں۔ جیسے افسانہ 'چھٹتے بادل' میں دکھایا گیا ہے کہ ازدواجی زندگی میں معمولی سی غلط فہمی کس طرح رشتوں میں بڑی دراڑ ڈال سکتی ہے۔ کہانی کا اختتام غلط فہمی کے ازالے کے بعد بخیر ہوتا ہے۔ ''ڈوبتی ابھرتی ریکھائیں'' میں محبت کے تکون میں پھنسے ایک لڑکے اور دو بہنوں کی کہانی ہے۔ افسانہ 'احساس کا کرب' میں بھی محبت ایثار، اور دل ٹوٹنے کی کہانی ہے، جس میں محبت کی جیت ہوتی ہے۔ 'ہنستے پھول' افسانہ ہے۔ میں اپنے باپ کی اکلوتی امیر لڑکی اپنے خاندانی نوکر کے پڑھے لکھے اور قابل لڑکے سے محبت کرتی ہے اور اس سے شادی کرنا چاہتی ہے لیکن اس کے والد راضی نہیں ہوتے اور چالیں چلتے ہیں کہ یہ شادی کسی طرح نہ ہو۔ لیکن اس کے والد کے ایک دوست جنھوں نے اپنی جوانی میں طبقاتی فرق کی وجہ سے ناکام محبت کی دل پر چوٹ کھائی تھی ان نوجوان محبت کرنے والوں کو ملانے کے لیے ایک چھوٹا سا جھوٹ بولنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔

اس مجموعے میں شامل کئی افسانے ہندوستان کے موجودہ سیاسی اور سماجی حالات ، فرقہ وارانہ فسادات، تقسیم ہند اور قیام بنگلہ دیش ، بنگلہ دیش کے بہاریوں کے مسائل، بھوپال گیس سانحے وغیرہ پر مبنی ہیں۔ ان میں مصنف کا سیاسی اور سماجی شعور اور دردمندی پوری طرح جلوہ گر ہے۔ افسانہ 'سازش' فرقہ وارانہ فسادات کے دوران سفاکیوں اور لالچ اور لوٹ مار کا ایک پہچانا منظرنامہ ہے۔ فسادات کے تناظر میں لکھا گیا افسانہ 'تحفہ' میں ایک مسلمان فوجی جوان کا ذکر ہے جس نے اپنے دیش کی خاطر پڑوسی ملک سے جنگ کے دوران (پڑوسی ملک کا نام نہیں بتایا گیا ہے) شہید ہوا اور حکومت کی طرف سے اسے موت کے بعد بہادری کے لیے اعزاز اور تمغہ بھی دیا گیا تھا۔ اس کے شہر میں جہاں اب اس شہید کی بیوہ رہتی تھی ، عید کے دن شرپسندوں نے دہشت پھیلا دی۔ ظلم اور بربریت کی انتہا کر دی ۔ ہمیشہ کی طرح حالات کو قابو کرنے کے لیے فوج کو بلایا گیا۔ افسانے کا اختتام علامتی انداز کا ہے اور بہت پُر اثر ہے۔

افسانہ 'تصویر کا دوسرا رخ' مصنف کی سیاسی بصیرت کا غماز ہے۔ جمنا داس ایک زمیندار خاندان کا فرد ہے لیکن غریبوں کا ہمدرد ہے، مشہور سوشل activist ہے۔ جس کی وجہ سے وہ بہت پریشانیاں بھی اٹھاتا ہے، جیل جاتا ہے۔ جیل میں رہ کر بھی اس نے عوام کے دلوں پر راج کیا اور آخر کار انتخابی دنگل میں اتر آتا ہے اور کامیاب ہوتا ہے۔ لیکن جب وہ منسٹر بنتا ہے تو کس طرح دھیرے دھیرے لال فیتے اور سیاسی مصلحتوں میں گھر کر ایک عام نیتا جیسا بن جاتا ہے جو غریبوں اور حق داروں کے لئے کچھ نہیں کر سکتے۔

افسانہ 'ان دیکھے خوابوں کی تعبیر' تقسیم ہند، قیام پاکستان، بنگلہ دیش میں بہاریوں کے مسائل اور پاکستان میں مہاجر اور غیر مہاجر کا معاملہ اور دہشت گردی کی مختصر تاریخ ہے۔ مصنف نے کہیں بھی کسی شہر یا مقام کا نام نہیں لکھا ہے لیکن سب کچھ کہہ دیا اور بہت پراثر انداز میں کہا ہے۔ ان کی اس تحریر میں ایک آپ بیتی کا سا رنگ ہے۔

ایک قدیمی شہر میں ایک جراثیم کش دوائیں بنانے والی بدیسی فیکٹری سے گیس کے اخراج اور اس کی تباہ کاریوں پر مبنی افسانہ 'وقت کا خدا' صاف طور پر بھوپال گیس سانحے پر مبنی ہے لیکن یہاں بھی مصنف نے شہر کا نام نہ لکھ کر سانحے کی تباہ کاریوں، معاوضہ دینے میں حکام کی بے حسی، بے ایمانی، لالچ اور بے ضمیری کی کہانی لکھی ہے۔

'اجتناب' حسن رہبر کا ایک کامیاب افسانہ ہے جس میں انھوں نے بہت خوبی سے مذہب کے نام پر کاروبار کا کھیل دکھایا ہے۔ ایک ایمان دار پولس افسر، پوری نیک نیتی سے ایک اجڑے ہوئے پارک میں شنکر بھگوان کا مندر بنواتا ہے۔ سماج کے دوسرے لوگوں کو اس میں شامل کرتا ہے اور مندر نرمان سمتی تشکیل دیتا ہے لیکن خود اس کا ممبر نہیں بنتا کیونکہ وہ ایک سرکاری ملازم ہے اور یہ بات اس کے اصول کے خلاف ہے۔ دھیرے دھیرے یہ مندر اور اس کے آس پاس کی دکانیں ، مندر کی نرمان سمیتی کی چھتر چھایا میں تجارت کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔ جب یہ ایمان دار پولس افسر وقت سے پہلے ریٹائرمنٹ لے کر دھرم کرم میں اپنی زندگی وقف کرنا چاہتا ہے تب اس مندر کے اس ایماندار بانی کو اپنے مالی مفادات سے دور رکھنے کے لیے مندر کی نرمان سمیتی کی مجلس عاملہ میٹنگ کر کے یہ طے کرتی ہے کہ پانچ سال تک کوئی نیا ممبر نرمان سمیتی میں نہیں شامل ہو سکتا۔ یہ ہمارے سماج کی ایک جانی پہچانی کہانی ہے۔

افسانہ 'لامحدود سمتوں کا سفر' میں ایک حساس و ذہین انسان کے ذہنی اور نظریاتی سفر کی روداد ہے جو سکون کی تلاش میں گھر سے نکل پڑا ہے اور پھر وہیں پہنچ جاتا ہے جہاں سے چلا تھا۔ ایک بار پھر لامحدود سمتوں کے درمیان خود کو کھڑا پاتا ہے۔

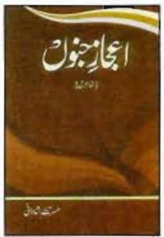

اعجاز جنوں

شاعر: حسرت شادانی

صفحات: 204، قیمت: 150، سنہ اشاعت: 2013

ناشر: مکتبہ صدف، چرچ روڈ، چندوارہ، مظفر پور (بہار) 842001

مبصر: محمد رضوان خان، MMIP، ڈی- 307، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی

غزل اردو ادب کی قدیم ترین اور زبانوں میں سب سے پہلے وجود میں آنے والی صنف ہے۔ شاعری بولنے اور سننے دونوں ہی اعتبار سے آسان اور کانوں میں رس گھولنے والی ہوتی ہے۔ اس لیے شاعری نثر سے پہلے وجود میں آنے والی صنف ہے۔ انسانی میلان شاعری کی طرف زیادہ ہوتا ہے۔ اسی اعتبار سے شاعری ادب کی سب سے اہم اور بہتر صنف قرار دی جاسکتی ہے۔ شاعری وہبی چیز ہے، کسبی نہیں۔ جس کی زندہ مثال حسرت شادانی ہیں۔ انھوں نے سولہ (16) سال کی عمر سے ہی مشقِ سخن شروع کر دیا تھا۔ اس وقت وہ اپنا نام عبدالقادر حسرت بتیاوی لکھتے تھے۔ کیوں کہ ان کا اصل نام عبدالقادر تھا، 'حسرت' اپنا تخلص اختیار کیا تھا اور حافظ عبدالمجید شاداں بدایونی کے شاگرد خاص ہونے کے سبب شادانی نسبت اختیار کی تھی۔ اس نسبت پر انھیں فخر بھی ہے۔ کہتے ہیں:

میرے رہبر، مرے استاد تھے حضرت شاداں
اس لیے آج بھری بزم میں شاداں ہوں میں

حسرت شادانی 27 جنوری 1932 کو شمالی بہار کے خطہ چمپارن میں واقع ریاست بتیا کے محلّہ 'کالی باغ' میں پیدا ہوئے۔ اس ریاست کے آخری راجا ہر یندر کشور سنگھ تھے، جن کی وفات کے بعد انگریزی حکومت نے اس ریاست کو 'کورٹ آف وارڈس' میں منتقل کر دیا تھا۔

یہ وہ قدیم تاریخی ریاست ہے جہاں سے باپو نے انگریزوں کے خلاف 'نیل کی کاشت' یا چمپارن تحریک چھیڑی تھی۔ یہ تاریخ کا ایک اہم حصہ ہے۔ بتیا کی زمین شروع سے ہی ادبا اور شعرا کی سرزمین رہی ہے۔ جنگ آزادی کے دوران اردو زبان و ادب کی بقا و تحفظ کی تحریک سے متاثر ہو کر 'ادارہ حلقہ ادب بہار' کا قیام عمل میں آیا۔ جس کے ذریعے سے ادیبوں اور شاعروں کی ایک بڑی جماعت سامنے آئی، اس کے نائب ناظم حسرت شادانی تھے۔ رفتہ رفتہ 'ادارہ ادب حلقہ بہار' کی تحریک کا زور کم ہوتا گیا تو 'بزم ارمان' کا قیام عمل میں آیا جس کے موجودہ صدر حسرت شادانی ہیں۔

دراصل حسرت شادانی کی شاعری تاریخی حیثیت کی حامل ہے۔ چوں کہ جنگ آزادی کا کرب ناک واقعہ ان کے ہوش و حواس میں پیش آیا تھا۔ اس کے نتیجے میں ملک و ملت اور ادب و تہذیب کی بقا کے لیے درجنوں تحریکیں وجود میں آئیں۔ یہی وجہ ہے کہ تحریکیں اپنا مخصوص تاریخی اور سماجی پس منظر رکھتی ہیں۔ حسرت شادانی دور بیٹھے تہذیبی، سیاسی، سماجی اور ادبی اتھل پتھل کے مشاہد ضرور رہے مگر انھوں نے اپنے آپ کو کسی بھی فکر تحریک سے عملاً وابستہ نہیں کیا۔ جب کہ وہ سیاسی و سماجی ناہمواریوں کے چشم دید گواہ تھے۔ لہٰذا وہ جدید موضوعات ، نیرنگ مضامین اور عصری اسلوب سے آگہی کے نتیجے میں اپنی شاعری کو ہمہ جہت بناتے رہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

کس قدر سفاک تھیں، امریکنوں کی سازشیں — کس قدر مہنگا پڑا غیروں سے یارانہ مجھے
ساتھیو نہ گھبراؤ، دوستو چلے آؤ — اب نظام کہنہ کا دم نکلنے والا ہے
جبر و ظلم کا اک دن ٹوٹے گا بھرم حسرت — ہو رہا ہے دنیا میں جو بھی اس کو ہونے دو

حسرت شادانی کے کلام کے دو مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ پہلا مجموعہ 1985 میں 'دست جنوں' کے نام سے شائع ہو کر مقبول ہو چکا ہے۔ دوسرا مجموعہ 'اعجاز جنوں' جو حمد و نعت ، غزلیات قطعات اور منظومات پر مشتمل ہے، 2013 میں منظر عام پر آیا ہے، یہ

مجموعہ شاعر کی شخصی ذہنی اور فکری اپج کا پتہ دیتا ہے۔ حسرت شادانی کی شاعری قدیم وجدید فکری اسالیب، ندرت بیان اور جولانی فکر کا سنگ میل ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری کلاسیکی رچاؤ کے ساتھ دور جدید کی بھرپور آگہی کا پتہ دیتی ہے۔ انھوں نے روایت کی پاسداری کرتے ہوئے نئے موضوعات اور مضامین کو بھی اپنی شاعری کا حصہ بنایا۔ اس اعتبار سے یہ بزرگ شاعر معتبر بھی ہے اور کہنہ مشق بھی۔ حسرت شادانی چوں کہ غزل کے شاعر ہیں اس وجہ سے ان کی شاعری میں مختلف المعانی موضوعات، ندرت خیال کی بلند آہنگی کا ہمیں جا بجا احساس ہوتا ہے، ان کے فن میں تنوع، وسعت اور ہمہ گیریت کا پہلو ابھرا ہوا ملتا ہے۔ مگر داستان عشق کے موضوع کو بطور خاص اپنی شاعری میں جگہ دی جس نے ان کی شاعری کو کلاسیکی شاعری کے قریب کر دیا ہے۔ کہیں کہیں بعض اشعار میں جذباتیت در آنے کی وجہ سے شعری حسن دب گیا ہے، مگر انداز ہر حال میں پروقار اور شائستہ ہے۔ تنہائی کا کرب حسرت شادانی کے یہاں بھی نظر آتا ہے۔ وہ شاکی ہیں کہ مشینی کلچر نے ایک گھر میں چراغ جلائے تو دوسرے گھر کو تاریک کر دیا۔ اسی طرح ہمیں ان کی شاعری میں بسا اوقات حزن والم کا اظہار ironical لہجے میں ملتا ہے۔ ان کے یہاں عصری حسیت کے ساتھ دور جدید سے بے اطمینانی بھی نظر آتی ہے، ان کی شاعری کا ایک وصف یہ ہے کہ ہندی الفاظ کا استعمال جہاں بھی ہوا ہے وہاں ہندی اور اردو مل کر ایک خاص قسم کا مزہ دیتے ہیں، جس سے الفاظ کی مٹھاس اور انفرادیت مجروح نہیں ہوتی۔

حسرت شادانی نے قطعات بھی کہے ہیں۔ قطعہ چوں کہ نظم کی ایک قسم ہے، جس میں کسی خیال کو نظم کیا جاتا ہے۔

'اعجاز جنوں' میں چند نظمیں بھی ہیں جو بعض تاریخی واقعات و حالات اور اہم شخصیات پر کہی گئی ہیں۔ یہ نظمیں حسرت شادانی کی ریاضت اور کہنہ مشقی کا پتہ دیتی ہیں۔ انھوں نے اپنی نظموں میں گنگا جمنی تہذیب، وطن سے بے پناہ محبت والفت اور یگانگت کو ابھارنے کی کوشش کی ہے۔

ان کی غزلوں میں ہمیں اعدا کے جور وستم کی داستان اور معشوق کی بے اعتنائی کا قلق شدت سے محسوس ہوتا ہے۔ ہجر اور وصال کے ایام میں شاعر پاسِ ناموسِ عشق کا مصداق نظر آتا ہے۔ ان کی شاعری میں خود اعتمادی کا پہلو غالب ہے، غزلوں میں تازگی، توانا لہجہ، نرالا اور طرز ادا نئے اسالیب کو بروئے کار لایا گیا ہے۔ اس بنا پر یہ مجموعۂ کلام ادبی حلقوں میں پذیرائی کا مستحق ہے۔

عالمی جائزہ

مدیر: اے رحمان

صفحات: 352، قیمت: 100 روپے

ناشر: عالمی میڈیا پرائیویٹ لمیٹڈ، دہلی

مبصر: عبدالحی

سہ ماہی عالمی جائزہ عالمی میڈیا پرائیویٹ لمیٹڈ کے ذریعے جاری کردہ رسالہ ہے جس کا پہلا شمارہ جنوری تا مارچ 2014 پر مشتمل ہے۔ رسالے کے مدیر اے رحمان اور معاون مدیر محمد نظام الدین ہیں۔

اے رحمان نے عالمی اردو ٹرسٹ کے نام سے اردو کے فروغ کے لیے ایک تنظیم قائم کی تھی جو گزشتہ 10 برسوں سے فعال ہے اور اردو کی ترویج واشاعت کی سمت میں کئی اہم کام انجام دیتی رہی ہے۔ اے رحمان وہی شخص ہیں جنھوں نے منٹو صدی کے موقعے پر منٹو کی صاحب زادیوں کو ہندوستان بلایا اور یہاں ان کا زوردار استقبال کیا گیا۔ اے رحمان اپنی ہر دلعزیز شخصیت اور فروغ اردو کی مختلف کوششوں کی وجہ سے مقبول ہیں۔ کچھ دنوں قبل انھوں نے عالمی میڈیا پرائیویٹ لمیٹڈ کے نام سے اپنا پبلشنگ ہاؤس شروع کیا ہے جس کا مقصد ہے کہ اردو کے قارئین تک کم قیمت میں اعلیٰ درجے کی کتابیں پہنچائی جائیں اور اردو کے عام قاری کو پھر سے کتابوں کے قریب لایا جائے۔ انھوں نے اس کے لیے جیبی سائز کی کتابیں شائع کی ہیں جو بے حد کم قیمت پر دستیاب ہیں۔ حال ہی میں پرگتی میدان کے کتاب میلے میں ان کے ذریعے شائع شدہ کتابوں کو ڈسپلے کیا گیا جسے اردو حلقے نے بے حد پسند کیا ہے۔ ایک بے حد خوش آئند بات یہ بھی ہے کہ انھوں نے قلمکار کو رائلٹی دینے کا بھی فیصلہ کیا ہے۔ یقیناً ان کی کوششیں لائق صد ستائش ہیں جو اردو کے روشن مستقبل کی ضامن ہیں۔ کتاب میلے میں جیبی کتابوں کے ساتھ ہی 'عالمی جائزہ' کے پہلے شمارے کا اجرا ہوا ہے۔ شمارے کا اداریہ 'سچ تو یہ ہے... کہ عنوان سے شائع ہوا ہے جس میں انھوں نے رسالے کے مقاصد کو بیان کرتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ زبان وادب کو زندہ رکھنے کی یہ ایک مختلف راستے سے کی گئی کوشش ہے۔

شمارہ مضامین، افسانے، نظمیں/غزلیں اور خصوصی گوشے پر مشتمل ہے۔ معروف ناول وافسانہ نگار مشرف عالم ذوقی پر خصوصی گوشہ شمارے کی اہم پیش کش ہے۔ اِس گوشے میں مشرف عالم ذوقی کی آپ بیتی میرا تخلیقی سفر کے عنوان سے شائع ہوئی ہے۔ نثار احمد صدیقی کے ذریعے لیا گیا انٹرویو بھی اہمیت کا حامل ہے۔ شعبۂ مضامین کے تحت ان کے ناولوں، افسانوں اور ان کی تنقید کے حوالے سے کئی اہم مضامین شامل کیے گئے ہیں۔ مشرف عالم ذوقی کی آپ بیتی ''رات اتر رہی ہے'' پہلی دفعہ شائع ہوئی ہے جو شمارے میں خاصے کی چیز ہے۔ گوشے میں شامل کچھ تحریریں شائع شدہ ہیں لیکن ظاہر ہے کہ یہ خصوصی گوشہ ہے اس لیے اس میں مطبوعہ تحریریں بھی ان کی اہمیت وافادیت کے مدنظر شامل کی گئی ہیں۔

شمارے کا آغاز گوپی چند نارنگ کے مضمون 'خاموشی بطور زبان اور شعریات' سے ہوا ہے۔ اِس مضمون کے بعد عتیق اللہ، مبین مرزا، خواجہ اکرام الدین، خالد علوی کے مضامین ہیں، اسی (مضامین) حصے میں معید رشیدی کا پروین شیر سے مخاطبہ بھی شامل ہے۔ ان میں زیادہ تر مضامین پہلے سے شائع شدہ ہیں۔ نارنگ صاحب اور پروفیسر عتیق اللہ کے مضامین ان کی کتابوں میں شامل ہیں۔ خالد علوی کا مضمون سہ ماہی 'فکر وتحقیق' کے نئی غزل نمبر میں شامل ہے۔ ویسے اِس شمارے میں جتنے بھی مضامین شامل ہیں وہ اپنے موضوع کے اعتبار سے بے حد اہمیت کے حامل ہیں۔

افسانوں کے حصے میں رتن سنگھ، سلام بن رزاق، طاہرہ اقبال وغیرہ کے افسانے شامل ہیں۔ افسانوں کے انتخاب میں معیار پر خصوصی توجہ دی گئی ہے۔ نظموں اور غزلوں کا حصہ بھی کافی بہتر ہے۔ شجاع خاور اور اخلاق آہن کی نظمیں یہاں قابل ذکر ہیں۔

ادبی صحافت کی دنیا میں اے رحمان کا یہ پہلا قدم ہے اس لیے رسالہ کچھ کمیوں کا متحمل ہوسکتا ہے۔ مضامین میں حوالے دے دیے جاتے تو بہتر ہوتا۔ کہیں کہیں پروف ریڈنگ اور ایڈیٹنگ کی غلطیاں ہیں۔ مثلاً عالمی میڈیا عالم میڈیا ہوگیا ہے۔ ثمینہ راجہ کی تحریر آفاق عالم صدیقی کے نام سے شائع ہوگئی ہے۔ امید ہے کہ اے رحمان آئندہ شماروں میں ان باتوں کا خیال رکھیں گے۔ عالمی جائزہ کا یہ پہلا شمارہ ہے اِس لیے ان کی پہلی کاوش لائقِ تحسین ہے۔ عالمی اردو میڈیا نے اردو زبان وادب کے ساتھ ساتھ صحافت کے میدان میں قدم رکھا ہے جس کا گرم جوشی سے استقبال ہونا چاہیے اور ان کی کوششوں کو بنظر تحسین دیکھا جانا چاہیے۔

تقریباً ساڑھے تین سو صفحات پر مشتمل رسالے کی قیمت سو روپئے ہے جو موجودہ دور میں مناسب ہے۔

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان

وزارت برائے فروغ انسانی وسائل، شعبۂ اعلیٰ تعلیم

فروغ اردو بھون

ایف۔سی، 33/9، جسولا انسٹی ٹیوشنل ایریا، نئی دہلی -110025

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان کی XXI ویں میٹنگ کی روداد

تاریخ : 8 جنوری 2014

وقت : 3.00 بجے شام

مقام : کانفرنس ہال نمبر 2

انڈیا انٹرنیشنل سنٹر، لودی روڈ، نئی دہلی

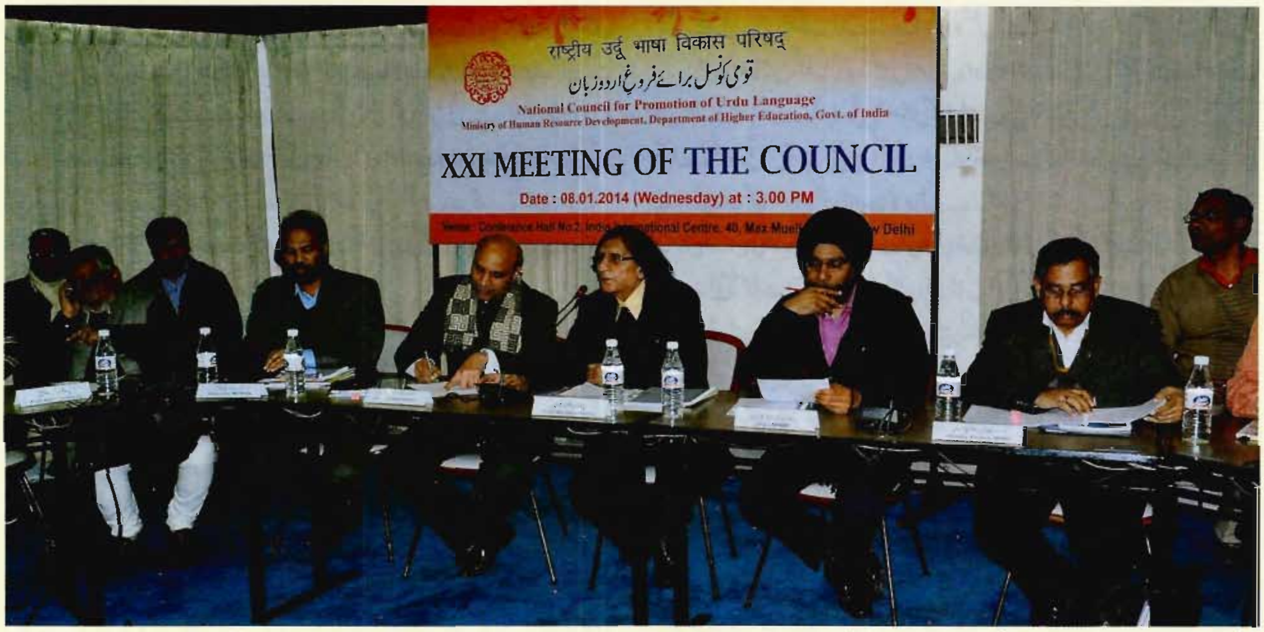

میٹنگ میں دائیں سے پون مہتہ، نوین سوئی، جگ موہن راجو، وسیم بریلوی، ایم ایم پلم راجو ، خواجہ محمد اکرام الدین، اخترالوسع، پیچھے ڈاکٹر مظہر حسنین و ڈاکٹر کلیم اللہ

حاضرین:

1. ڈاکٹر ایم ایم پلم راجو (چیئرمین، این سی پی یو ایل)	:	صدر
2. پروفیسر وسیم بریلوی (وائس چیئرمین، این سی پی یو ایل)	:	وائس چیئرمین
3. پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین (ڈائرکٹر، این سی پی یو ایل)	:	ممبر سکریٹری
4. جناب پی اے انعامدار	:	ممبر
5. ڈاکٹر محمد عبدالحکیم ازہری	:	ممبر
6. پروفیسر محمد حلیم خان	:	ممبر
7. جناب فیروز بخت احمد	:	ممبر
8. پروفیسر اخترالواسع	:	ممبر
9. جناب قاری محمد میاں مظہری	:	ممبر
10. پروفیسر فضیل احمد قادری	:	ممبر
11. پروفیسر عزیز احمد صدیقی	:	ممبر
12. جناب عثمان غنی رضوی	:	ممبر

13. جناب حافظ مطلوب کریم : ممبر
14. جناب فرید احمد : مبر
15. جناب محمد فاروق انجینئر : ممبر
16. جناب سید پرویز : ممبر
17. ڈاکٹر ایس این پٹھان : ممبر
18. جناب شیخ علیم الدین اسعدی : ممبر
19. جناب محمد عبیداللہ شریف : ممبر
20. جناب غلام نبی خیال : ممبر
21. پروفیسر کیشری لال ورما (چیئرمین، سی ایس ٹی ٹی اور ڈائرکٹر، سی ایچ ڈی) :
22. پروفیسر اَودھیش کمار مشرا (ڈائرکٹر، سی آئی آئی ایل)
23. پروفیسر موہن جی (ڈائرکٹر، کے ایچ ایس :
24. پروفیسر محمد فاروق انصاری (این سی ای آرٹی) : نمائندہ
25. ڈاکٹر محمد شمس اقبال (این بی ٹی) : نمائندہ
26. ڈاکٹر پی کے حسین مداور : خصوصی مدعو (اسپیشل انوائٹی)
27. پروفیسر علی کٹی مصلیار : خصوصی مدعو
28. ڈاکٹر ظہیر آئی قاضی : خصوصی مدعو
29. جناب خالد انور : خصوصی مدعو
30. ڈاکٹر محمد خالد شیخ : خصوصی مدعو

میٹنگ کے مناظر

وزارت کے نمائندے

1. جناب جگموہن راجو (جوائنٹ سکریٹری [لسانیات]) : ممبر
2. جناب نوین سوئی
3. جناب پون مہتہ (انڈر سکریٹری [لسانیات])

1. سب سے پہلے، این سی پی یو ایل کے وائس چیئرمین نے عزت مآب ایچ آر ایم اور نئے جے ایس، جناب جگموہن راجو کا، ان کی پہلی میٹنگ میں شرکت کے لیے شکریہ ادا کیا اور ان کا خیر مقدم کیا۔ جناب جگموہن راجو نے حال ہی میں جوائنٹ سکریٹری (لسانیات) کا عہدہ سنبھالا ہے۔ وائس چیئرمین نے، میٹنگ کے دوران تمام ممبران اور شرکاء تہہ دل سے استقبال کیا اور کونسل کے بجٹ کو 100 کروڑ روپے تک بڑھانے کے لیے ایک بار پھر چیئرمین کا شکریہ ادا کیا۔ انھوں نے کہا کہ بجٹ میں ہونے والے اس اضافہ نے اپنے کام کو انجام دینے کے لیے کونسل کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ یہ بات بھی کہی گئی کہ کونسل نے اردو زبان کے فروغ کے ذریعے، ہندوستانیت کے بنیادی جذبات کو پورا کرنے کی سمت میں اچھا کام کیا ہے۔ اس کے بعد، انھوں نے کونسل کے ذریعے چلائی جارہی متعدد اسکیموں کا ایک مختصر جائزہ پیش کیا، مثال کے طور پر کتابوں کی تھوک میں خریداری، گرانٹ اِن ایڈ کے ذریعے مالی تعاون، اردو مطالعاتی مراکز (اسٹڈی سنٹرس)، سی اے بی اے-ایم ڈی ٹی پی سنٹرس۔ یہ اطلاع بھی دی گئی کہ این سی پی یو ایل وزارتِ اقلیتی امور اور وزارتِ مواصلات واطلاعاتی ٹکنالوجی کے اشتراک سے بھی اسکیموں کو نافذ کررہی ہے۔ اس بات پر بھی زور دیا گیا کہ خطاطی اور گرافک ڈیزائن کی نمائش، جس کا انعقاد این سی پی ایل کے ذریعے جامعہ ملیہ اسلامیہ میں کیا گیا تھا، ایسی نمائش بیرونی ممالک میں جدہ اور ریاض جیسے مقامات پر بھی کی جانی چاہیے، تاکہ ہندوستان کے ساتھ ان ملکوں کے تعلقات کو مضبوط کیا جاسکے، جس کا مشاہدہ حال ہی میں جواہر لعل نہرو یونیورسٹی میں منعقدہ بین الاقوامی کانفرنس کے دوران کیا گیا تھا۔

2. کونسل کے ممبر، پروفیسر اختر الواسع نے بھی کونسل کے ممبران کی طرف سے، پہلی بار جنرل باڈی کی اس سالانہ میٹنگ کی صدارت کرنے کے لیے عزت مآب ایچ آر ایم کا شکریہ ادا کیا اور ان کا خیر مقدم کیا۔ پوری طرح سے تعاون کرنے کے لیے انھوں نے ایچ آر ایم کا شکریہ ادا کیا۔ اس کے بعد، جوائنٹ سکریٹری جناب جگموہن راجو کا، اس عہدہ کو سنبھالنے پر، استقبال کیا گیا۔ جوائنٹ سکریٹری کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے، اس بات کا ذکر کیا گیا کہ انھوں نے اسٹیٹ رِسورس سنٹرس کو متحرک کرنے، تعلیم بالغاں اسکیم کو نافذ کرنے اور اسٹیٹ رِسورس سنٹرس کی نیشنل کانفرنس منعقد کرنے کے سلسلے میں عظیم کارنامے انجام دیے ہیں۔ یہ بھی کہا گیا کہ چونکہ جوائنٹ سکریٹری کے پاس کونسل کا ایڈیشنل چارج بھی ہے، للہٰذا اس سے دوطرح کے فائدے ہوں گے، یعنی تعلیم بالغاں اور لسانیاتی شعبہ دونوں میں ہی ان کا تعاون حاصل ہوگا۔ یہ بھی امید ظاہر کی گئی کہ اس سے کونسل کو اچھے نتائج حاصل ہوں گے۔ یہ درخواست کی گئی کہ سابق ایچ آر ڈی وزیر، جناب کپل سبل اور اس وقت کے

جوائنٹ سکریٹری (ایل)، ایم ایچ آر ڈی، جناب اننت کمار سنگھ کی شاندار خدمات کو بھی ریکارڈ میں لایا جائے۔

3. بعد ازاں، این سی پی یو ایل کے ڈائرکٹر نے ممبران/شرکا سے درخواست کی کہ وہ ایچ آر ایم کے سامنے اپنا تعارف پیش کریں۔ عزت مآب ایچ آر ایم نے موجودہ ڈائرکٹر، پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین کی سرپرستی اور این سی پی یو ایل کی سرگرمیوں کو جاری رکھنے میں ان کی فعالیت اور ان کی طرف سے لی جانے والی دلچسپی کی تعریف کی۔ عزت مآب ایچ آر ایم نے موجودہ جوائنٹ سکریٹری کے پچھلے ریکارڈوں کا ذکر کیا اور ان کی کڑی محنت اور جوش و ولولہ کی تعریف کی۔ انھوں نے بتایا کہ جوائنٹ سکریٹری، جناب راجو کو، تعلیم بالغاں کے شعبہ میں شاندار خدمات انجام دینے کے لیے یونیسکو کی طرف سے انھیں انٹرنیشنل ایوارڈ مل چکا ہے۔ ان کا یہ پختہ یقین تھا کہ جوائنٹ سکریٹری مرکزی یونیورسٹیوں اور لسانیات کے اپنے موجودہ کام کے ساتھ بھی انصاف برتیں گے۔ عزت مآب ایچ آر ایم نے یہ امید بھی ظاہر کی کہ تمام بڑی زبانوں بشمول اردو، کو مضبوط بنانے کی ضرورت ہے۔

اس کے بعد، ایجنڈا آئٹمس پر غور کیا گیا:

آئٹم نمبر XXI.1 روداد کی توثیق

کونسل کی 20.03.2013 کو ہونے والی 20ویں میٹنگ کی روداد کی تصدیق کی گئی۔

آئٹم نمبر XXI.2 عمل آوری رپورٹ

کونسل کی 20ویں میٹنگ کی روداد پر عمل آوری رپورٹ پیش کی گئی۔

آئٹم نمبر XXI.3 سالانہ رپورٹ

کونسل نے ایگزیکٹو بورڈ کے ذریعے اختیار کردہ، سال 13-2012 کے لیے سالانہ رپورٹ، جسے پارلیمنٹ کے سامنے پیش کیا گیا تھا، کی حمایت کی۔

آئٹم نمبر XXI.4 سالانہ کھاتے

کونسل نے ایگزیکٹو بورڈ کے ذریعے سال 13-2012 کے لیے اختیار کردہ، کونسل کے سالانہ کھاتوں کی پذیرائی کی۔

آئٹم نمبر XXI.5 کونسل کے کاموں کا جائزہ

(اپریل 2013 تا نومبر 2013)

کونسل کے ذریعے اپریل، 2013 سے نومبر، 2013 تک کی مدت کے دوران کیے گئے کاموں کا جائزہ کونسل کے سامنے پیش کیا گیا اور بتایا گیا کہ ایجنڈا پیپرس کے ساتھ، اس مدت کے دوران کونسل کے ذریعے کیے گئے کاموں کا جائزہ ممبران کے درمیان پہلے ہی تقسیم کیا جا چکا ہے۔

ڈائرکٹر، این سی پی یو ایل نے گزشتہ پانچ سالوں کے دوران کونسل کی تمام تر سرگرمیوں کی تفصیل پیش کی۔ اس کے بعد، کونسل میں موجود ممبران نے جو مشورے دیے، وہ درج ذیل ہیں:-

1. پروفیسر اختر الواسع نے مندرجہ ذیل مشوروں پر عمل کرنے کی سفارش کی: کونسل کے بجٹ کو بڑھا کر 100.00 کروڑ روپے کیا جائے؛ این سی پی یو ایل کے ڈائرکٹر کو مستقل تقرر کیا جائے اور اضافی چارج کو ختم کیا جائے ٹھیکہ پر رکھے گئے (کانٹریکچول) ملازمین کا ریگولرائزیشن ہو۔
2. جناب شیخ علیم الدین اسدی کی بھی یہ خواہش تھی کہ این سی پی یو ایل کی اسکیموں کو کامیابی کے ساتھ نافذ کرنے کے لیے، این سی پی یو ایل کے کانٹریکچول ملازمین کا ریگولرائزیشن ہونا چاہیے۔ انھوں نے مولانا آزاد پر کانفرنس منعقد کرنے کا بھی مشورہ دیا۔ اسی سے متعلق پروفیسر اختر الواسع نے مشورہ دیا کہ سیمینار کے دوران اردو کی عظیم شخصیات کو مولانا آزاد کے نام پر بین الاقوامی ایوارڈ دینا چاہیے۔
3. جناب فیروز بخت احمد نے عزت مآب ایچ آر ایم سے عاجزانہ درخواست کی کہ پرانی دہلی کے عیدگاہ میں قومی سینئر سکینڈری اسکول کی تعمیر کرائی جائے، جسے 1973 میں مسمار کر دیا گیا تھا۔ اس اسکول میں تعلیم حاصل کر رہے طلبہ کا تعلق نہایت غریب گھرانوں سے ہے۔ انھوں نے کہا کہ اگر اس اسکول کی تعمیر نہیں کرائی گئی، تو اس سے ملک کو نقصان ہوگا۔
4. جوائنٹ سکریٹری نے اس نکتہ کو اجاگر کیا کہ این سی پی یو ایل کو اردو زبان کے فروغ کی ذمہ داری سونپی گئی ہے اور اس کا مقصد بھی یہی ہے، لیکن وہ عربی اور فارسی زبان کے فروغ کی اضافی ذمہ داریاں بھی سنبھال رہا ہے۔ انھوں نے مشورہ دیا کہ کونسل کے موجودہ ایم او اے میں عربی اور فارسی زبان کے فروغ کو بھی شامل کیا جانا چاہیے، جس سے این سی پی یو ایل مستقبل میں آڈٹ سے متعلق دشواریوں سے بچ سکتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اسے کونسل اور وزارت کے معزز ممبران کی رضامندی سے کونسل کے ایم او اے میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ موجودہ کونسل میں خواتین کی نمائندگی نہیں ہو رہی ہے، جس پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ ان کے اس تبصرہ پر دوسرے ممبران نے اس بات کو اٹھایا کہ ممبران کی نامزدگی کا کام وزارت کرتی ہے، اس لیے وزارت سے درخواست کی جانی چاہیے کہ وہ مستقبل میں خواتین کی نمائندگی پر غور کریں۔
5. جناب فرید احمد نے کہا کہ کونسل کے ذریعے چلائے جانے والے کورس کو وزارت کی سند حاصل ہونی چاہیے۔ ان کے اس تبصرہ پر ڈائرکٹر نے کہا کہ

این آئی او ایس اور سی بی ایس ای سے صلاح ومشورہ کرنے کے بعد، اس معاملے پر وزارت سے بات چیت کی جارہی ہے۔

6. جناب محمد قاری مظہری نے کہا کہ متعدد میٹنگوں اور پینل کی منظوری کے بعد، کونسل کی اسکیموں کو جاری کیا گیا ہے۔ انھوں نے اپنے اس خیال کا بھی اظہار کیا کہ کونسل کو عربی اور فارسی زبان کے فروغ کے فرائض بھی انجام دینے چاہئیں۔ لہٰذا، اردو زبان کے ساتھ ساتھ عربی اور فارسی زبان کو شامل کرنا کونسل کا بنیادی مقاصد میں ہونا چاہیے۔

7. جناب پی اے انعامدار نے کہا کہ عربی اور فارسی کی اسکیم کو کمیٹی نے پہلے ہی منظور کرلیا ہے، اس لیے اسے کونسل کے موجودہ ایم او اے میں شامل کردینا چاہیے۔ پروفیسر اختر الواسع نے اس مشورہ سے اتفاق کیا۔

8. جناب خالد انور نے گورننگ کونسل میں اپنے نام کو شامل کیے جانے سمیت چند دیگر ناموں کو بھی خصوصی مدعووین کے طور پر شامل کرنے کے لیے عزت مآب ایچ آر ایم کا شکریہ ادا کیا۔ انھوں نے مزید کہا کہ موجودہ سرگرمیوں کے علاوہ بعض نئی سرگرمیوں کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ انھوں نے ڈائرکٹر اور وائس چیئرمین کا بھی شکریہ ادا کیا۔ انھوں نے مشورہ دیا کہ ایجنسی کی صورت میں، اخبارات کو بھی یہ اختیار دیا جانا چاہیے کہ وہ جس کے ساتھ چاہیں، خود کو جوڑ لیں۔

9. ڈاکٹر ایس این پٹھان نے اچھا کام کرنے کے لیے این سی پی یو ایل کی تعریف کی۔ انھوں نے یاد دلایا کہ سابق معزز ایچ آر ایم نے، پیشہ ورانہ کورس سمیت مزید کورس شروع کرنے کے لیے پانچ کمیٹیوں کی تشکیل کی تھی اور کونسل کے مینڈٹ میں ترمیم کرکے اسے اس بات کا بھی اختیار دینا چاہیے کہ وہ اردو زبان میں پری ڈگری سطح کے کورس تک کے لیے داخلہ، امتحان اور کونسل کے ساتھ رجسٹرڈ طلبہ کو منظور شدہ ڈگری دے سکے۔ اس سلسلے میں، کونسل کے ڈائرکٹر نے کہا کہ اس معاملے میں ایم ایچ آر ڈی کے ساتھ بات چل رہی ہے۔

10. جناب فاروق انجینئر نے گزشتہ دو سالوں کے دوران این سی پی یو ایل کے ذریعے کیے گئے کاموں کی تعریف کی۔ انھوں نے مشورہ دیا کہ این سی پی یو ایل کے بجٹ میں اضافہ ہونا چاہیے، تاکہ وہ جز وقتی اردو ٹیچر کے اعزازیہ کو بڑھا پانے کی حالت میں ہو، جو کہ اس وقت بہت ہی کم ہے۔

11. ڈاکٹر شمس اقبال نے این سی پی یو ایل کے ذریعے کیے گئے کاموں کی تعریف کی۔ انھوں نے اپنے ان خیالات کا اظہار این سی پی یو ایل کے ذریعے منعقدہ کتاب میلہ میں اپنے دورہ کے دوران کیا اور کہا کہ بچوں سے متعلق اشاعت مواد کے حساب سے تو بہت اچھی ہے، لیکن موجودہ تناظر میں وہ پوری طرح معیار کے مطابق نہیں ہے۔ انھوں نے ایک اور مشورہ دیا کہ پری پرائمری اور پرائمری سطح کی مزید کتابیں شائع ہونی چاہئیں۔ این سی پی یو ایل کو 10 سال سے کم عمر کے بچوں کے لیے کتابیں شائع کرنی چاہئیں۔ انھوں نے کہا کہ کونسل کے ذریعے شائع کردہ ادبِ اطفال بہت عمدہ ہے، لیکن ان کتابوں کے تئیں بچوں میں دلچسپی پیدا کرنے کے لیے ان میں تصویریں شامل کرنی چاہئیں اور ان تصویروں کو مختلف رنگوں میں شائع کرنا چاہیے۔

12. وائس چیئرمین، این سی پی یو ایل نے بتایا کہ ڈی ایس (ایل)، ایم ایچ آر ڈی سے وزارت کے خط، ایف نمبر 1-16/2013-L-III مورخہ 06.01.2014 کے تحت ڈائرکٹر، این سی پی یو ایل کی پوسٹ کے گریڈ پے کو 8700 روپے سے بڑھا کر 10,000 روپے کرنے کا ایجنڈا، اسے اضافی ایجنڈا کے طور پر شامل کرنے کے لیے موصول ہوا۔ اسے ممبران کے درمیان تقسیم کیا گیا اور وائس چیئرمین کے ذریعے اسے پڑھ کر سنایا گیا، تاکہ اسے قبول کیا جاسکے۔ کونسل نے اسے قبول کرلیا۔

13. جے ایس (ایل) نے کہا کہ تقرری کے ضابطوں میں ترمیم ہونی چاہیے۔ اس تجویز کو حکومت کے سامنے پیش کیا جانا ہے۔ انھوں نے واضح طور پر کہا کہ اب تک این سی پی یو ایل کے ڈائرکٹر کو ٹرانسفر کے ذریعے ڈیپوٹیشن کی بنیاد پر مقرر کیا جاتا رہا ہے اور تقرری کے تمام ضابطوں (آر آر) میں لون کی بنیاد پر ڈائرکٹر کی تقرری کا کوئی ضابطہ موجود نہیں ہے، اسے ڈائرکٹر کے آر آر میں جوڑا جاسکتا ہے۔ آر آر میں ترمیم کی اس تجویز کو کونسل نے منظور کرلیا۔

14. جناب پی اے انعامدار نے کہا کہ این سی پی یو ایل کو اپنے سی اے بی اے-ایم ڈی ٹی پی سنٹرس کے ذریعے اردو میں کمپیوٹر کی تعلیم کو فروغ دینا چاہیے، جس سے روزگار کے مواقع میں اضافہ ہوگا۔ اس حصولیابی کے لیے انھوں نے ڈائرکٹر کی تعریف کی۔

15. جناب غلام نبی خیال، جو کونسل میں کشمیر خطہ کی نمائندگی کرتے ہیں، نے 'بچوں کی دنیا' میں پرکشش اور معلوماتی مواد مہیا کرانے، سرینگر میں پیپر ماشی کے پیشہ ورانہ کورس اور سیاحت کے ایک اور کورس کو شروع کرنے کے لیے ڈائرکٹر کو مبارکباد دی۔

16. جناب فیروز بخت احمد نے کہا کہ 'بچوں کی دنیا' کے سرکولیشن کو بڑھانے کے لیے اسے دکانداروں، کتاب فروشوں اور اخبارات وغیرہ کو بھیجا جانا چاہیے۔

17. جناب عبدالحکیم ازہری نے کہا کہ عربی زبان کا فروغ نہایت بہت فائدہ مند ہے، کیوں کہ اس سے خلیجی ممالک میں نوکری کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ انھوں نے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اس قسم کے مراکز خلیجی ممالک میں بھی کھولے جانے چاہئیں۔ این سی پی یو ایل کو اردو زبان کے فروغ کے لیے قومی اور بین الاقوامی کتاب میلے منعقد کرنے چاہئیں اور ساتھ ہی بیرونی ممالک میں عربی اور اردو کے اسٹڈی سنٹرس کھولنے چاہئیں۔ نئے بورڈ کی تشکیل سے قبل، این سی پی یو ایل خاص طور سے جنوبی ہند سے عربی اور فارسی کی تصانیف پر غور کرسکتا ہے۔

18. جے ایس (ایل)- این سی پی یو ایل این بی ٹی کے ذریعے منعقد کیے جانے والے قومی اور بین الاقوامی کتاب میلوں میں شرکت کرسکتا ہے۔ این بی ٹی کے نمائندہ نے کہا کہ چونکہ این بی ٹی کے اہل کار کم تعداد میں شرکت کرتے ہیں، لہٰذا این سی پی یو ایل ان میلوں میں اپنی چنندہ کتابوں کی نمائش اور ان کے حقوق کا تبادلہ کرسکتا ہے۔ پروفیسر واسع نے کہا کہ این سی پی یو ایل اور این بی ٹی کے درمیان ایک پل ہونا چاہیے۔ این سی پی یو ایل کو قومی اور بین الاقوامی کتاب میلوں میں این بی ٹی کی طرف سے وفد کے ایک حصہ کے طور پر نمائندگی کرنی چاہیے۔ این سی پی یو ایل وفد کی آمد و رفت اور ان کے دیگر

اخراجات کو برداشت کرسکتا ہے۔انھوں نے مزید کہا کہ ہر سال بین الاقوامی کانفرنس کا انعقاد ہونا چاہیے۔اس قسم کی مجوزہ بین الاقوامی کانفرنس کا تھیم 'صحافت' ہوسکتا ہے۔

19. ڈاکٹر ظہیر آئی قاضی-1. این سی پی یو ایل کے بجٹ کو بڑھا کر 100 کروڑ روپے کیا جانا چاہیے۔مراکز کی تعداد بڑھا کر دوگنی کرنی چاہیے۔اردو کو روزگار سے جوڑا جانا چاہیے۔مزید فنڈ، خاص کر مراکز کے قیام کے لیے، مہیا کرایا جانا چاہیے۔2. ڈائرکٹر کو پورے احترام سے پروموشن ملنا چاہیے۔ انھوں نے اپنے تجربہ کی بنیاد پر کہا کہ ڈائرکٹر نے اچھا کام کیا ہے۔

20. جے ایس (ایل) نے اخیر میں، تعمیری مشوروں کے لیے سبھی ممبران کا شکریہ ادا کیا۔انھوں نے کہا کہ اِن امور پر سنجیدگی سے بات ہوسکتی ہے۔اگر ان مشوروں پر غور کیا جاتا ہے اور خصوصی ایجنڈا آئٹمس تیار کیے جاتے ہیں، تو بہت سے اچھے فیصلے کیے جاسکتے ہیں۔فی الحال اِن مشوروں کو شامل کرکے انھیں اگلی میٹنگ کے ایجنڈا میں تبدیل کیا جاسکتا ہے۔نرم ڈپلومیسی کے مدنظر، اردو کے علاوہ فارسی اور عربی بھی نہایت اہم رول ادا کرسکتے ہیں۔عربی اور فارسی مشرقِ وسطیٰ میں نوکری کے مواقع پیدا کرسکتے ہیں اور کونسل اس سلسلے میں نہایت اہم رول ادا کرسکتی ہے۔وزارتِ امورِ خارجہ (ایم ای اے) میں بھی ماہرینِ لسانیات کی کمی ہے، اس لیے عربی اور فارسی جاننے والے افراد کافی حد تک مددگار ثابت ہوسکتے ہیں۔جہاں تک کمپیوٹر سنٹرس کے فروغ کا معاملہ ہے، تو یہ وقت کی نہایت اہم ضرورت ہے۔لیکن کمپیوٹر سنٹرس کو شروع کرنے کے لیے انفراسٹرکچر سے متعلق بنیاد فراہم کرنے پر بھی غور کیا جانا چاہیے۔وزارتِ انفارمیشن ٹکنالوجی کمپیوٹر سنٹرس سے متعلق امور کو دیکھ رہی ہے اور ان سے، این سی پی یو ایل کے اشتراک سے بامعنی سرگرمی شروع کرنے کی درخواست کی جاسکتی ہے۔این سی پی یو ایل، کمپیوٹر سنٹرس کھولنے کے لیے دوسری وزارتوں کے ساتھ مفاہمت نامہ (ایم او یو) پر دستخط کرسکتا ہے۔این بی ٹی کو بھی اس کے تمام تر بہتر وسائل کے ساتھ، اردو زبان کے فروغ میں شامل کیا جاسکتا ہے۔جے ایس (ایل) کے تبصروں کے خاتمہ پر، عزت مآب رکن پروفیسر اختر الواسع نے اس بات کو اجاگر کیا کہ کونسل کے ممبران کے ذریعے دیے گئے مشوروں کو، صدرِ جلسہ کی اجازت سے دیگر کوئی آئٹم عنوان کے تحت ایک ایجنڈا آئٹم تسلیم کیا جانا چاہیے اور اس پر لیے گئے فیصلوں کو منظوری ملنی چاہیے۔

21. پروفیسر واسع نے مشورہ دیا کہ بین الاقوامی کانفرنس، مولانا آزاد سیمینار، این بی ٹی کے ساتھ اشتراک کو، دیگر کوئی آئٹم کی روشنی میں دیکھا جانا چاہیے اور اسے کونسل کا فیصلہ سمجھا جانا چاہیے۔

22. عزت مآب ایچ آر ایم نے اپنے اختتامی تبصروں میں، قیمتی مشورے دینے اور اردو زبان کے مقاصد کو آگے بڑھانے میں دلچسپی لینے کے لیے، سبھی ممبران کا شکریہ ادا کیا۔انھوں نے یہ بھی کہا کہ دیگر وزارتوں کے ساتھ تال میل اور اشتراک سے متعلق جوائنٹ سکریٹری کے مشورے پر غور کیا جائے گا اور ضرورت پڑنے پر مزید قدم اٹھائے جائیں گے۔انھوں نے اس بات کو دوہرایا کہ اگر ارادہ نیک ہو، وژن صاف ہو، تو ہماری طرف سے کسی بھی قسم کے وسائل کی کمی نہیں ہے، لیکن میں اس بات پر زور دینا چاہوں گا کہ جو بھی وسائل فراہم کیے جاتے ہیں، ان کا استعمال مناسب اور شفاف طریقے سے ہونا چاہیے۔این سی پی یو ایل کی، اسے روزگار سے جوڑنے اور روایتی دست کاری کو فروغ دینے کی کوشش قابل تعریف ہے۔جس تال میل کا ذکر جے ایس نے کیا، اسے نافذ کرنے کی ضرورت ہے اور این آئی او ایس، این بی ٹی اور اِگنو کے ساتھ این سی پی یو ایل کے پروگراموں کے اشتراک پر غور وفکر کرنے کی ضرورت ہے، جس سے انھیں ایک دوسرے کے قریب لانے میں مدد مل سکتی ہے۔پیشہ ورانہ ہنر اور روایتی دست کاری اضافی اور نئی ہنرمندی پیدا کر رہی ہے۔انھوں نے کہا کہ، جہاں تک کمپیوٹر کی تعلیم کا معاملہ ہے، تو اسے واقعی میں وسعت دی جاسکتی ہے۔انھوں نے زور دے کر کہا کہ ہمارے سبھی گاؤوں میں براڈ بینڈ ڈجیٹل پہنچانا ایک نہایت حوصلہ افزا پروجیکٹ ہے۔اس سے آئندہ چند سالوں کے دوران جو بھی انفراسٹرکچر آنے والا ہے، وہ اسے پسند کریں یا نہ کریں، اس سے ملک میں ہر جگہ کمپیوٹر پہنچنے کی صلاحیت پیدا ہوگی۔لہٰذا، انھوں نے یقین دلایا کہ یہ اسکیمیں چاہے جس کسی بھی وزارت کے تحت ہوں، اُس انفراسٹرکچر کو اس مد میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔اداروں کو صرف فنڈنگ کے نام پر یا اپنے پھیلاؤ کو بڑھانے کے لیے ہی رقم مہیا نہیں کرانی چاہیے، بلکہ یہ جانچ بھی ہونی چاہیے کہ اُن کا اکیڈمک آؤٹ پُٹ کیا ہے، جو کہ نہایت اہم ہے اور این سی پی یو ایل کو بھی اپنے آؤٹ پُٹ کی جانچ کرنی چاہیے۔انھوں نے مزید کہا کہ جناب جگموہن سنگھ راجو اور ڈاکٹر اکرام الدین کے میل سے اور یہاں پر موجود ہر شخص کی رہنمائی سے، ہم اپنے مقاصد کو حاصل کرنے میں ضرور کامیاب ہوں گے۔

اخیر میں، وائس چیئرمین نے تمام شرکاء کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ کونسل کی اس میٹنگ میں بہت سی نئی چیزوں پر گفت وشنید ہوئی اور کئی حل نکالے گئے۔انھوں نے میٹنگ میں پورے وقت تک موجود رہنے کے لیے عزت مآب ایچ آر ایم کا بھی شکریہ ادا کیا۔انھوں نے سفارشوں کے نفاذ پر زور دیا۔

میٹنگ کا اختتام صدرِ جلسہ کے الفاظِ تشکر کے ساتھ ہوا۔

(پروفیسر وسیم بریلوی)
وائس چیئرمین، این سی پی یو ایل

(ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین)
ڈائرکٹر این سی پی یو ایل

قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں

خبر نامہ

امیر خسروؒ ملک کی مشترکہ تہذیب کے علمبردار ہیں: مرکزی وزیر کپل سبل

قومی اردو کونسل کے زیر اہتمام یوم اردو پر جشن امیر خسرو کا انعقاد

نئی دھلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے آج حضرت امیر ابوالحسن یمین الدین خسرو کے یوم ولادت کو 'یوم اردو' قرار دیتے ہوئے اس موقعے پر جشن اردو منعقد کیا جس میں ہندوستان کی اس عظیم ترین شخصیت کو شاندار خراجِ تحسین پیش کیا گیا۔ اس موقعے پر مرکزی وزیر مواصلات جناب کپل سبل نے بطور مہمان خصوصی شرکت کی اور حضرت امیر خسرو کو ملک کی ملی جلی تہذیب، انسانیت، فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور ملک کے اتحاد کا علمبردار قرار دیا۔ انھوں نے کہا کہ حضرت امیر خسرو نے اپنے علم وعمل دونوں سے ملک اور انسانیت کی خدمت کی ہے۔ اس لیے ان کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ انھوں نے جشن اردو کے حوالے سے قومی اردو کونسل کی اس کوشش کی بھی ستائش کی اور کہا کہ حضرت امیر خسرو کے یوم ولادت کو یوم اردو کے طور پر منانا ایک اہم ترین قدم ہے۔ اس موقعے پر مرکزی وزیر جناب کپل سبل کی اردو زبان کے فروغ اور اسے جدید ٹکنالوجی سے جوڑنے کے سلسلے میں کی گئی کوششوں کو بھی سراہا گیا اور ان کی خدمات کے اعتراف میں برصغیر کے ممتاز اردو ادیب پروفیسر گوپی چند نارنگ کے ہاتھوں مومنٹو پیش کیا گیا۔ سپاس نامہ کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین نے پیش کیا، جس میں کہا گیا ہے:

''عالی جناب کپل سبل صاحب۔ ہمیں اعتراف ہے کہ کونسل کو جو کامیابی اور سرخروئی حاصل ہوئی ہے وہ آپ کی ہمت افزائی اور بھرپور تعاون کی مرہونِ منت ہے۔ یہ سچ ہے کہ اردو کا نام قدرتی طور پر اب آپ کے نام سے وابستہ ہوگیا ہے۔ ہم اردو والے آپ کو اردو کا وکیل سمجھتے ہیں۔ آپ نے اردو والوں کے درخشاں مستقبل کے لیے جو انقلابی اقدام کیے ہیں ان کی خوشگوار یادیں اردو کے ایوان میں ہمیشہ بازگشت کرتی رہیں گی۔ ہماری نیک تمنائیں ہمیشہ آپ کے ساتھ ہیں۔''

تمام شرکا کا استقبال کرتے ہوئے کونسل کے ڈائرکٹر نے مزید کہا کہ حضرت امیر خسرو کا اردو کے شعری ادب کی بنیاد رکھنے، فن موسیقی، لوک سنگیت، تصوف اور خانقاہی زندگی اور کل ملا کر ہماری مشترکہ تہذیب کو سجانے سنوارنے میں سب سے بڑا ہاتھ رہا ہے۔ اسی لیے کونسل نے ان کے یوم ولادت کو 'یوم اردو' کے طور پر ہر سال منانے کا فیصلہ کیا ہے۔

حضرت امیر خسرو کی زندگی، ان کی تعلیمات، زبان وادب اور علم وفن کے تعلق سے کلیدی خطبہ ساہتیہ اکادمی کے سابق صدر اور نامور اردو ادیب پروفیسر گوپی چند نارنگ نے پیش کیا اور ان کی خدمات وتعلیمات کو لازوال قرار دیا۔ انھوں نے کہا کہ ملک کی مشترکہ تہذیب اور ملی جلی اقدار حضرت امیر خسرو سے ہی عبارت ہے اور ان کی ہمہ جہت شخصیت کے اثرات، زبان وادب، مشترکہ اقدار اور مختلف علوم وفنون میں بخوبی جلوہ گر ہیں۔ انھوں نے کہا کہ حضرت امیر خسرو ایک صوفی درویش ہونے کے ساتھ بیک وقت کئی زبانوں کے عالم تھے اور آج پورا ہندوستان ان کے علم وفن سے سیراب ہورہا ہے۔ اس موقعے پر دہلی اردو اکادمی کے سابق وائس چیئرمین پروفیسر اختر الواسع اور فارسی کے معروف اسکالر پروفیسر شریف حسین قاسمی نے بھی اظہارِ خیال کیا۔

اِس موقعے پر کئی اہم اور سرکردہ شخصیات کو اعزازات و مومنٹو بھی پیش کیے گئے۔ اردو زبان وادب کو ٹکنالوجی سے جوڑنے کے سلسلے میں ان کی خدمات کی ستائش کی گئی۔ ان میں وزارت مواصلات کے تحت کام کرنے والے ادارے ٹی ڈی آئی ایل (TDIL) کی ڈائرکٹر سورن لتا، وزارت کے جوائنٹ سکریٹری ڈاکٹر راجندر کمار، چیف ٹکنالوجی آفیسر سید محمد احمد اور سی ڈیک پونے کے ایسوسی ایٹ ڈائریکٹر مہیش ڈی گلکرنی کے نام شامل ہیں۔ کپل سبل نے ان تمام شخصیات کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انھیں اعزازات اور مومنٹو پیش کیے۔ اعزاز یافتگان نے حضرت امیر خسرو سے منسوب اِس مومنٹو کو اپنے لیے یادگار اور ناقابلِ فراموش قرار دیا۔

جشن اردو کا اختتام صوفیانہ کلام کی محفل سے ہوا۔ ملک کے نامور صوفی فنکار نظامی برادران نے اپنے صوفیانہ کلام سے جشن اردو پر چار چاند لگائے اور حضرت امیر خسرو کا کلام پیش کر کے انھیں منظوم خراجِ عقیدت پیش کی۔ بڑی تعداد میں شرکا وسامعین اِس روحانی محفل سے محظوظ ہوئے۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 3 مارچ 2014

جشن امیر خسرو پر مومنٹو حاصل کرتے ہوئے عالی جناب کپل سبل، تصویر میں گوپی چند نارنگ، اختر الواسع اور قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر خواجہ اکرام الدین

جشن امیر خسرو کا ایک منظر

فارسی کے دس نئے سینٹرز

نئی دہلی: ایران کے معروف و مشہور دانشور، سیاسی شخصیت بنیاد سعدی کے ڈائریکٹر حداد عادل، ڈاکٹر علی فولادی ایران کلچرل ہاؤس اور

قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر خواجہ اکرام الدین اور بنیادی سعدی کے وفد کی ملاقات کا ایک منظر

قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر، پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین سے ایک ملاقات ہوئی جس میں ایران میں اردو ادب کے فروغ اور ہندوستان میں فارسی ادب کے فروع کے سلسلے میں سنجیدہ گفتگو ہوئی۔ حداد عادل صاحب نے اس سلسلے میں ڈائرکٹر کو یقین دلایا کہ وہ ایران میں اردو کے فروغ کے لیے ہر ممکن کوشش کریں گے۔ کونسل کے ڈائرکٹر نے کہا کہ اس وقت ملک کے طول و عرض میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی جانب سے دس فارسی سینٹرز کھولے جارہے ہیں جس سے ہند و ایران کے درمیان مشترکہ وراثت کی اہم کڑی فارسی زبان کا فروغ ہو سکے۔ انھوں نے کہا کہ اس سے دونوں ملکوں کے درمیان ثقافتی و تہذیبی رشتے اور مستحکم ہوں گے۔

(قومی اردو کونسل برائے فروغ اردو زبان)

کشن گنج میں تعلیمی اجلاس

کشن گنج: پوٹھیابلاک کے پناسی قصبے میں عرس نصیریؒ کے موقعے پر منعقد تعلیمی اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر اور جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر خواجہ اکرام الدین نے کہا کہ دنیا تیزی کے ساتھ ترقی کر رہی ہے۔ ایسے میں مسلمان اگر بیدار نہیں ہوئے اور خود کو تیار نہیں کیا تو وہ دین و دنیا دونوں کی راہ میں پیچھے رہ جائیں گے۔ انھوں نے کہا کہ تعلیم کو دین اور دنیا کے زمرے میں تقسیم کرنا کسی بھی طور پر درست نہیں۔ تعلیم تو تعلیم ہے۔ اسے زندگی سنوارنے کے لیے حاصل کی جانی چاہیے۔ انھوں نے سیمانچل خصوصاً مسلمانوں کی پسماندگی کے پس منظر میں کہا کہ دینی تعلیم کے ساتھ مسلمانوں کو اپنے وجود کی بقا کے لیے عصری اور جدید تعلیم خصوصیت کے ساتھ روزگار سے جوڑنے والی تعلیم کی ضرورت ہے۔ نئی نسل کو ہنرمند اور تعلیم یافتہ بنا کر ہی علاقے کی پسماندگی

دور کی جاسکتی ہے۔ خواجہ اکرام نے اس موقعے پر مدرسہ نصیریہ اشرفیہ میں DEEP کا نیا سینٹر شروع کیا جہاں نئی نسل کو روزگار پر مبنی ہارڈ ویئر، سافٹ ویئر، سولر لائٹ اور دیگر تکنیک کی تربیت دی جائے گی اور سرٹیفکیٹ سے نوازا جائے گا۔ پروگرام کو کامیاب بنانے کے لیے سرگرم مسٹر فیروز عالم ایجوکیشن افسر این سی پی یو ایل نے بتایا کہ نئی نسل کے لڑکے اور لڑکیوں کو روزگار سے جوڑنے کے لیے این سی پی یو ایل نے پیش رفت کی ہے اور اس سلسلے میں سیمانچل کے کئی ضلعوں میں سینٹر کھولے گئے ہیں تاکہ بچے تعلیم کے ساتھ ہنرمند بھی بن سکیں اور پسماندگی کا خاتمہ ہو۔ اس موقعے پر ڈاکٹر جلیس اختر انصاری نے تعلیمی مشن کو آگے بڑھانے اور اجلاس کو کامیاب بنانے میں اہم رول ادا کیا۔ پروگرام میں علاقے کی سرکردہ شخصیات موجود تھیں۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 27 فروری 2014

بچوں کی اردو زبان سے محبت لائق تحسین: خواجہ اکرام

دربھنگہ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے ڈائرکٹر خواجہ اکرام الدین نے ضلع کے بینی پور بلاک

بینی پور بلاک کے گاؤں فروبا کے ایک مدرسہ میں کمپیوٹر کے طلبہ کو خطاب کرتے ہوئے قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر خواجہ اکرام الدین

کے فروبا گاؤں واقع قومی اردو کونسل سینٹر کا دورہ کر کے دیہات میں کمپیوٹر کے تئیں بچوں کی دلچسپی پر مسرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ میں بچوں کے اس حوصلے کو سلام کرتا ہوں۔ دور دراز دیہی علاقے میں رہ کر کمپیوٹر سیکھنے کی دلچسپی کے ساتھ ساتھ ان کے اندر اردو زبان سے محبت کا جذبہ لائق تحسین ہے۔ جس کا سہرا مرکز کے انچارج کے علاوہ فیکلٹی کے ممبران کو جاتا ہے۔ ڈاکٹر خواجہ اکرام الدین نے کہا کہ میں مدرسہ کا خیر خواہ ہوں اور این سی پی یو ایل کے زیر اہتمام جو بھی پروگرام شروع ہوں گے اس مدرسہ کو بھی اس کا فائدہ پہنچے گا۔ انھوں نے کہا کہ یہاں کے تمام بچوں کا آدھار کارڈ بنوایا جانا چاہیے تاکہ مستقبل میں انھیں 10 ہزار کا فائدہ مل سکے۔ پروگرام سے کمپیوٹر و اردو زبان سیکھنے والی طالبہ پوجا، اسمرتا، درخشاں کے علاوہ فیکلٹی رکن ناگیندر کمار ٹھاکر، سعید احمد راعین، عارفہ، ناگمنی، منٹو چودھری، ابرار خاں، شرون کمار سمیت کئی لوگوں نے خطاب کیا۔ پروگرام کی نظامت مفتی صدر عالم نے کی۔ سینٹر انچارج خلیق الزماں کے کلمات تشکر کے ساتھ تقریب اختتام پذیر ہوئی۔ اس موقعے پر کے جے ایل سی وی منچ کے سکریٹری نے شیام پور گاؤں میں این سی پی یو ایل کے ذریعے کمپیوٹر سینٹر شروع کرنے کے لیے ڈائرکٹر کو ایک میمورنڈم پیش کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' پٹنہ، 12 مارچ 2014

قومی اردو کونسل کے رکن کی عراق میں شہادت

فروغ اردو بھون میں تعزیتی جلسہ

نئی دھلی: 5 مارچ قومی اردو کونسل کے صدر دفاتر میں مولانا اسید الحق قادری ازہری کی عراق میں شہادت پر ایک تعزیتی جلسے کا انعقاد کیا گیا۔ فروغ اردو بھون میں منعقدہ اس میٹنگ میں کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین نے کہا کہ مولانا اسید الحق قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے عربک پینل کے ایک فعال اور متحرک رکن تھے۔ انھوں نے اپنی بصیرت سے پینل میں ایک تحرک پیدا کر دیا تھا۔ وہ کئی اہم کتابوں کے مصنف تھے اور انھوں نے کونسل کے لیے کئی اہم نکات کی نشاندہی کی۔ وہ نئی نسل کے مذہبی اسکالرس کے لیے رول ماڈل کی حیثیت رکھتے تھے۔ اس موقعے سے کونسل کے ڈائرکٹر نے بھرائی ہوئی آواز میں مرحوم کی شہادت پر تعزیت کا اظہار کیا۔ انھوں نے کہا کہ ان کی شہادت کی خبر نے پوری علمی اور مذہبی دنیا کو آبدیدہ کر دیا ہے۔ اس سانحہ سے علمی اور ادبی دنیا میں ایک خلا واقع ہوگیا ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ ان کی شہادت قوم وملت کے لیے ایک عظیم خسارہ ہے جس کی بھرپائی ممکن نہیں۔ اپنے تعزیتی پیغام میں انھوں نے سوگوار اہل خانہ کو صبر جمیل اور مرحوم کے لیے جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام کے لیے دعا کی۔ اس موقعے سے کونسل کے دوسرے اراکین نے بھی رنج وغم کا اظہار کیا۔ کونسل کے وائس چیئرمین پروفیسر وسیم بریلوی نے بستر علالت سے بھیجے گئے اپنے تعزیتی پیغام میں کہا کہ کونسل اپنے مستقبل کے کئی منصوبوں میں مولانا اسید الحق کی ذات سے استفادہ کرنا چاہتی تھی اس لیے ان کا انتقال اردو کے لیے بھی ایک بڑے نقصان کی حیثیت رکھتا ہے۔ میٹنگ میں ڈاکٹر کلیم اللہ، جناب محمد عصیم، جناب شاہنواز خرم، جناب اجمل سعید، جناب فیروز عالم اور ڈاکٹر شاہد اختر نے بھی اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 5 مارچ 2014

قومی اردو کونسل کے تعاون سے

اردو کے بدلتے منظرنامے پر سیمینار

لکھنؤ: نیوکلیس ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی کے زیراہتمام اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے مالی تعاون سے آج رائے اماناتھ بلی ہال میں 'اردو کا بدلتا منظر نامہ' موضوع پر ایک سیمینار کا انعقاد کیا گیا۔ سیمینار کی صدارت چیئرمین مدرسہ تعلیمی بورڈ، پروفیسر قاضی زین الساجدین نے کی جب کہ مہمانِ ذی وقار کی حیثیت سے رکن ممبر اسمبلی ابوعاصم اعظمی شریک ہوئے۔ مہمان خصوصی مولانا عبدالسلام ندوی، صدر ایس این انٹر کالج، امبیڈکر نگر نے کہا ہے کہ اردو زبان وادب اپنی چاشنی اور دلکشی کی وجہ سے ہر زمانے اور ہر ادوار میں عوام وخواص سب کی نورنظر بنی رہی۔ صدارتی خطاب میں پروفیسر قاضی زین الساجدین، چیئرمین مدرسہ تعلیمی بورڈ نے کہا کہ 'اردو کا بدلتا منظر نامہ' موضوع اپنی جگہ نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ ماضی کی اردو، اور حال کی اردو میں کچھ زیادہ فرق تو نہیں ہاں تکنیکی فرق ضرور آیا ہے۔ مہمان ذی وقار ابوعاصم اعظمی نے اردو کے حق میں بولتے ہوئے کہا کہ اردو ماضی میں بھی کامیاب تھی، حال میں بھی روشن ہے اور انشاء اللہ اس کا مستقبل بھی تابناک ہوگا۔ سیمینار میں خصوصی مندوبین کی حیثیت سے مولانا عبدالسلام ندوی، صدر ایس این انٹر کالج، امبیڈکر نگر، وسیم حیدر، چیئرمین اردو تحفظ وترقی بورڈ، ضیا صدیقی ندوی، جنرل سکریٹری تنظیم محبان اردو شامل ہوئے۔ سیمینار میں نظامت کے فرائض ڈاکٹر عمیر منظر نے انجام دیے۔ جب کہ افتتاحی کلمات نیوکلیس ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی کے بانی جنرل سکریٹری ڈاکٹر نثار احمد نے ادا کیے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 22 فروری 2014

جموں میں صحافیوں کے لیے ورکشاپ

جموں: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اور سنٹر فار پروفیشنل اسٹڈیز ان اردو جموں یونیورسٹی کے اشتراک سے شعبۂ اردو جموں یونیورسٹی میں صحافیوں کے لیے تین روزہ ورکشاپ بعنوان 'اردو صحافت کی اہمیت اور صحافیوں کی پیشہ ورانہ صلاحیتوں کا فروغ' کا اہتمام کیا گیا۔ اس ورکشاپ کا افتتاح این سی پی یو ایل کے سابق ڈائریکٹر پروفیسر علی جاوید نے کیا۔ افتتاحی تقریب کی صدارت کے فرائض وائس چانسلر جموں یونیورسٹی پروفیسر موہن پال سنگھ ایشر نے انجام دیے۔ جموں وکشمیر کے سینئر صحافی وید بھسین بحیثیت مہمان ذی وقار شریک ہوئے۔ پروفیسر علی جاوید نے جموں کے موقر روزنامہ اخبارات، پرنٹ میڈیا سے وابستہ سرگرم صحافیوں سے براہِ راست تبادلہ خیال

شعبۂ اردو جموں یونیورسٹی میں صحافیوں کے لیے منعقدہ تین روزہ ورکشاپ کا ایک منظر

'عصری اردو- ہندی شاعری پر سیمینار' کے دوران اسٹیج پر پروفیسر وہاج الدین علوی، گووند پرساد، چندر دیو یادو، ڈاکٹر رحمٰن مصور و دیگر

کرتے ہوئے کہا کہ صحافت ایک مقدس پیشہ ہے، مگر موجودہ دور میں اس پیشہ کو کاروبار کے طور پر استعمال کیا جانا ایک المیہ ہے۔ انھوں نے کہا کہ صحافت کا پیشہ قربانی اور ایمانداری کا محتاج ہے اور موجودہ دور میں صحافت کی بدلتی ہوئی منفی صورتِ حال کو تبدیل کرنے کے لیے صحافیوں کو اپنا کردار نبھانے کی ضرورت ہے۔ وائس چانسلر پروفیسر موہن پال سنگھ ایشر نے صدارتی خطبے میں کہا کہ صحافیوں سے سماج کو بہت زیادہ توقعات ہیں اور سماج میں پیدا ہوئی خرابیوں کو درست کرنے میں جو کردار صحافی ادا کرسکتے ہیں، وہ سماج کا دوسرا فرد یا کوئی دوسرا پیشہ رکھنے والا انجام نہیں دے سکتا۔ سینئر صحافی وید بھسین نے ورکشاپ کے شرکا سے خطاب کرتے ہوئے جموں یونیورسٹی اور این سی پی یو ایل کو ورکشاپ کا انعقاد کرنے کے لیے مبارکباد پیش کی۔ پروفیسر شہاب عنایت ملک نے استقبالیہ خطبہ پیش کرتے ہوئے صحافیوں کے لیے منعقد کی گئی ورکشاپ کے اغراض و مقاصد کو بیان کیا۔ انھوں نے امید ظاہر کی کہ مستقبل قریب میں جموں یونیورسٹی اور این سی پی یو ایل کے درمیان 'میمورنڈم آف انڈر اسٹینڈنگ' (معاہدہ) بھی طے کیا جائے گا، تاکہ جموں یونیورسٹی این سی پی یو ایل کے تعاون سے ریاست میں اردو کی ترویج کے لیے تقریبات کا انعقاد کرنے کی اہل بن سکے۔ ورکشاپ کی افتتاحی تقریب میں شعبہ اردو کے ششماہی مجلّہ 'تسلسل' کے منٹو نمبر کا بھی اجرا کیا گیا۔ اس ورکشاپ میں صوبہ جموں کے تقریباً پچاس سرگرم صحافیوں نے شرکت کی۔ اس موقعے پر فرحت رضوی، راشٹریہ سہارا نئی دہلی، خورشید کاظمی، شام طالب، ڈاکٹر چمن لال بھگت، ڈاکٹر عبدالرشید منہاس، ڈاکٹر فرحت شمیم، ڈاکٹر مقیم انصاری، طارق ابرار قابل ذکر ہیں۔ نظامت ڈاکٹر ریاض احمد نے کی، جب کہ اظہار تشکر پروفیسر سکھ چین سنگھ نے کیا۔ روزنامہ 'انقلاب' دہلی، یکم مارچ 2014

عصری اردو ہندی شاعری پر سیمینار

نئی دھلی: اردو اور ہندی ادب ہندوستانی تہذیب و ثقافت کی عکاس ہے۔ دونوں زبانیں ایک دوسرے کے لیے اتنی ضروری ہے کہ ایک کے بغیر دوسری مکمل نہیں ہوسکتی۔ دونوں کی تہذیبی میراث اور ثقافتی ورثے میں کوئی فرق نہیں۔ اردو شاعری نے ہندی ادب کو بھی مالا مال کیا ہے۔ مذکورہ خیالات کا اظہار آج شعبہ ہندی جامعہ ملیہ اسلامیہ اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اشتراک سے منعقدہ دو روزہ سیمینار بعنوان 'ہندی اردو شاعری کا عصری تناظر' میں مقررین نے کیا۔ افتتاحی پروگرام کی صدارت پروفیسر شمیم حنفی نے کی۔ انھوں نے اپنے صدارتی خطبے میں اردو اور ہندی ادب کی ساختیات، دونوں زبانوں کی شاعری کے موضوعات اور عصر حاضر میں اردو شاعری پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ اس موقعے پر کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے معروف شاعر اور ادیب فرحت احساس نے کہا کہ ہندی اور اردو کا ادب دو زبانوں میں لکھا جانے والا ایک ہی ادب ہے کیونکہ ہم ایک ہی اسپیس میں سانس لیتے ہیں اور ایک ہی سطح پر رہ کر چیزوں کو دیکھتے ہیں۔ اس موقعے پر ہندی کے معروف نقاد نامور سنگھ نے کہا کہ تلسی اودھی کے لوک شاعر ہیں لیکن ان کی شاعری میں عربی، فارسی اور ترکی الفاظ کی کثرت ہیں۔ اچھی ہندی کے لیے سنسکرت جاننا اتنا ضروری نہیں ہے جتنا اردو جاننا ضروری ہے۔ نظامت کرتے ہوئے ہندی کے استاد ڈاکٹر دلیپ شاکیہ نے پروگرام کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی۔ اس سیمینار میں دو اجلاس منعقد ہوئے۔ پہلا اجلاس میں 'ہندی اردو شاعری کی وراثت اور عصری منظرنامہ' پر خاص طور سے گفتگو کی گئی۔ اجلاس کی صدارت شعبہ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے صدر پروفیسر وہاج الدین علوی نے کی اور نظامت ڈاکٹر رحمان مصور نے کی۔ دوسرے اجلاس کا عنوان 'عصری ہندی اردو شاعری کی فکری اساس' تھا۔ اس اجلاس کی صدارت معروف ہندی شاعر لیلادھر منڈلوئی نے کی۔ جب کہ نظامت ڈاکٹر نیرج کمار نے کی۔

نئی دھلی: جامعہ ملیہ اسلامیہ میں شعبۂ ہندی اور اردو کے زیر اہتمام قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے تعاون سے منعقد دو روزہ سیمینار کا اختتامی پروگرام کا انعقاد کیا گیا۔ پہلا اجلاس 'عصری ہندی اردو شاعری کی ہیئت اور خصوصیت' پر مبنی تھا۔ اس اجلاس کی صدارت سائنس داں اور ہندی شاعر پلٹو جی نے کی اور نظامت کے فرائض ڈاکٹر کرشن کمار کوشک نے ادا کیے۔ ڈاکٹر نجمہ رحمانی اور ڈاکٹر وبھو سنگھ نے مقالے پیش کیے، جب کہ ڈاکٹر اجے ناوریا نے اظہارِ تشکر پیش کیا۔ 'عصری ہندی اردو شاعری کی جمالیات' کے عنوان سے دوسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر گنگا پرساد ومل نے کی۔ نظامت ڈاکٹر کہکشاں احسان صیاد نے کی۔ ڈاکٹر احمد محفوظ ڈاکٹر رضوان الحق اور ڈاکٹر پنکج چترویدی نے مقالے پیش کیے۔ پروفیسر مہندر پال شرما نے اظہارِ تشکر کرتے ہوئے کہا کہ ہندی اور اردو کی بہترین شاعری وہ ہے جہاں ان دونوں زبانوں کا فرق مٹ جاتا ہے۔ میر و غالب سے لے کر ناصر کاظمی اور پروین شاکر تک کی شاعری اس کی دلیل ہے۔ پانچواں اور آخری اجلاس 'عصری ہندی اور اردو شاعری کی زبان' پر مرکوز رہا۔ اس اجلاس میں ڈاکٹر برج راج سنگھ، ڈاکٹر سدھیر رنجن سنگھ اور ڈاکٹر کوثر مظہری نے اپنے مقالے پیش کیے۔ اس اجلاس کی صدارت ہندی ادب کے معروف نقاد پروفیسر کرشن دت پالیوال نے کی، جب کہ نظامت کے فرائض پروفیسر ہیم لتا مہیشور نے انجام دیے۔ آخر میں ڈاکٹر وویک دوبے نے اظہارِ تشکر کیا۔ صدر شعبہ ہندی پروفیسر درگا پرساد گپتا نے اس سیمینار کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہوئے کہا کہ ہندی اور اردو زبانوں کو ایک دوسرے کے بند دائرے سے باہر نکالنے کی ضرورت ہے۔ سچائی یہ ہے کہ دونوں زبانوں نے ایک دوسرے سے بہت کچھ لیا اور دیا ہے۔ سیمینار میں ہندی اردو شعبہ کے اساتذہ اور طلبا نے شرکت کی۔ واضح ہو کہ یہ سیمینار مرحوم اصغر علی انجینئر کی یاد سے منسوب کیا گیا تھا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 26 فروری 2014، و روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 27 فروری 2014

اردو کے فروغ میں مولانا آزاد کا کردار

علی گڑھ: مولانا ابوالکلام آزاد پبلک اسکول شہنشاہ

آباد میں اردو ادب کے فروغ میں مولانا ابوالکلام آزاد کا کردار کے موضوع پر ایک سیمینار منعقد کیا گیا۔ یہ سیمینار

غالب اکادمی میں سالویشن کے زیراہتمام 'ہندوستانی تہذیب کے فروغ میں اردو کا کردار' منعقدہ سیمینار کے دوران پروفیسر صادق، ڈاکٹر انظار عالم، ڈاکٹر مولا بخش اسیر، پروفیسر ابن کنول، راشٹریہ سہارا کے گروپ ایڈیٹر سید فیصل علی، ڈاکٹر کوثر مظہری ودیگر

NCPUL کے تعاون سے کیا گیا۔ اِس سیمینار کی صدارت ڈاکٹر مسعود احمد خاں نے کی اور مہمان خصوصی کے طور پر بایوٹیکنالوجی اے ایم یو کے ڈاکٹر اسداللہ خاں نے شرکت کی۔ ڈاکٹر مسعود احمد نے مولانا ابوالکلام آزاد کے قومی اور ملکی خدمات کو بیان کیا۔ ڈاکٹر اسداللہ خاں اور ڈاکٹر جاوید اختر نے اردو زبان کو قومی سطح پر ترقی کے لیے دھیان دلایا اور مولانا ابوالکلام آزاد کی سوانح عمری اور اردو لٹریچر پر روشنی ڈالی۔ اِس سیمینار میں جناب مسرور علی خاں نے مولانا ابوالکلام آزاد کے اردو ترقی کے بارے میں بتایا اور جناب پنکج دھیرج گپتا مانو اوپکار سنستھا کے صدر اور سماج سیوی خصوصی مہمان کی حیثیت سے موجود رہے۔ اس سیمینار میں سکریٹری جناب ایثم خاں نے سبھی خصوصی مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ اس موقعے سے شہر کے عمائدین بڑی تعداد میں موجود تھے۔

پریس ریلیز، ریثم خاں، سکریٹری، مولانا ابوالکلام آزاد پبلک سوسائٹی، علی گڑھ، 9 فروری 2014

ہندوستانی تہذیب کے فروغ میں اردو کا کردار

نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اشتراک سے 'سالویشن' کے زیراہتمام 'ہندوستانی تہذیب کے فروغ میں اردو کا کردار' کے عنوان سے غالب اکادمی، بستی حضرت نظام الدین نئی دہلی میں پروفیسر صادق سابق صدر شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی کی صدارت میں یک روزہ سیمینار کا انعقاد ہوا۔ سالویشن کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر انظار عالم نے شرکا کا خیرمقدم کرتے ہوئے سالویشن کے قیام کے اغراض و مقاصد اور تعلیمی میدان میں اس کی خدمات اور حصولیابیوں کا جائزہ پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ ہندوستانی تہذیب میں اردو کا بہت اہم کردار رہا ہے۔ لہٰذا اردو کے فروغ کے لیے ہم سب کو مل جل کر اور ذاتی مفاد سے بالاتر ہوکر کام کرنا چاہیے۔ مہمان اعزازی روزنامہ راشٹریہ سہارا کے گروپ ایڈیٹر سید فیصل علی نے افتتاحی پروگرام سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اردو کے فروغ کے لیے جو پیش رفت ہونی چاہیے وہ نہیں ہورہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو ہماری زندگی سے نکلتی جارہی ہے۔ سابق صدر شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی پروفیسر ابن کنول نے کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ ہر زبان ماحول کی پیداوار ہے، اردو زبان نے ہندوستان میں نئی تہذیب کو جنم دیا۔ اگر کسی تہذیب سے اس کی زبان نکال دی جائے تو وہ تہذیب ختم ہوجائے گی۔ سیمینار کی دوسری نشست میں ڈاکٹر مولا بخش اسیر نے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اردو زبان دنیا کی تمام زبانوں کو اپنے اندر سمو لینے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہندوستان کی تمام زبانوں کا ہم احترام کرتے ہیں، لیکن اردو زبان ہماری مادری زبان ہے اس لیے ہم اردو سے بے انتہا محبت کرتے ہیں۔ ڈاکٹر کوثر مظہری نے کہا کہ اردو زبان سے ہمارا تعلق پیدائش لے کر لحد تک ہے اگر ہم نے اردو زبان سے رشتہ توڑ لیا تو ہم اپنی تہذیب سے دور ہوتے چلے جائیں گے۔ ڈاکٹر یحییٰ نے کہا کہ انگریزی انٹرنیشنل زبان ہے، لیکن برصغیر میں اردو، میڈیا کی سب سے بڑی زبان ہے۔ کسی بات کو مشتہر کرنے کے لیے اردو کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ پروفیسر بدرالعالم صدر شعبہ علوم سیاسیات، جامعہ ملیہ اسلامیہ، ڈاکٹر مسلم خان شعبہ علوم سیاسیات، جامعہ ملیہ اسلامیہ، مشتاق صدف اردو افسر ساہتیہ اکادمی اور اردو کے دیگر اساتذہ اور اسکالرز نے اپنے مقالے پڑھے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 17 فروری 2014

رفعت سروش، فن اور شخصیت

نگینہ: رفعت سروش کی ہمہ جہت شخصیت نے عالمی اردو ادب کو بے حد متاثر کیا اور انھوں نے اردو کی تمام اصناف کو نہایت خوبی کے ساتھ برتا ہے۔ ان خیالات کا اظہار ڈاکٹر شبانہ نظیر ڈائریکٹر ایجوکیشن دہلی سرکار نے مصطفیٰ میونسپل انٹر کالج نگینہ میں 'رفعت سروش، فن و شخصیت' کے موضوع پر قومی کونسل برائے اردو زبان کے اشتراک سے اقبال میموریل ایجوکیشنل سوسائٹی کے زیراہتمام منعقدہ ایک روزہ سیمینار میں کیا۔ انھوں نے کہا کہ رفعت سروش میرے والد تھے اور میں اس نگینہ کی بیٹی ہوں اور چاہتی ہوں کہ علاقہ کی علمی اور ادبی منظرنامہ کو متاثر کن بنانے میں تعاون دے سکوں۔ سیمینار کا افتتاح مہمان خصوصی وزیرمملکت منوج پارس نے کیا۔ انھوں نے رفعت سروش کو نگینہ کا قیمتی نگینہ قرار دیا اور کہا کہ ایسی شخصیات کبھی کبھی ہی پیدا ہوتی ہے۔ اقبال میموریل سوسائٹی کے صدر حسن جاوید نے تمام مہمانوں اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ مقالہ نگاروں کو نگینہ کی مشہور لکڑی دستکاری کے نمونے بطور مومینٹو بھی پیش کیے گئے۔ اس اجلاس میں کل 14 مقالے پیش کیے گئے اس موقعے پر سکریٹری طفیل احمد ایڈوکیٹ نے سوسائٹی کی 14 سال کی پروگریس رپورٹ پیش کی۔ اس موقعے پر رفعت سروش کے بیٹے جاوید سروش، نوید سروش اور ان کی بیٹیاں، ڈاکٹر شاہینہ خان اور رویا خان بھی موجود رہیں۔

روزنامہ 'عزیزالہند' دہلی، 3 مارچ 2014

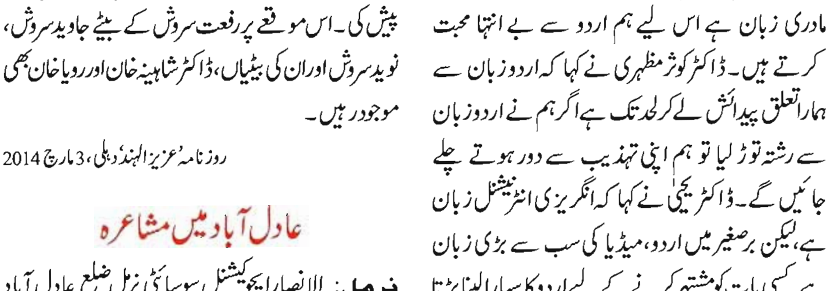

'رفعت سروش، فن اور شخصیت' قومی سیمینار کا ایک منظر

عادل آباد میں مشاعرہ

نرمل: الانصار ایجوکیشنل سوسائٹی نرمل ضلع عادل آباد کے زیراہتمام قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی، کے اشتراک و مالی تعاون سے دوسرا کل ہند مشاعرہ کامائیوری ہوٹل کے کانفرنس ہال میں انعقاد عمل میں آیا۔ الحاج ابراہیم بن عبداللہ مسقطی سابق رکن قانون ساز کونسل و سابق صدرنشین ریاستی اردو اکادمی نے صدارت کی اور الحاج سید شاہ نورالحق قادری ایڈوکیٹ و سابق صدرنشین ریاستی اردو اکادمی نے نگرانی کی۔ مشاعرہ کا آغاز حافظ ابراہیم انصاری کی قرأت کلام پاک اور طیب

دیال سنگھ کالج میں 2 روزہ سیمینار کے افتتاح کے موقعے پر روزنامہ راشٹریہ سہارا کے گروپ ایڈیٹر سید فیصل علی، پروفیسر شافع قدوائی
محمد وزیر انصاری، پروفیسر عتیق اللہ، ڈاکٹر ایس ایم فاروق، آئی ایس بخشی اور ڈاکٹر مولابخش

پاشاہ قادری حیدرآباد کی نعت پاک سے ہوا۔ کنویز مشاعرہ محمد افتخارالدین انصاری نے الانصار ایجوکیشنل سوسائٹی نرل کی خدمات پر روشنی ڈالی۔ سوسائٹی کی جانب سے خادمین اردو جن میں شعراء جن کے شعری مجموعہ کلام کی اشاعت عمل میں آئی ہے اور اردو تعلیمی خدمات انجام دینے والے اساتذہ، ڈی ایس سی 2012 میں منتخب معلمین و معلمات اور منتخب اردو صحافیوں کو تہنیت پیش کی گئی اور توصیف نامہ دیے گئے۔

روزنامہ راشٹریہ سہارا، حیدرآباد، 24 فروری 2014

امیر عارفی کی یاد میں ادبی سیمینار

نئی دہلی: اردو ایک زندۂ جاوید زبان ہے جسے فراموش نہیں کیا جاسکتا ہے۔ ان خیالات کا اظہار مہمان اعزازی اے ڈی جی پی اور مولانا آزاد ایجوکیشن فاؤنڈیشن کے سکریٹری محمد وزیر انصاری نے شعبۂ اردو دیال سنگھ کالج کے زیراہتمام معروف ادیب پروفیسر امیر عارفی کی یاد میں 'اردو میں ادب لطیف کا رجحان' کے عنوان سے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے تعاون سے منعقدہ 2 روزہ قومی سیمینار میں کیا۔ افتتاحی اجلاس کا باضابطہ آغاز دیال سنگھ کالج کے پرنسپل ڈاکٹر آئی ایس بخشی خیر مقدمی کلمات سے ہوا۔ سیمینار کے کنوینر، معروف نقاد اور صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر مولابخش نے کہا کہ اساتذہ کی تعظیم و تکریم ہندوستانی تہذیب کا جوہر ہے۔ انھوں نے کہا کہ ادب لطیف کا رجحان گم شدہ باب نہیں ہے۔ بلکہ ترقی پسندی، جدیدیت، مابعد جدیدیت کی گفتگو کا اہم حوالہ ہے۔ افتتاحی اجلاس میں سماجی کارکن ڈاکٹر ایس فاروق نے کہا کہ زبانوں کا کوئی مذہب نہیں ہوتا ہے۔ مہمان خصوصی راشٹریہ سہارا کے گروپ ایڈیٹر سید فیصل علی نے کہا کہ میں انگریزی میڈیا سے اردو میں میڈیا میں آیا ہوں یہ میری خوش نصیبی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو کا مستقبل روشن اور تابناک تھا اور رہے گا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ماس کمیونی کیشن کے صدر شعبہ شافع قدوائی نے کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر مولابخش نے ایک فراموش کردہ ادبی ڈسکورس کو حافظے میں ازسرنو لانے کا جتن کیا ہے۔ ادب لطیف کرنل ہالرائڈ کا ردعمل تھا۔ ادب لطیف کی تحریک نے اطراف کی دنیا کو سمجھنے اور جذبات کی تشہیر میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ پروفیسر عتیق اللہ نے کہا کہ ادب لطیف دراصل اسلوب کاری پر توجہ دینے والی تحریک تھی جس کے نزدیک موضوع غیراہم قرار پایا۔ پروفیسر ابن کنول نے کہا کہ امیر عارفی ایک مشفق استاد تھے، جنھیں فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ پہلے اجلاس کی صدارت صدر شعبۂ جامعہ ملیہ اسلامیہ پروفیسر خالد محمود اور اسلم جمشید پوری نے کی۔ پروفیسر خالد محمود نے کہا کہ شاعری میں ایک ہی اشعار کا کئی بار تکرار پسند کیا جاتا ہے لیکن نثر میں اس کو معیوب سمجھا جاتا ہے۔ اسلم جمشید پوری نے ادب لطیف کے اس سیمینار کو ایک نئے آغاز سے تعبیر کیا۔ ڈاکٹر ہمایوں اشرف نے 'ادب لطیف کا رجحان اور سجاد حیدر یلدرم کے افسانے' اور ڈاکٹر مظہر احمد نے 'رومانوی تحریک کا طنزیہ اسلوب و لیلیٰ کے خطوط' مقالے پیش کیے۔ آخری سیشن کی صدارت انجم عثمانی، پروفیسر غضنفر اور پروفیسر نعمان خاں نے کی جب کہ نظامت ڈاکٹر شعیب خاں وارثی نے کی۔ ڈاکٹر عبدالسلام صدیقی نے اپنے مقالے پیش کیے۔ وقفہ سوالات میں جے این یو، ڈی یو اور جامعہ سے بطور باحث شریک ریسرچ اسکالروں نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 19 فروری 2014

گزارش

مضمون نگاروں سے گزارش ہے کہ اپنی نگارشات کے ساتھ ایک عدد پاسپورٹ سائز کی تصویر ضرور ارسال کریں۔ مضمون کے ساتھ تحریری طور پر یہ تصدیق کرنا بھی ضروری ہے کہ یہ مضمون غیرمطبوعہ ہے اور کسی بھی رسالے اخبار یا کتاب میں شایع نہیں ہوا ہے۔ مضمون تحریر کرتے ہوئے یہ ذہن میں رکھا جائے کہ نئے موضوعات اور جدید تقاضوں پر لکھے گئے مضامین کو اشاعت میں ترجیح دی جائے گی۔ (ادارہ)

مشاعرے ہماری تہذیبی وراثت کے امین ہیں: خواجہ محمد اکرام الدین

نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان حکومت ہند کے زیراہتمام کل ہند مشاعرے کا انعقاد دہلی کے انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر میں کیا گیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد تعلیم بالغان اسکیم کے آغاز کے موقعے پر منعقد اس کل ہند مشاعرے میں ملک کے نامور شعرا نے شرکت کی اور اپنے کلام سے خواندگی کے مشن کو آگے بڑھانے کا پیغام دیا۔ اس موقعے پر تمام شعرا کا خیر مقدم کرتے ہوئے

کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین نے کہا مشاعرے ہماری تہذیب کی علامت ہیں اور ہر عہد میں شاعروں نے اس تہذیبی وراثت کو آگے بڑھانے کے ساتھ ساتھ تعلیمی اور سماجی اصلاح کا بھی بیڑا اٹھایا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس مشاعرے کا مقصد اردو والوں بالخصوص اقلیتوں کو تعلیم کے تئیں بیدار کرنا ہے تاکہ وہ خود کو اور اپنے آنے والی نسلوں کو زیور تعلیم سے آراستہ کرسکیں۔ مشاعرے کی صدارت ملک کے نامور شاعر پنڈت آنند موہن زتشی گلزار دہلوی نے کی، جب کہ نظامت کے فرائض معروف شاعر منصور عثمانی نے انجام دیے۔ اس تاریخی اور یادگار مشاعرے میں اردو دنیا کے عالمی شہرت یافتہ شاعر ڈاکٹر راحت اندوری، منظر بھوپالی، نواز دیوبندی، پروفیسر عین الحسن، طاہر فراز، شبینہ ادیب، اقبال اشہر، ڈاکٹر اعجاز پاپولر میرٹھی اور منصور عثمانی نے اپنے منتخب کلام سے سامعین کو خوب محظوظ کیا اور داد و تحسین حاصل کی۔

روزنامہ صحافت' دہلی' 20 فروری 2014

اردو سے متعلق دیگر قومی اور علاقائی خبریں

قومی :

روزگار کے مواقع بڑھانا حکومت کا فرض: کپل سبل

نئی دھلی: مرکزی وزیر کپل سبل نے پٹودی ہاؤس میں منعقدہ کمپیوٹر اور تکنیکی مراکز کی افتتاحی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ روزگار کے مواقع فراہم کرانا حکومت کا فرض اولین ہے اور اسی کے پیش نظر حکومت

تعلیمی مراکز کا افتتاح کرتے ہوئے کپل سبل ساتھ میں م افضل، فرید احمد، خواجہ اکرام الدین ودیگر

نے وزارت فروغ انسانی وسائل اور وزارت انفارمیشن ٹکنالوجی کے لیے علاقہ پٹودی ہاؤس میں معروف غیر سرکاری تنظیم مائنارٹیز ویلفیئر فاؤنڈیشن کو دو سرکاری مراکز دیے ہیں جہاں طلبہ اور بے روزگار نوجوانوں کو روزگار مہیا کرانے کے لیے سب سے بڑا سرکاری ڈپلوما کورس اور دوسرے سینٹر میں تکنیکی صلاحیت پیدا کرنے کے لیے بجلی سے چلنے والی اشیا جیسے واشنگ مشین، اوون، مائیکروویو، چارجرز، ایڈیٹر، بجلی کی فٹنگ، موبائل فون کی مرمت، بجلی کے پنکھے اور کولر بنانا اور ان کی مرمت وغیرہ کرنا سکھایا جائے گا۔ کپل سبل نے مزید کہا کہ ان کورسوں کے اختتام پر سرکاری ڈپلوما اور سرکاری نوکری کی فراہمی عمل میں آئے گی۔ اس موقعے پر بہترین نمبرات حاصل کرنے والے طلبہ وطالبات کو کپل سبل کے ہاتھوں مفت ٹیبلٹ بھی تقسیم کیے گئے۔ م افضل نے کپل سبل کے کاموں کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ اس علاقہ کی فلاح و بہبود کے لیے سبل کے کاموں کی اہل علاقہ دل سے قدر کرتے ہیں۔ پروگرام کا آغاز کرتے ہوئے فرید احمد نے کہا کہ ان کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ پرانی دہلی کے عوام کی تعلیمی اور معاشی حالت کو سدھارا جائے۔ انھوں نے مرکزی وزیر کپل سبل اور قومی اردو کونسل کے ڈائریکٹر خواجہ اکرام الدین کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ انھوں نے پرانی دہلی کے مسائل کے حل کو ہمیشہ اولین ترجیح دی۔ خواجہ اکرام الدین نے کہا کہ کونسل نے بحیثیت وزیر برائے فروغ انسانی وسائل اور بعد میں مرکزی وزیر برائے انفارمیشن ٹکنالوجی ہمیشہ کپل سبل سے اردو کے فروغ میں مدد لی اور ہمیشہ یہ پایا کہ وہ محض ایک وزیر ہی نہیں بلکہ اردو زبان اور اقلیتوں کے وکیل ہیں۔ پرہلاد سنگھ ساہنی نے کپل سبل کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ گزشتہ 10 برسوں میں جتنے کام کپل سبل نے کیے ہیں وہ آج تک کوئی ایم پی نہیں کرسکا۔ تقریب کے اختتام پر سابق کونسلر محمود ضیا نے تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا۔ اس موقعے پر حاجی قیام الدین، شیخ علیم الدین اسعدی، فاروق انجینئر، شفیع دہلوی، جمیل انجم دہلوی، حاجی نثار حسین، شاہ جہاں بیگم، وسیم صابر، محمد عمران، محمد یونس، محمد عارف، سید رئیس احمد، نعیم احمد، اور ناصر خاں وغیرہ موجود تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 2 مارچ 2014

اقلیتوں کے لیے نئی اسکیم 'پڑھو پردیس'

نئی دھلی: وزارت اقلیتی امور کے تحت تشکیل دی گئی نیشنل مانیٹرنگ کمیٹی کی پہلی میٹنگ آج مرزا غالب ہال 'اسکوپ' آڈیٹوریم سی جی او کمپلیکس میں منعقد کی گئی۔ اس موقعے پر وزیر برائے اقلیتی امور کے رحمٰن خان کے ہاتھوں وزارت کی نئی اسکیم 'پڑھو پردیس' کا افتتاح بھی عمل میں آیا۔ میٹنگ میں ملک بھر سے ممبران نے شرکت کی اور وزارت کی اسکیموں کے تعلق سے بحث و مباحثہ بھی ہوا۔ پروگرام کے پہلے اجلاس کے بعد میڈیا سے بات کرتے ہوئے کے رحمٰن خان نے کہا کہ وزارت اقلیتی امور کی نئی اسکیم 'پڑھو پردیس' ایک لون اسکیم ہے جس کے تحت طلبہ کو بیرون ملک اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے لون کی سہولت مہیا کرائی جائے گی۔ رحمٰن خان نے نیشنل مانیٹرنگ کمیٹی کے تعلق سے سوال کا جواب دیتے ہوئے بتایا کہ تین سال کی مدت کے لیے تشکیل دی گئی۔ اس 72 رکنی مانیٹرنگ کمیٹی میں اقلیتی فرقوں کے تھنک ٹینک شامل کیے گئے ہیں۔ کمیٹی میں وائس چانسلر، دانشور، مذہبی رہنما، اسکالر اور تکنیکی افراد شامل کیے گئے ہیں جو وزارت کو اس کی اسکیموں کے تعلق سے گائڈ کریں گے اور جائزہ لینے کے بعد یہ تجاویز اور سفارشات پیش کریں گے کہ کس اسکیم کو فروغ کی ضرورت ہے۔ وزارت اقلیتی امور کی اسکیموں کو ریاستی سرکاروں کے ذریعہ نافذ نہ کیے جانے کی شکایتوں سے متعلق سوال کے جواب میں انھوں نے بتایا کہ اسکالرشپ اسکیم کو اب ہم سیدھے نافذ کریں گے اور اس میں ریاستی سرکاروں کا کوئی رول نہیں ہوگا۔ انھوں نے کہا کہ ایسا کرنے سے اب وہ 25 فیصد رقم بھی ہمیں ہی دینی ہوگی۔ جو اب تک ریاستی سرکاریں دیتی رہی ہیں۔ ایک سوال پر انھوں نے بتایا کہ اسکالرشپ اسکیم کو اب آن لائن کردیا گیا ہے۔ وزارت اقلیتی امور کے جوائنٹ سکریٹری ڈاکٹر وائی پی سنگھ نے استقبالیہ تقریر میں نیشنل مانیٹرنگ کمیٹی کے تعلق سے تفصیلات بیان کیں اور

نیشنل مانیٹرنگ کمیٹی فار نوٹیفائیڈ مائنارٹیز' کی پہلی میٹنگ کے دوران خطاب کرتے ہوئے کے رحمٰن خان، (بیٹھے ہوئے) جسٹس ایم ایس اے صدیقی، وجاہت حبیب اللہ، للت کے پنوار، وائی پی سنگھ

وزارت کی اسکیموں کے تعلق سے بھی معلومات فراہم کرائیں۔ سکریٹری للت کے پنوار نے افتتاحی کلمات ادا

عالمی کتاب میلے میں سہ ماہی رسالہ 'عالمی جائزہ'، اردو پاکٹ بکس اور 'اردو زبان کے تکنیکی وسائل اور امکانات' کا اجرا کرتے ہوئے مہمان کرام

کرتے ہوئے کہا کہ اس کمیٹی کی تشکیل کے لیے کافی مشقت کرنی پڑی لیکن دیر سے ہی سہی کم سے کم شروعات تو ہوئی۔ اس موقعے پر قومی اقلیتی کمیشن کے سابق چیئرمین وجاہت حبیب اللہ اور عجائب سنگھ نے بھی اظہارِ خیال کیا۔ ڈائس پر قومی کمیشن برائے اقلیتی تعلیمی ادارہ جات کے چیئرمین جسٹس سہیل اعجاز صدیقی بھی موجود تھے۔ مانیٹرنگ کمیٹی کی میٹنگ میں موجود قابل ذکر شخصیات میں مولانا ولی رحمانی، فادر اینوئل ڈومنک، جین منی لوکیش، موسیٰ رضا، ڈاکٹر معراج الدین، کمال فاروقی، ٹی بی ایم ابراہیم خان، ترلوچن سنگھ، تصور علی، شاکر حسین، ایس فتح بہادر سنگھ، ڈاکٹر ظہیر آئی قاضی، محمد رفیق وارثی، مسعود فوجدار اور مشہور عالم وغیرہ شامل تھے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 27 فروری 2014

عالمی کتاب میلے میں اردو پاکٹ بکس کا اجرا

نئی دهلی: پرگتی میدان کے شروع ہوئے عالمی کتاب میلے میں جہاں کتب بینی کے شائقین کی بڑی تعداد نظر آئی وہیں اردو کو بھی بہت پیار ملا۔ میلہ میں جہاں اردو کے تقریباً 3 درجن سے زائد اسٹالز اور اسٹینڈز لگائے گئے وہیں۔ سہ ماہی رسالہ عالمی جائزہ، اردو پاکٹ بکس اور حرف آخر کی مشترکہ تقریب اجرا منعقد ہوئی جس میں اردو کے محبین نے شرکت کر کے نئی نسل کو اردو قاری بنانے پر زور دیا۔ اس موقعے پر مشاعرہ کا بھی انعقاد کیا گیا جس میں خوبصورت شاعری کی گئی۔ تقریب اجرا کے موقعے پر صدارتی کلمات پیش کرتے ہوئے سابق اسپیکر بلرام جاکھڑ نے اردو سے اپنی محبت اور شغف کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا کہ ''یہاں زبانیں بہت ہیں، کچھ زبانیں میں بھی جانتا ہوں، مگر اردو میں جو بات ہے وہ شاید کسی اور میں نہیں۔'' انھوں نے اردو کی شیرینی اور مٹھاس کے تعلق سے کہا کہ ''ایک لاجواب زبان ہے۔'' مشہور کہانی کار رتن سنگھ نے کہا کہ ''جس دور میں ہم زندگی گزار رہے ہیں، اس دور کی زندگی میں اور آج سے 60 سال پہلے کی زندگی میں بہت فرق ہے۔ میم افضل نے 'عالمی میڈیا' کی پیش رفت کو سراہتے ہوئے کہا کہ ''پاکٹ سائز بکس کا جو نظریہ ہے وہ اس لیے بہتر ہے کیونکہ یہ گراں نہیں ہوتا ہے اور اسے آسانی سے خریدا جاسکتا ہے۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے مدیر ڈاکٹر خواجہ اکرام نے کہا کہ ''کتاب بینی کا شوق ابھی زندہ ہے، اردو کتابیں خریدنے اور پڑھنے کا سلسلہ ابھی بھی جاری ہے۔ انھوں نے کونسل کے ذریعے شائع شدہ تخلیقات کی فروختگی کے اپنے تجربات بیان کرتے ہوئے کہا کہ ''کونسل بھی کتاب میلہ میں شریک ہوتا ہے اور یہ اندازہ ہوتا ہے کہ بڑی تعداد میں اردو کتابوں کے خریدار موجود ہیں۔ روزنامہ انقلاب کے ایڈیٹر (نارتھ) شکیل حسن شمسی نے اپنی کتاب 'حرف آخر' کے اجرا کے بعد اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ ''کتابوں کی اشاعت کا تجربہ کافی مشکل ہوتا ہے، میں نے اب تک 12 کتابیں لکھی ہیں اور مجھے معلوم ہے کن مشکلات سے گزرنا پڑتا ہے۔ عالمی میڈیا کے ایم ڈی اے رحمان نے کہا کہ ''اس ادارہ کی تاسیس کا واحد مقصد اردو کے معیار میں اضافہ ہے۔ انھوں نے کہا کہ ''میں اردو کے ان اشاعتی اداروں کے مقابلہ میں کھڑا ہوں جن کی انتہائی مہنگی تجارتی پالیسی کی وجہ سے اردو کتابوں سے اس کا قاری صرف اس لیے دور ہو رہا ہے کیونکہ وہ کتابیں اس کی دسترس سے باہر ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ''یہ ایک شروعات ہے، ہماری کوشش یہی ہے کہ ہم پروفیشنل طریقے سے اردو کے فروغ کا کام کریں۔'' این بی ٹی کے اردو ایڈیٹر شمس اقبال نے کہا کہ ''جو بھی کوشش ہو اس کا مقصد صرف یہی ہونا چاہیے تاکہ قاری قریب آسکے۔'' اس موقعے پر خطاب کرنے والوں میں پروفیسر ابن کنول، پروفیسر عتیق اللہ، ڈاکٹر مولابخش وغیرہ تھے جب کہ نظامت محمد شاداب نے کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 16 فروری 2014

بیدی شخصی و ادبی انفرادیت

نئی دهلی: واضح رہے کہ شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے زیر اہتمام دو اہم توسیعی خطبات کا اہتمام کیا گیا، شعبہ کے سیمینار ہال میں پہلا خطبہ 'راجندر سنگھ بیدی شخصی و ادبی انفرادیت' کے موضوع پر جامعہ کے شعبۂ اردو کے سابق صدر پروفیسر شمس الحق عثمانی نے پیش کیا، جب کہ دوسرا خطبہ آل انڈیا ریڈیو کے اسسٹنٹ ڈائریکٹر خورشید اکرم نے 'ریڈیو بطور آلہ ترسیل' کے موضوع پر پیش کیا۔ پہلے توسیعی خطبے کی صدارت پروفیسر محمد ذاکر اور نظامت پہلے خطبہ کے کنویز ڈاکٹر خالد مبشر نے کی جب کہ دوسرے توسیعی خطبے کی صدارت پروفیسر وہاج الدین علوی، صدر شعبۂ اردو اور نظامت ڈاکٹر خالد جاوید نے کی۔ دوسرے توسیعی خطبے میں آل انڈیا ریڈیو کے اسسٹنٹ ڈائریکٹر خورشید اکرم نے ریڈیو کی تاریخ، معاشرے اور سماج پر اس کے اثرات، اردو کے فروغ میں ریڈیو کا کردار، ایف ایم، کمیونٹی ریڈیو اور اس کے حال، اور مستقبل کے امکانات کے حوالہ سے سیر حاصل گفتگو کی۔ انھوں نے اپنے خطبہ میں کہا کہ ریڈیو کی اہمیت و افادیت آج بھی بہرحال مستند ہے اور نہایت آسانی کے ساتھ بغیر کسی خرچ کے یہ ہر جگہ دستیاب ہے۔ پروگرام کے اخیر میں شعبۂ اردو ڈاکٹر وہاج الدین علوی نے مہمانوں اور حاضرین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ریڈیو کے تعلق سے ماضی کی جذباتی یادوں کی طرف اشارہ کیا۔ پروگرام میں ڈاکٹر خالد محمود، پروفیسر شہپر رسول، پروفیسر شہزاد انجم، ڈاکٹر احمد محفوظ، ڈاکٹر کوثر مظہری، ڈاکٹر سہیل احمد فاروقی، ڈاکٹر عمران احمد عندلیب، ڈاکٹر رحمٰن مصور، ڈاکٹر سرورالہدیٰ کے علاوہ مزاحیہ شاعر اسرار جامعی نے شرکت کی۔ علاوہ ازیں شعبہ کے ریسرچ اسکالر اور طلبہ بڑی تعداد میں موجود تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 4 مارچ 2014

پروفیسر عتیق اللہ نے تجزیہ نگاری کا بہترین نمونہ پیش کیا: پروفیسر شمیم حنفی

نئی دهلی: ''کلام غالب کا تجزیہ، جیسے منفرد موضوع پر غالب انسٹی ٹیوٹ نے سیمینار منعقد کر کے یقیناً غالب کی افہام و تفہیم میں اضافہ کیا ہے۔ موضوع کے مطابق مقالہ پیش کرتے ہوئے معروف ناقد و محقق اور شاعر پروفیسر عتیق اللہ نے دیوان غالب کی پہلی غزل کے مطالعے نقش فریادی کا تجزیہ پیش کرتے ہوئے مکمل مقالہ پیش کیا جس پر صدارتی تقریر کرتے ہوئے معروف ناقد و محقق پروفیسر شمیم حنفی نے کہا کہ پروفیسر عتیق اللہ نے تجزیہ نگاری کا بہترین نمونہ پیش کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ غالب جس قدر ظاہر میں نظر آتے ہیں اس سے کہیں زیادہ وہ باطن میں پوشیدہ ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام، آغا خان فاؤنڈیشن، انجمن ترقی اردو کی شاخ اور غالب اکادمی کے تعاون سے 'کلامِ غالب کا تجزیہ' کے

غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیراہتمام بین الاقوامی سیمینار ’غالب کا تجزیہ‘ کے دوران اسٹیج پر ڈاکٹر ممتاز عالم، پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی
پروفیسر شمیم حنفی، ڈاکٹر سراج الدین نورمتو، جب کہ مائک پر پروفیسر عتیق اللہ

موضوع پر منعقد ہونے والے دو روزہ بین الاقوامی سیمینار کے دوسرے دن کے پہلے اجلاس کی صدارت لندن سے آئے مہمان اسکالر اور صدا میگزین کے مدیر ڈاکٹر اقبال مرزا اور انجمن ترقی اردو ہند دہلی کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر اطہر فاروقی نے کی اور نظامت ڈاکٹر شعیب رضا خاں نے کی۔ اس اجلاس میں ڈاکٹر سہیل انور، ڈاکٹر خالد مبشر، ڈاکٹر شہاب الدین ثاقب، ڈاکٹر نجمہ رحمانی اور ڈاکٹر مرزا شفیق حسین شفق نے اپنے گراں قدر مقالات پیش کیے۔ ان تمام حضرات نے غالب کی اہم غزلوں کا تجزیہ بڑی خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا۔

اس اجلاس میں کینیڈا کے معروف ادیب و دانشور ڈاکٹر تقی عابدی کا مقالہ جے این یو کے ریسرچ اسکالر محمد رکن الدین نے پڑھا ڈاکٹر تقی عابدی نے اپنے مقالہ میں غالب کی ایک فارسی غزل کا عالمانہ محاکمہ پیش کیا، جس کی فاضل مقرر نے خوبصورت قرأت کی۔ سیمینار کے دوسرے اجلاس کی صدارت میں غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، پروفیسر شمیم حنفی اور ازبکستان سے آئے اسکالر ڈاکٹر سراج الدین نورمتو موجود تھے۔ اس اجلاس میں پروفیسر انوار پاشا، ڈاکٹر عشرت ناہید، پروفیسر عتیق اللہ نے اپنا عالمانہ مقالہ پیش کیا۔ اس اجلاس میں ڈاکٹر ممتاز عالم نے نظامت کی۔ سیمینار کے آخری اجلاس کی صدارت پروفیسر شریف حسین قاسمی، ڈاکٹر عابد رضا بیدار اور کینیڈا کے معروف ڈرامہ نگار ڈاکٹر جاوید دانش نے کی اور اس اجلاس میں پانچ اہم مقالے پیش کیے گئے۔ ڈاکٹر مشتاق صدف، ڈاکٹر جمیل اختر، ڈاکٹر کوثر مظہری، ڈاکٹر سراج اجملی اور ڈاکٹر ابوبکر عباد نے اپنے مقالات پیش کیے۔ اس اجلاس میں ڈاکٹر شگفتہ یاسمین نے نظامت کی۔ اس سیمینار میں طلبہ و طالبات، ریسرچ اسکالرز، اساتذہ اور مختلف علوم و فنون کے ماہرین کثیر تعداد میں موجود تھے۔ سیمینار کے بعد ایک عالمی مشاعرے کا اہتمام کیا گیا، جس کی صدارت گلزار دہلوی نے کی۔ مہمان خصوصی کی حیثیت سے دہلی اسمبلی کے ایم ایل اے شعیب اقبال موجود تھے۔ اس مشاعرے میں ملک اور بیرون ملک کے اہم شعرا نے شرکت کی۔

روزنامہ ’انقلاب‘ دہلی، 17 فروری 2014

گوپی چند نارنگ کی نئی کتاب پر مذاکرہ

نئی دہلی: معروف ناقد پروفیسر گوپی چند نارنگ کی موجودگی میں ان کی تصنیف ’غالب- معنی آفرینی، جدلیاتی وضع، شونیتا اور شعریات‘ پر غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیراہتمام ’شام شہر یاراں‘ میں مذاکرے کا انعقاد کیا گیا۔ شام شہر یاراں کے تحت منعقد اس مذاکرے کی صدارت غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی

نے کی جب کہ نظامت کے فرائض غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر ڈاکٹر سید رضا حیدر نے انجام دیے۔ بطور مہمان خصوصی کینیڈا سے تشریف لائے ڈاکٹر سید تقی عابدی اور مجلس فروغ اردو دوہا، قطر کے چیئرمین محمد عتیق نے شرکت کی۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے بھی غالب کے حوالے سے پرمغز غالب وہ شاعر ہیں جن پر اقبال کے بعد سب سے زیادہ کتابیں لکھی گئیں، ایسی صورت میں ایک نیا راستہ نکالنا بہت مشکل ہوجاتا ہے۔ بصیرت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اس کتاب سے پروفیسر نارنگ کا شمار معتبر غالب شناسوں میں ہوگا۔ مجلس فروغ اردو کے چیئرمین محمد عتیق نے کہا کہ پروفیسر نارنگ کی یہ تصنیف اہمیت کی حامل ہے، یہ ان ادبا میں ہیں جو مستقل متحرک و فعال رہتے ہیں۔ اے رحمٰن ایڈوکیٹ نے بھی اپنے خیالات پیش کیے۔ ڈاکٹر مشتاق صدف نے ’الہامی تخلیق کی خیال افروز تفہیم‘ کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ میری نظر میں گوپی چند نارنگ غالب کے شارح نہیں بلکہ ایک سچے پارکھ ہیں۔ اردو اکادمی دہلی کے سکریٹری انیس اعظمی، اردو اکادمی کے پروگرام آفیسر محمد شمیم، اطہر فاروقی، اشفاق عارفی، اظہار ندیم، ڈاکٹر سید تنویر حسین، ڈاکٹر ابوظہیر ربانی، ثاقب فریدی وغیرہ کے نام شامل ہیں۔ پروگرام کے اختتام پر معروف شاعر شاہد ماہلی نے اظہار تشکر ادا کیا۔

روزنامہ ’صحافت‘ دہلی، یکم مارچ 2014

رام پور رضا لائبریری میں 17 ہزار مخطوطے موجود

رام پور: رضا لائبریری کے ڈائریکٹر پروفیسر سید محمد عزیز الدین حسین ہمدانی نے کہا کہ رام پور رضا لائبریری کے خزانہ کتب میں عربی، فارسی، سنسکرت، ترکی، پشتو، ہندی، اردو وغیرہ زبانوں میں 17 ہزار مخطوطات شامل

ہیں۔ اس لائبریری کی خصوصیت یہ ہے کہ یہاں حلب، مکہ، مدینہ، مصر، ایران، افغانستان اور اس کے ساتھ ہی مغلیہ دور کے حکمرانوں اور علم دوست افراد کی شاہی لائبریریوں کے مخطوطات ہیں۔ اس کے علاوہ بیجاپور کے عادل شاہی اور گولکنڈہ کی قطب شاہی لائبریری و حیدرآباد کی مہریں مخطوطات پر موجود ہیں۔ پروفیسر عزیز الدین حسین نے اندر پرستھ، گرلز کالج، نئی دہلی میں رضا لائبریری کے تعاون سے ’موتی جواہرات سے آراستہ رضا لائبریری کے نایاب مخطوطات‘ موضوع پر پیش کیے گئے اپنے مقالے کی معلومات فراہم کرارہے تھے۔ ڈائریکٹر لائبریری نے کہا کہ لائبریری کے لیے یہ فخر کی بات ہے کہ اس کے بیش قیمت خزانہ کتب میں اسلامی کیلی گرافی کے نادر خط اور نادر و نایاب قدیم مخطوطات کے نمونے موجود ہیں۔ سبھی مخطوطات کی اپنی انفرادی خوصیات ہیں، لیکن سبھی کے بارے میں تفصیل سے بیان کرنا آسان نہیں ہے۔ ان میں حضرت علیؓ، کے ذریعہ 7ویں صدی میں خط کوفی میں ہرن کی کھال پر لکھا گیا قرآن پاک، 8ویں صدی میں امام جعفر صادقؒ کا لکھا ہوا قرآن پاک کا دوسرا نسخہ، 9ویں صدی میں امام علی رضاؒ کے ہاتھ کا چمڑے پر لکھا قرآن مجید اور 10ویں صدی کا قرآن پاک جو کہ مشہور خطاط ابن مکلہ کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے موجود ہے۔ اس کے علاوہ لائبریری کے بیش قیمت خزانہ کتب میں دیوان حافظ،

ساہتیہ اکادمی کے زیر اہتمام علی سردار جعفری سیمینار کے پہلے دن کتاب 'اردو کی خواتین فکشن نگار' کا اجرا کرتے ہوئے (بائیں سے) ڈاکٹر کے ایس راؤ، ڈاکٹر مشتاق صدف، پروفیسر گوپی چند نارنگ، وشوناتھ پرساد تیواری ودیگر

سمیر چند کی فارسی میں ترجمہ کی گئی رامائن، ابن کلام الدین حسین کی 929 ہجری میں لکھی گئی دنیا کے حیرت انگیز چرند وپرند کی تصاویر سے سجی عجائب المخلوقات، فارسی زبان میں لکھے گئے مخطوطات کے مجموعہ میں زین الدین ابراہیم جورجانی کا لکھا مخطوطہ ذخیرہ خوارزم شاہی بھی شامل ہے۔ انھوں نے بتایا کہ لائبریری کے خزانہ کتب میں اردو کے مخطوطات کی تعداد عربی اور فارسی زبان کے مخطوطات سے کم ہے، لیکن رضا لائبریری میں شاہ حاتم کا دیوان، کلیات میر، دیوان سوز اور دیوان غالب کے اہم مخطوطات موجود ہیں۔ دیوان غالب پر خود غالب کے قلم سے غلطیوں کی تصحیح بھی موجود ہے۔ انھوں نے بتایا کہ ترکی زبان کے تقریباً 50 بیش قیمت مخطوطات بھی رضا لائبریری کے خزانہ کتب کی رونق بڑھا رہے ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 27 فروری 2014

علی سردار جعفری صدی تقریبات

نئی دهلی: علی سردار جعفری ترقی پسندوں کے سب سے بڑے قافلہ سالار تھے، سجاد ظہیر، ملک راج آنند، فیض احمد فیض، احتشام حسین اور مخدوم محی الدین کی صحبتوں کا فیض اٹھائے ہوئے اور جوش ان کے ہیرو تھے۔ ان کی شاعری میں جو براہِ راست خطاب کا میلان ہے وہ کسی حد تک جوش کی دین ہے۔ شاعری، خطابت اور نثر تینوں میں انھوں نے اپنا لوہا منوایا۔ ان خیالات کا اظہار اردو کے ممتاز نقاد اور دانشور پروفیسر گوپی چند نارنگ نے ساہتیہ اکادمی کے زیر اہتمام سہ روزہ قومی سیمینار علی سردار جعفری میں کیا۔ انھوں نے کہا کہ علی سردار جعفری کی لوگوں نے مخالفت کی۔ لوگوں نے غالب کی بھی مخالفت کی اور میر کی بھی، لیکن اس سے ان کی ادبی شخصیت پر کوئی نفی اثر نہیں ہوا۔ ہمیں کسی کی کوتاہیوں کو نہیں بلکہ خوبیوں کو دیکھنا چاہیے۔ ساہتیہ اکادمی کے صدر، ہندی کے ممتاز ادیب اور رسالہ 'دستاویز' کے مدیر وشوناتھ پرساد تیواری نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ علی سردار جعفری ہندی والوں میں بھی اتنے ہی مقبول رہے جتنے اردو والوں میں وہ تھے۔

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے پرووائس چانسلر خواجہ محمد شاہد نے سیمینار کا افتتاح کیا اور کہا کہ سردار جعفری کثیر الجہات ادیب تھے۔ وہ شاعر بھی تھے، نقاد بھی، ڈراما نگار اور افسانہ نگار بھی۔ انھوں نے مزید کہا کہ ترقی پسندوں میں ان جیسی تنقیدی نظر کسی میں نہیں تھی۔ کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے پروفیسر علی احمد فاطمی نے کہا کہ ان جیسی شخصیتیں صدیوں میں پیدا ہوتی ہیں۔ ان کا اپنا ایک الگ ویژن تھا۔ دونوں ملکوں کی سرحد پر پھیلی تاریکیوں کو دور کرنے کے لیے انھوں نے کام کیا۔ ساہتیہ اکادمی کے سکریٹری ڈاکٹر کے ایس راؤ نے پروگرام کے آغاز میں تمام مندوبین کا خیر مقدم اور استقبال کرتے ہوئے کہا کہ اکادمی ہر زبان کے ممتاز ادبا وشعرا پر قومی اور بین الاقوامی سیمیناروں کا انعقاد کرتی ہے۔ علی سردار جعفری کا شمار بھی بڑے قلم کاروں میں ہوتا ہے۔ انھیں ساہتیہ اکادمی اپنے اعلیٰ ایوارڈ سے نواز چکی ہے اور ان پر اکادمی نے مونوگراف بھی شائع کیا ہے۔ آخر میں اکادمی کے اردو مشاورتی بورڈ کے کنوینز اور معروف شاعر چندر بھان خیال نے تمام مہمانوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے سردار جعفری کو اردو شعر وادب کا لجنڈ قرار دیا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر مشتاق صدف کی ترتیب شدہ کتاب 'اردو کی خواتین فکشن نگار' کا اجرا ساہتیہ اکادمی کے صدر وشوناتھ پرساد تیواری اور پروفیسر گوپی چند نارنگ نے کیا۔ اس سیمینار میں جامعہ ملیہ اسلامیہ، جے این یو اور دہلی یونیورسٹی کے طلبا وطالبات کے علاوہ دہلی اور قرب وجوار کی متعدد سرکردہ شخصیات موجود تھیں۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 23 فروری 2014

انڈیا اسلامک سینٹر میں 'ہنر سے روزگار' پروگرام

نئی دهلی: اقلیتی طبقہ سے وابستہ خاص طور پر مسلم خواتین اپنے آئینی حقوق سے نابلد ہوتی ہیں، جس کی وجہ سے وہ اپنے حقوق کی شناخت نہیں کر پاتیں، شاید یہی وجہ ہے کہ وہ قومی دھارے سے دور رہتی ہیں، انھیں یہ پتہ نہیں ہوتا ہے کہ اگر ان کے ساتھ ظلم ہوتا ہے تو وہ کیا کریں؟ وہ سماج کی ترقی میں کیسے حصہ دار بنیں۔ ان خیالات کا اظہار اقلیتی خواتین کے حقوق کے لیے کام کر رہی ڈاکٹر شبستاں غفار نے کی۔ انھوں نے انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر میں 'ہنر سے روزگار تک' کے عنوان پر منعقدہ ایک پروگرام میں اقلیتی خواتین کو قومی دھارے سے جوڑنے کی بھرپور وکالت کرتے ہوئے کہا کہ ''ایسے وقت میں جب کہ سماج کا ہر شعبہ تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے، اقلیتی خواتین کا پیچھے رہ جانا بہت ہی خطرناک ہوگا۔'' شبستاں غفار نے بتایا کہ اقلیتوں کے لیے 'ہنر سے روزگار تک' کا یہ پروگرام دراصل اے آئی سی ڈبلیو ای ٹی ای اور این سی ایم ای آئی کی کمیٹی آن گرلس ایجوکیشن کے اشتراک سے ہوا ہے جس میں اقلیتی خواتین کی ہمہ جہت ترقی اور امپاورمنٹ پر بات چیت ہوئی ہے۔ انھوں نے بتایا کہ ''تقریب میں اقلیتی خواتین کے آئینی حقوق اور ان کے لیے متعدد اسکیموں کی معلومات پر مشتمل چار کتابوں کا اجرا عمل میں آیا ہے۔'' دراصل یہ کتابیں اس لیے تیار کرائی گئی ہیں تاکہ اقلیتی خواتین اپنے حقوق سے آگاہ ہوسکیں۔ ان کتابوں میں سب کچھ بتایا گیا ہے کہ مرکزی اسکیموں سے کیسے استفادہ کرنا ہے؟ اگر کوئی خاتون تنظیم چلانا چاہتی ہیں یا اسکول کھولنا چاہتی ہیں، تو انھیں کیا کرنا پڑے گا؟ وہ سرکار سے مالی مدد کیسے حاصل کرسکتی ہیں؟ کسی مشکل میں وہ متعلقہ اداروں (جیسے قومی کمیشن برائے خواتین و دیگر) سے کیسے رجوع کرسکتی ہیں؟ دریں اثنا تقریب سے خطاب کرتے ہوئے این سی ایم ای آئی کے سربراہ جسٹس ایم ایس اے صدیقی نے کہا کہ 'اقلیتی خواتین کو امپاورمنٹ کرنا بہت ضروری ہے۔ ان کا یہ جاننا ضروری ہے کہ ان کے حقوق کیا ہیں؟' جب کہ پروگرام میں ڈاکٹر مہندر سنگھ، ڈاکٹر نجمہ اختر اور مولانا شکیل قاسمی وغیرہ نے بھی اظہار خیال کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 27 فروری 2014

مولانا آزاد کے مزار پر گل پوشی

نئی دهلی: مولانا ابوالکلام آزاد کی 56ویں برسی پر مینا بازار میں واقع ان کے مزار پر ایک تقریب کا انعقاد کیا

گیا۔ اس موقعے پر انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنس (آئی سی سی آر) کے ڈائرکٹر جنرل ستیش مہتا، ڈپٹی ڈائرکٹر انور حلیم، انٹرفیتھ ہارمنی فاؤنڈیشن آف انڈیا کے صدر خواجہ افتخار احمد،

فرینڈز فار ایجوکیشن کے صدر فیروز بخت احمد اور مولانا علیم الدین اسعدی وغیرہ نے خراجِ عقیدت پیش کیا۔ سریش مہتا نے مولانا آزاد کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ مولانا آزاد نے تمام زندگی اندرون ملک اور ہندوستان کے دیگر ممالک سے تعلقات میں آپسی بھائی چارے کو فروغ دیا۔ سریش مہتا کا یہ اعلان کہ امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کے نظریات اور خیالات کو دنیا بھر میں پہنچانے کے لیے آئی سی سی آر کی لائبریری کو فروغ دیں گے اور اس میں مولانا آزاد سے متعلق کتابوں، سی ڈی اور ڈی وی ڈی وغیرہ کا اضافہ کریں گے۔ یہی نہیں آزاد کے نوادرات کو تمام دنیا سے جمع کرنے کے لیے آزاد میوزیم کو بھی فروغ دیں گے۔ فیروز بخت احمد نے کہا کہ مولانا آزاد باہمی یگانگی اور ہندوستان کی قومی تحریک کے مقتدر و معتبر رہنما تھے۔ خواجہ افتخار احمد نے کہا کہ وہ قومیں صفحۂ ہستی سے مٹ جاتی ہیں جو اپنے بزرگوں کو بھول جاتی ہیں۔ انور حلیم نے کہا کہ مولانا محض ایک روایتی عالم نہ ہو کر ایک ایسی شخصیت تھے کہ جنھوں نے تعلیم کے میدان میں دین اور دنیا دونوں کا ہی توازن قائم کر کے ملک وملت کو تیز گام راستے پر پہنچا دیا۔ اس موقعے پر اقبال محمد ملک اور سماجی کارکن مولانا علیم الدین اسعدی نے بھی اظہارِ خیال کیا۔ روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 23 فروری 2014

ہیما مالنی اردو سیکھنا چاہتی ہیں

ممبئی: بالی ووڈ کی ڈریم گرل اور مشہور اداکارہ ہیما مالنی کا کہنا ہے کہ وہ اب اردو سیکھنا چاہتی ہیں۔ اگرچہ کچھ کچھ جانتی ہوں لیکن اسے پوری طرح سیکھنا چاہتی ہوں۔ ڈریم گرل نے کہا کہ جب میں فلم انڈسٹری میں آئی تھی اس وقت مجھے اردو سیکھنے کے بارے میں کہا گیا تھا۔ میں اردو سے مکمل واقف ہونا چاہتی ہوں۔ میرے شوہر دھرم جی کو شعر و شاعری کا بے حد شوق ہے اس لیے میں نے سوچا ہے کہ میں اردو سیکھ کر کچھ شعر و شاعری کروں۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 17 فروری 2014

دھلی : ——————

غالب اکادمی میں 'غالب کی دلی اور دلّی والے'

نئی دھلی: غالب اکادمی کے 45ویں یوم تاسیس کے موقعے پر غالب کی دلی اور دلی والے کے عنوان سے ایک سیمینار کا انعقاد کیا گیا جس کا افتتاح سابق چیف الیکشن کمشنر ڈاکٹر ایس وائی قریشی نے کیا۔ انھوں نے کہا کہ دلی کا ایک ایک چپہ اپنی ایک طویل تاریخ وتہذیب رکھتا ہے۔ حضرت نظام الدین پر ہی کئی سیریل بنائے جاسکتے ہیں۔ پہلے اجلاس کی صدارت پروفیسر شمیم حنفی اور پروفیسر قاضی جمال حسین نے کی۔ اس اجلاس میں پروفیسر سلیل مسرا نے غالب کے زمانے کی سماجی و معاشی حالت پر بولتے ہوئے کہا کہ غالب کے یہاں سماج کا اپنا شعور تھا۔ وہ جدید دنیا نہیں مستحکم دنیا چاہتے تھے۔ 1857 ان کے لیے بڑا المیہ تھا۔ دستنبو کی بڑی سماجی اہمیت ہے۔ فیروز بخت نے غالب کی حویلی پر اپنا مقالہ پیش کیا اور ضمیر حسن دہلوی نے غالب کی دلی کے عنوان سے بہت دلچسپ مضمون پیش کیا۔ فیروز دہلوی نے غالب مجروح کے عنوان سے مقالہ پیش کیا۔ انیس اعظمی نے غالب کے ان خطوط کے اقتباسات پیش کیے جن میں دہلی کا ذکر ہے۔ پہلے اجلاس کی صدارتی تقریر میں قاضی جمال حسین نے کہا کہ غالب کی خصوصیت ہے کہ وہ مغلیہ تہذیب پر ماتم کرنے کے ساتھ ہی نئی تہذیب اور انگریزوں کی لائی ہوئی برکتوں کا خیر مقدم بھی کرتے ہیں۔ پہلے اجلاس کی نظامت سہیل انجم نے کی۔ دوسرے اجلاس میں عبدالعزیز نے غالب اور شیفتہ، غلام یحییٰ انجم نے دہلی کی خانقاہیں اور حنا آفرین نے خطوط غالب میں دہلی کی تاریخ کے عنوان سے مقالے پیش کیے۔ صدارت کے فرائض پروفیسر عبدالحق اور پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے ادا کیے۔ سیمینار کے تیسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر شمس الحق عثمانی اور ڈاکٹر یونس جعفری نے کی۔ اس اجلاس میں ڈاکٹر خالد علوی نے اپنے مقالے غالب کی دلی اور اور دلی والے کی تعلیمات بیان کی۔ معید رشیدی نے غالب اور مومن مفرضات اور حقائق کے عنوان سے اپنے مقالے میں کہا کہ عام طور پر غالب کو مومن کا حریف بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ غلط ہے دونوں اچھے دوست تھے۔ پروفیسر شمس الحق عثمانی نے کہا کہ عہد غالب پر تازہ نظر ڈالنے کی بھی ضرورت ہے اور اس بات پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ ٹیپو کی شکست بھی مسلمانوں کی حکومت کے لیے ایک بڑا المیہ تھا۔ تیسرے اجلاس کی نظامت شمیم عثمانی نے کی۔

روزنامہ 'عزیز الہند' دہلی، 25 فروری 2014

جامعہ ملیہ اسلامیہ میں منشی نول کشور یادگاری خطبہ کے دوران خطاب کرتے ہوئے چودھری محمد نعیم، پروفیسر وہاج الدین علوی، شہزاد انجم ودیگر

سری ادب اور ظفر عمر پر نول کشور یادگاری خطبہ

نئی دھلی: 50-60 برس پہلے ظفر عمر کا نام خاصا مقبول تھا اور ان کا ناول 'نیلی چھتری' شہرت اور مقبولیت کے تمام ریکارڈ توڑ چکا تھا۔ ہماری نسل کی ادبی تربیت میں ظفر عمر کے جاسوسی ناولوں کا اہم حصہ رہا ہے۔ ان خیالات کا اظہار شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے زیر اہتمام چوتھے منشی نول کشور یادگاری خطبے کے دوران صدارتی تقریر میں معروف نقاد پروفیسر شمیم حنفی نے کیا۔ شکاگو یونیورسٹی امریکہ کے پروفیسر امریٹس اور معروف اسکالر چودھری محمد نعیم نے 'سری ادب اور ظفر عمر' کے موضوع پر اپنا وقیع خطبہ پیش کیا۔ چودھری محمد نعیم نے ظفر عمر کی شخصیت اور ان کے تخلیقی کارناموں بالخصوص جاسوسی ناولوں کا تفصیلی جائزہ پیش کرتے ہوئے ان پر سیر حاصل گفتگو کی۔ شعبۂ اردو کے صدر پروفیسر وہاج الدین علوی نے مہمانوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے منشی نول کشور کی ادبی خدمات پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے چودھری محمد نعیم کا استقبال کرتے ہوئے ان کی غیر معمولی علمی وادبی خدمات کا ذکر کیا۔ خطبہ کے کنوینر ڈاکٹر احمد محفوظ نے چودھری محمد نعیم کے بارے میں کہا کہ انھیں اردو شعر و ادب کے کلاسکی سرمائے سے گہرا شغف ہے۔ اس یادگاری خطبہ کے موقعے پر اردو شعر وادب کی معروف ویب سائٹ ریختہ ڈاٹ آرگ کے بانی و سربراہ سنجیو صراف بحیثیت مہمان خصوصی موجود تھے۔ ان کے علاوہ پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، پروفیسر شہناز انجم، پروفیسر اصغر وجاہت، پروفیسر غضنفر، ڈاکٹر عبدالرشید، فرحت احساس کے علاوہ دیگر معزز حضرات موجود تھے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 22 فروری 2014

جامعہ ملیہ میں ترک دانشوروں کی آمد

نئی دھلی: جامعہ ملیہ اسلامیہ اپنی نوعیت کا منفرد ادارہ ہے۔ ترکی سے اس کے رشتے بہت قدیم ہیں۔ جامعہ کے بانیان میں سے ایک ڈاکٹر مختار احمد انصاری نے

پروفیسر چودھری محمد نعیم استقبالیہ پروگرام میں دائیں سے جناب سنجیو صراف، ڈاکٹر جی آر کنول، پروفیسر وہاج الدین علوی، پروفیسر شمیم حنفی، پروفیسر چودھری محمد نعیم اور مائک پر انیس اعظمی

بلقان جنگ کے دوران ہندوستانی میڈیکل وفد کی قیادت کی تھی۔ اسی طرح جامعہ نے تحریک خلافت کے بطن سے جنم لیا جس کے تحت ہی عدم تعاون کی تحریک شروع ہوئی تھی اور جس کا ثمرہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کا 29 اکتوبر 1920 کو علی گڑھ میں قیام ہے۔ یہ بھی حسن اتفاق ہے کہ جامعہ کا یومِ تاسیس اور ترکی کا قومی دن دونوں 29 اکتوبر ہیں۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر اختر الواسع ترک دانشوروں کے ایک وفد کا استقبال کرتے ہوئے کیا۔ پروفیسر اختر الواسع نے وفد کے سامنے جامعہ کا تعارف کراتے ہوئے یہ بھی کہا کہ جامعہ نہ صرف یہ کہ گریجویشن کی سطح پر ترکی زبان کی تعلیم دینے والی پہلی ہندوستانی یونیورسٹی ہے، بلکہ اس کے اسلامک اسٹڈیز کے نصاب میں جدید ترکی، اس کی تحریکات اور شخصیات کا خصوصی مطالعہ بھی شامل ہے۔ ترک دانشوروں کی قیادت کرتے ہوئے استنبول فاؤنڈیشن برائے ثقافت اور علوم کے سکریٹری جنرل ڈاکٹر فارس کایا نے وفد کے جامعہ میں استقبال پر ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز خاص طور پر اس کے فعال ڈائریکٹر اور کارکنان کا شکریہ ادا کیا۔ اس پروگرام میں پروفیسر سید احسن چیئرمین ڈپارٹمنٹ آف اسلامک اسٹڈیز، علی گڑھ اور پروفیسر اقتدار محمد خاں صدر شعبہ اسلامک اسٹڈیز جامعہ ملیہ اسلامیہ نے خاص طور پر شرکت کی اور وفد کے شرکا سے گفتگو کی ان کے علاوہ شعبہ اسلامک اسٹڈیز کے اساتذہ میں سے ڈاکٹر فریدہ خانم، جنید حارث، ڈاکٹر محمد ارشد، ڈاکٹر مفتی محمد مشتاق تجاروی، ڈاکٹر محمد خالد خاں وغیرہ نے شرکت کی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 11 فروری 2014

چودھری محمد نعیم کو استقبالیہ

نئی دھلی: اردو اکادمی دہلی کی جانب سے امریکہ سے تشریف لائے معروف ادیب پروفیسر چودھری محمد نعیم کے اعزاز میں ایک استقبالیہ تقریب کا انعقاد کیا گیا۔ اس پروگرام کی صدارت پروفیسر شمیم حنفی نے کی اور بطور مہمان اعزازی پروفیسر وہاج الدین علوی، ریختہ ڈاٹ کام کے سنجیو صراف اور ڈاکٹر جی آر کنول مدعو تھے۔ اس موقعے پر اردو اکادمی دہلی کے سکریٹری انیس اعظمی نے استقبالیہ کلمات پیش کرتے ہوئے کہا کہ منشی تیرتھ رام فیروز پوری اہم ادیبوں میں سے ایک ہیں، جنھیں آج اردو طبقہ بھلا چکا ہے لہٰذا انھیں باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اردو اکادمی دہلی نے منشی تیرتھ رام فیروز پوری پروفیسر نعیم چودھری کو استقبالیہ دیا ہے تاکہ اردو طبقہ منشی تیرتھ رام کی شخصیت سے واقف ہوسکے۔ پروفیسر چودھری محمد نعیم نے منشی تیرتھ رام کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ منشی تیرتھ رام فیروز پوری اردو زبان کے عظیم ترجمہ نگار تھے جنھوں نے تقریباً 163 کتابوں کا ترجمہ کیا ہے جو کہ ساٹھ ہزار صفحات کی ضخامت پر مشتمل ہیں۔ منشی تیرتھ رام فیروز کی خدمات پر چودھری نعیم کی کارگزاریاں قابل ستائش ہیں۔ پروگرام کے اختتام پر ڈاکٹر جی آر کنول نے اظہار تشکر ادا کیا۔ شرکاء میں پروگرام آفیسر محمد شمیم، محمد راغب، ڈاکٹر علی جاوید، ڈاکٹر ابوبکر عباد، ڈاکٹر ارجمند آرا، ڈاکٹر خالد جاوید، معصوم مرادآبادی، وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

پریس ریلیز انیس اعظمی سکریٹری، اردو اکادمی، دہلی، 3 مارچ 2014

غالب کی برسی پر طلبا کی غزل سرائی

نئی دھلی: مرزا غالب کے 145 ویں یوم وفات کے موقعے پر غالب اکادمی، نئی دہلی میں سکنڈری اور سینئر سکنڈری کے طلبا کی غزل سرائی مقابلے کا انعقاد کیا۔ اس مقابلے میں شرکت کرنے والے سبھی طلبا کو دیوان غالب اور سند بطور انعامات بدست پروفیسر شمیم حنفی تقسیم کیے گئے۔ نسیم عباسی اور ڈاکٹر نگار عظیم نے جج کے فرائض انجام دیے۔ اس موقعے پر پروفیسر شمیم حنفی نے طلبا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ اردو کئی قوموں اور تہذیبوں کی ترجمانی کرتی ہے اردو میں سب کو تلفظ کی تربیت دی جانی چاہیے۔ دو یکجہتی رواداری اور روشن خیالی کی زبان ہے۔ اس موقعے پر ڈاکٹر نگار عظیم نے کہا کہ غالب کی غزلیں سب بچوں نے اپنے اپنے انداز میں پیش کیں۔ کسی کی نغمگی اچھی تھی تو کسی کا تلفظ، مجموعی طور پر سب کی کارکردگی بہت اچھی تھی۔

روزنامہ 'اخبارِ مشرق' دہلی، 14 فروری 2014

آندھرا پردیش:

غالب اور حیدرآباد کے تعلق پر سیمینار

حیدرآباد: کلامِ غالب اور فکرِ غالب کو سہل اور آسان لفظوں میں پیش کرنا چاہیے تاکہ نسل نو غالب کی فکر فلسفہ اور اس کی گہرائی و گیرائی سے کما حقہ واقف ہوسکے۔ ان خیالات کا اظہار ڈاکٹر خواجہ ایم شاہد، نائب شیخ الجامعہ، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش کے زیرِ اہتمام منعقدہ 'غالب اور حیدرآباد' (ایک شام) میں اپنے صدارتی خطاب کے دوران کیا۔ سلسلہ تقریر جاری رکھتے ہوئے انھوں نے کہا کہ مشکل تشریح نسل نو کو اس عظیم شاعر کے ورثے سے بڑی حد تک دور کردے گی۔ انھوں نے مزید کہا کہ غالب کی 80 شرحیں شائع ہوچکی ہیں لیکن آج بھی ایک آسان شرح کی شدید ضرورت ہے۔ ڈاکٹر شاہد نے اس اجلاس میں پیش کیے جانے والے تمام مقالہ نگاروں اور مقررین کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے کہا کہ سبھی نے معلومات آفریں اور نئی سوچ کے ساتھ اپنا اپنا نقطۂ نظر پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر محمد ضیا الدین احمد شکیب، نامور مورخ (لندن) نے اپنے کلیدی خطبہ میں کہا کہ غالب کی پیدائش جس وقت ہوئی ان کے والد حیدرآباد میں تھے یعنی غالب نے اپنی ماں کے بطن ہی سے حیدرآباد کا نام سنا ہوگا اور یہ تعلق کسی نہ کسی شکل میں آخر تک برقرار بھی رہا۔ انھوں نے تمام مہمانانِ اعزازی اور انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش کو اس اجلاس کے انعقاد پر پُرخلوص مبارکباد پیش کی۔ مہمانِ خصوصی پروفیسر انور معظم، سابق صدر، شعبۂ اسلامیات، جامعہ عثمانیہ نے اپنے خطاب میں کہا کہ غالب کو اگر سمجھنا ہے تو ان کے خطوط کا عرق ریزی کے ساتھ مطالعہ کرنا ضروری ہی نہیں ناگزیر بھی ہے۔

روزنامہ 'جدید خبر' دہلی، 26 فروری 2014

اتر پردیش:

خواجہ احمد عباس صدی سیمینار

علی گڑھ: اردو کے ممتاز صحافی، ادیب اور فلم ساز

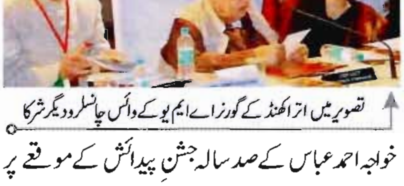

تصویر میں اتراکھنڈ کے گورنر اے ایم یو کے وائس چانسلر و دیگر شرکا

خواجہ احمد عباس کے صد سالہ جشنِ پیدائش کے موقعے پر

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے کینیڈی ہال میں ایک جلسہ سے خطاب کرتے ہوئے اتراکھنڈ کے گورنر ڈاکٹر عزیز قریشی نے کہا کہ خواجہ احمد عباس ایک مکمل انسان تھے جن کے سینے میں ساری انسانیت کا درد تھا۔ انھوں نے اپنے آنسوؤں کو سیاہی بنا کر استعمال کیا۔ گورنر ڈاکٹر قریشی نے کہا کہ خواجہ احمد عباس کی تحریروں میں کھیتوں میں کام کرنے والے کسان اور مفلوک الحال مزدوروں کے پسینے کی خوشبو آتی ہے۔ وہ ایک ماہر جراح کی طرح سماج کا آپریشن کرتے رہے۔ وہ ترقی پسند تھے اور مذہبی جنون کے خلاف آواز بلند کی۔ افتتاحیہ جلسہ کی صدارت کرتے ہوئے وائس چانسلر لیفٹیننٹ جنرل (ریٹائرڈ) ضمیرالدین شاہ نے کہا کہ اس ادارے کو اپنے مایہ ناز فرزندوں پر فخر ہے اور خواجہ احمد عباس بھی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے طالب علم رہ چکے تھے۔ انھوں نے کہا کہ وہ ایسے قلم کار تھے جو اردو، ہندی اور انگریزی میں بھی یکساں مقبول تھے۔ سابق وائس چانسلر پروفیسر مشیرالحسن نے کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی محض ایک تعلیمی ادارہ ہی نہیں بلکہ ایک سمندر ہے جس کے مختلف دھارے ہیں۔ ایک دھارے کی نمائندگی اس ادارے کے بانی سرسید احمد خاں اور ان کے رفقا نے کی تو دوسرا دھارا 1920 سے شروع ہوا جس نے ممتاز دانشور، صحافی اور سماجی زندگی کے افراد پیدا کیے۔ خلافت تحریک اور عدم تعاون کی تحریک میں بھی اس ادارے کے طلبا نے نمایاں حصہ لیا۔ پروفیسر مشیرالحسن نے کہا کہ بعض طلبا ایسے بھی تھے جنھوں نے عوامی شعور کو بیدار کیا جس میں خواجہ احمد عباس بھی تھے۔ انھوں نے کہا کہ سردار جعفری، سبطِ حسن اور جوش ملیح آبادی بھی اسی ادارے کی پیداوار تھے۔ پلاننگ کمیشن کی رکن ڈاکٹر سیدہ حمید نے کہا کہ خواجہ احمد عباس نے ہی امیتابھ بچن کو پہلی مرتبہ فلمی دنیا سے متعارف کرایا تھا۔ انھوں نے کہا خواجہ احمد عباس نے اپنی 73 سالہ زندگی میں 73 کتابیں تصنیف کی تھیں۔ صحافت کی تاریخ میں آزاد قلم کے کالم سے سب سے زیادہ لکھا انھوں نے 25 فلمیں بنائیں۔ انھوں نے عورتوں کے استحصال پر سب سے زیادہ لکھا ہے۔ شعبۂ صحافت کے سربراہ پروفیسر شافع قدوائی نے مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے کہا کہ خواجہ احمد عباس نے فلم، ادب اور صحافت تینوں میں اپنے گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔ ڈاکٹر شیرانی نے نظامت کے فرائض انجام دیے اور ڈاکٹر عارف رضوی نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'عزیز الہند' دہلی، 26 فروری 2014

لیمونائی میٹ کی افتتاحی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے وائس چانسلر ضمیرالدین شاہ

مسلم یونیورسٹی میں الیومنائیز کا جلسہ

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی الیومنائی میٹ کی افتتاحی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے یونین پبلک سروس کمیشن کے چیئرمین پروفیسر ڈی پی اگروال نے کہا کہ انھیں فخر ہے کہ وہ خود اس ادارہ کے طالب علم رہ چکے ہیں۔ علی گڑھ نے انھیں تہذیب دی، اپنے سے بڑے کا احترام سکھایا۔ پروفیسر اگروال نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سامنے تین اہداف رکھتے ہوئے کہا کہ ہم میں سے 20 فیصد بچوں کو ہی اعلیٰ تعلیم میں بھیجنا چاہیے۔ 20 فیصد کو سرکاری ملازمتوں میں اور بیس سے 25 فیصد کو صنعت کے میدان کو اپنانا چاہیے۔ ہمیں ایسی قیادت دینی چاہیے جو سماج کو سمجھ سکے۔ انھوں نے کہا کہ مسلم نوجوانوں کو سب سے پہلے اپنے خوف کو ختم کرنا چاہیے کہ سرکاری ملازمتوں میں ان کے ساتھ تفریق برتی جاتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس خوف کو سب سے پہلے ختم کرنا ہوگا۔ انھوں نے کہا کہ یونین پبلک سروس کمیشن میں کسی طرح کی تفریق نہیں ہوتی۔ ہمیں سرکاری ملازمتوں کے لیے بیس فیصد ہدف طے کرنا چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ ہندوستانی مسلمانوں میں ہنر ہے، دستکاری کے وہ ماہر ہیں، ان کے اسکل کو فروغ دیا جانا چاہیے۔ الیومنائی میٹ کے افتتاحی اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے وائس چانسلر لیفٹیننٹ جنرل (ریٹائرڈ) ضمیرالدین شاہ نے کہا کہ اس ادارے کا خواب ہے کہ سابق طلبہ کو منظم کیا جائے کیونکہ یہ سابق طلبہ ہمارے لیے باعثِ ترغیب ہیں۔ زکوٰۃ فاؤنڈیشن کے صدر اور سابق طالب علم ڈاکٹر سید ظفر محمود نے کہا کہ سرسید کا مقصد محض یونیورسٹی کا قیام ہی نہیں تھا بلکہ ہندوستانی مسلم نوجوانوں کو اقتدار کے لائق بنانا بھی تھا جس کے لیے انھوں نے 1883 میں 'سول سروس فنڈ' قائم کیا تاکہ سول سروسز میں مسلمانوں کی نمائندگی میں اضافہ ہو۔ اس موقع پر دبئی سے آئے قطب الرحمٰن اور میگھالیہ کی سائنس یونیورسٹی کے چانسلر مسٹر محبوب الحق نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اس موقع پر یادگاری مجلّہ کا اجرا بھی عمل میں آیا۔ ڈاکٹر ایف ایس شیرانی نے نظامت کے فرائض انجام دیے اور رجسٹرار گروپ کیپٹن (ریٹائرڈ) شاہ رخ شمشاد نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 26 فروری 2014

مسلم شخصیات پر دستاویزی فلموں کا میلہ

نئی دہلی: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے مشہور کینیڈی ہال میں ایک ڈاکیومینٹری فلم فیسٹیول کا انعقاد کیا گیا، جس میں طلبا اور اساتذہ نے کافی بڑی تعداد میں شرکت کی اور پروگرام کو خوب پسند کیا۔ اس میں یونیورسٹی کے بانی اور مشہور ماہر تعلیم اور ادیب سرسید کی زندگی اور ان کی عظیم خدمات کو سامنے رکھ کر ایک ڈاکیومینٹری فلم پیش کی گئی۔ ان کے علاوہ جن نامور شخصیات پر فلمیں دکھائی گئیں ان میں مجاز اور حکیم اجمل خان۔ ان کے علاوہ بھی چراغ ہند کے نام سے جن عظیم شخصیات پر فلمیں بنائی گئیں ان میں مولانا ابوالکلام آزاد، علامہ اقبال، غالب، سرسید احمد خان، دلیپ کمار، مجاز، ایم ایف حسین اور عظیم پریم جی، اے پی جے عبدالکلام وغیرہ ہیں۔ اس پروگرام کے بنانے کا مقصد یہ ہے کہ ہماری آج کی نوجوان نسل اپنے اسلاف کے ان عظیم کارناموں سے جانکاری حاصل کرسکے۔ اس پروگرام کی تخلیق کے لیے اردو اور انگریزی کے نامور ناول نگار اور اسکرپٹ رائٹر ڈاکٹر محمد عظیم جنھیں ادب میں نمایاں خدمات کے لیے سنسکرتی ایوارڈ سے سرفراز کیا جاچکا ہے، انھیں اس کی اسکرپٹ لکھنے کی ذمے داری سونپی جو ایک بڑا سوچا سمجھا فیصلہ تھا اور ہدایت کاری کی ذمے داری نامور ہدایت کار اور پروڈیوسر مستجاب ملک کو سونپی گئی ہے جن کی ہندوستان میں اسلامی کلچر پر بڑی گہری نظر ہے۔ 26 قسطوں میں منقسم اس پروگرام میں اور بھی کئی عظیم شخصیات کی زندگی اور ان کے گراں قدر کارناموں کا احاطہ کیا گیا ہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 18 فروری 2014

ایران کلچرل ہاؤس نئی دہلی کے کلچر کاؤنسلر ڈاکٹر علی فولادی، نول کشور اسٹیٹ کے ایک حصہ میں رکھی ہوئی کتابیں دیکھتے ہوئے، (دائیں جانب) ڈاکٹر رنجیت بھارگو کو دیکھا جاسکتا ہے۔

منشی نولکشور نے اردو کو دور دور تک پھیلایا

لکھنؤ: منشی نول کشور نے لکھنؤ میں اپنا پریس 23 نومبر 1858 میں قائم کیا جو 1950 تک چلا۔ انھوں نے اپنی زندگی میں تقریباً 5000 کتابیں شائع کیں جس میں سے 65 فیصد کتابیں اردو، عربی اور فارسی میں تھیں۔ قرآن کریم کی مکمل صورت میں پہلی طباعت 1868 میں اسی پریس میں ہوئی۔ منشی نول کشور نے اسی کے ساتھ ہی رامائن، گیتا، مہابھارت، پران، گروگرنتھ صاحب، جنم سکھی سمیت سبھی مذہبی کتابوں کی اشاعت کرائی، مختلف اہم کتابوں کے ترجمے بھی شائع کیے۔ نول کشور پریس میں شائع ہونے والی کتابوں کی سپلائی تقریباً پوری اسلامی دنیا میں ہونے کی وجہ سے یہ پریس ہر جگہ مشہور ہوگیا۔ صرف کتابوں کی اشاعت ہی نہیں، پریس قائم کرنے کے تین روز بعد 26 نومبر 1885 کو منشی نول کشور نے اردو میں 'اودھ اخبار' شروع کیا جو شمالی ہندوستان کا پہلا دیسی اخبار تھا۔ یہ اخبار 1950 تک نکلتا رہا۔ منشی نولکشور کے خاندان میں پانچویں نسل سے تعلق رکھنے والے ڈاکٹر رنجیت بھارگو کو افسوس ہے کہ ہندوستانی تہذیب وثقافت اور اودھ کی علمی وراثت کو فروغ دینے والے اس مایۂ ناز فرزند کے اعزاز میں حکومت اتر پردیش نے نہ تو کوئی ادارہ قائم کیا، نہ ان کی وراثت کو کوئی مقام دینے کی کوشش کی۔ اہم بات یہ ہے کہ لیتھو پریس کا پتھر جس سے قرآن کے صفحات طبع کیے جاتے تھے وہ لکھنؤ کی امیرالدولہ پبلک لائبریری میں محفوظ ہے۔ گزشتہ سال ایران کلچر ہاؤس نئی دہلی کے کلچر کاؤنسلر ڈاکٹر علی فولادی نے نول کشور خاندان کے چھاپہ خانہ کا دورہ کیا۔ انھیں 2000 کتابیں بطور تحفہ دی گئیں۔ 1868 عیسوی میں نول کشور پریس سے قرآن کریم کا نسخہ لکھنؤ کے خطاط محمد حامد علی کی کتابت اور آرائش وزیبائش کے ساتھ شائع ہوا جس کا ہدیہ ڈیڑھ روپے تھا۔ 1950 تک اس پریس سے قرآن کے 50 ایڈیشن اور 55 مختلف تفسیریں شائع ہوئیں۔ روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 18 فروری 2014

کیفی اعظمی کی یاد میں جلسہ

لکھنؤ: کیفی اعظمی ایک ترقی پسند شاعر اور انسان تھے۔ ان کے قول وفعل میں تضاد نہیں تھا۔ وہ زندگی بھر ترقی پسندی کے علمبردار رہے۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر ملک زادہ منظور احمد نے کیا۔ وہ یوپی پریس کلب میں اتر پردیش اردو اکادمی کے اشتراک سے اسٹار رائزنگ ویلفیئر فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام 'کیفی اعظمی: شخص اور شاعر' کے عنوان سے منعقد سمینار سے خطاب کررہے تھے۔ اپنی صدارتی تقریر میں ملک زادہ نے کہا کہ لوگ کہتے ہیں کہ جدیدیت اور مابعد جدیدیت کا زمانہ آگیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ترقی پسندی کبھی ختم نہ ہونے والی چیز ہے۔ ترقی پسندی ایک مسلسل عمل ہے۔ جدیدیت اور مابعد جدیدیت بھی ترقی پسندی کی توسیع ہیں۔ ادیب وصحافی محمد وصی اللہ حسینی نے 'کیفی اعظمی کی شاعری میں انسانی دردمندی' کے عنوان سے اپنا مقالہ پیش کیا۔ اس کے علاوہ عائشہ صدیقی، سیما صدیقی، ڈاکٹر عشرت ناہید اور سلمیٰ حجاب نے بھی مقالے پیش کیے۔ اس موقع پر سینئر صحافی سنتوش بالمیکی نے بھی اظہار خیال کیا۔ سمینار کی نظامت مخمور کاکوروی نے کی۔ مہمانان خصوصی کی حیثیت سے بیگم نسیم اقتدار علی اور اطہر نبی نے شرکت کی۔

پریس ریلیز، کنوینز: حنا خان، 2 مارچ 2014

مینارِ قومی یکجہتی واتحاد منشی نول کشور کے عنوان سے سیمینار

لکھنؤ: ہندوستان کے پہلے مایۂ ناز پبلشر کے طور پر متعارف منشی نول کشور کے یوم وفات کے موقع پر انسٹی ٹیوٹ آف سوشل ہارمونی اینڈ اپلفمنٹ کے زیر اہتمام ایک سیمینار بعنوان 'مینار قومی یکجہتی واتحاد منشی نول کشور' منعقد کیا گیا۔ سیمینار کی صدارت پروفیسر رمیش دکشت اور نظامت محمد خالد نے کی۔ اس موقع پر منشی نول کشور کی پانچویں پیڑھی کے نمائندہ پدم شری رنجیت بھارگو نے مہمان خصوصی کے طور پر شرکت کی۔ مقررین نے اپنے خطاب میں منشی نول کشور کو ایک ادیب، صحافی، مذہبی ہم آہنگی اور قومی یکجہتی کے علمبردار کے طور پر یاد کیا۔ پروفیسر رمیش دکشت نے اپنے صدارتی خطبہ میں کہا کہ منشی نول کشور کو ہم انھیں سچی خراج عقیدت پیش کرنا چاہتے ہیں تو سب سے پہلے ہمیں زبانوں کو مذہب اور فرقہ واریت سے اوپر اٹھ کر دیکھنا ہوگا۔ ڈاکٹر مسعود الحسن عثمانی نے کہا کہ منشی نول کشور مسلمان پنڈت تھے اور ہندو مولوی تھے ان کا کارنامہ یہ نہیں ہے کہ انھوں نے ایک پریس قائم کی یا بہت ساری کتابیں شائع کیں۔ ان کا کارنامہ تو یہ تھا کہ وہ ہندوستانی تہذیب کے علمبردار تھے اس کے محافظ تھے، امین تھے۔ ڈاکٹر صبیحہ انور نے اپنے مقالہ میں کہا کہ منشی نول کشور نے ہندوستان کے مختلف مذاہب کی مقدس کتابوں کو شائع کرنے کا کام کیا۔ اس موقع پر مہمان خصوصی ڈاکٹر رنجیت بھارگوا کو نول کشور ایوارڈ اور صحافی سنتوش بالمیکی کو سوشل ہارمونی ایوارڈ سے نوازا گیا۔ سیمینار میں احمد عرفان علیگ، ایس احمد ودیگر نے بھی خطاب کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 21 فروری 2014

عربی فارسی وسنسکرت کا جدید علوم سے رشتہ

لکھنؤ: لکھنؤ یونیورسٹی کے علوم مشرقیہ کے انچارج اور سہ روزہ بین الاقوامی سیمینار کے کنوینر ڈاکٹر ارشد علی جعفری کے زیر انتظام منعقد ہونے والا سہ روزہ سیمینار اختتام پذیر ہوا۔ اس موقع پر سیمینار سے خطاب کرتے ہوئے مہمان اعجازی ڈاکٹر انیس انصاری، وائس چانسلر خواجہ معین الدین چشتی اردو، عربی، فارسی یونیورسٹی، لکھنؤ نے عصر حاضر میں عربی وفارسی زبان وادب کی اہمیت و افادیت پر اظہار خیال کیا۔ انھوں نے کلاسیکی زبانوں، عربی، فارسی، سنسکرت کا جدید علوم مثلاً سائنس، کامرس اور مینجمنٹ سے رشتہ استوار کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ شیعہ مذہبی رہنما مولانا کلب جواد نقوی نے اپنے خطاب میں اودھ کی سرزمین میں فارسی وعربی زبان وادب کی ترویج واشاعت میں علمائے کرام اور دینی وعلمی اداروں کی خدمات پر روشنی ڈالی۔ جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، دہلی کے شعبۂ فارسی کے پروفیسر پروفیسر اور آل انڈیا پرشین ریسرچ اسکالرس ایسوسی ایشن کے صدر جناب عین الحسن نے فارسی اور عربی زبان وادب کی گراں قدر وراثت کے تحفظ اور اس کے فروغ کی ضرورت پر زور دیا۔ جلسے کی صدارت لکھنؤ یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر ایس بی نمسے نے اپنے صدارتی خطبے میں اس بات پر خوشی ظاہر کی

کہ لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ علومیہ شرقیہ کے زیر اہتمام اس طرح کے بامقصد اور کامیاب پروگرام منعقد کیا گیا۔ مستقبل میں بھی اس طرح کے ادبی اور علمی پروگرام کرائے جانے کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے انھوں نے پوری معاونت کی یقین دہانی بھی کی۔ جلسے کی نظامت ڈاکٹر حسین کاظمی نے کی۔ پروگرام کے آخر میں سیمینار کے کنوینر ڈاکٹر راجندر کمار ورما اور ڈاکٹر ارشد جعفری نے تمام مہمانان، مقالہ نگاران، دانشوروں اور پروگرام میں شامل طلبہ و اساتذہ کا شکریہ ادا کیا۔ روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 12 فروری 2014

ریاستی اردو اکادمی کے منصوبے

اتر پردیش: کسی بھی بلند سے بلند ادارہ کی کمان اگر کمزور ہاتھوں میں رہتی ہے تو ادارہ ہمیشہ کمزور ہی رہتا ہے لیکن اگر کسی کمزور ادارہ کو بھی مضبوط ہاتھوں کے سپرد کردیے جائیں تو اس ادارے کا مستقبل بہتر ہونے کی امید بندھ جاتی ہے۔ ایسا ہی ماجرا کچھ اتر پردیش اردو اکادمی کا ہوتا دکھ رہا ہے۔ ہال میں نومنتخب صدر منورانا نے اپنے اختیارات کا استعمال کرتے ہوئے اس اکادمی کو مزید فعال بنانے میں اپنی جانب سے کوشش تیز کردی ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے بتایا کہ ان کی کوشش ہے کہ اتر پردیش کے بزرگ شعرا کرام کو انشورنس فراہم کرانے، اردو طلبا کو وظائف دینے اور شعرا کرام کے انتقال کے بعد ان کی بیواؤں کو مالی امداد فراہم کرانے کے لیے وہ جلد ہی نئی اسکیموں کو شروع کرنے جارہے ہیں۔ نامہ نگار سے بات کرتے ہوئے موصوف نے بتایا کہ اس بابت 50 سال سے زیادہ کے بزرگ شاعروں کی انشورینس اکادمی کی جانب سے کیے جانے کی پہل کی جارہی ہے، افتتاح میں ایک ہزار شعرا پر مشتمل ایک فہرست کو اس سلسلے میں منتخب کیا جائے گا، جس کے بعد مستقبل میں یہ سلسلہ جاری رہے گا، ساتھ ساتھ وظائف پانے والے شعرا کی اہلیہ کو ان شعرا کے انتقال کے بعد مالی مدد کی جائے گی۔ انھوں نے کہا کہ بند پڑے خالی اردو کوچنگ سینٹر کو دوبارہ شروع کیا جائے گا ساتھ ساتھ 50 نئے سینٹرس کو بھی شروع کیا جائے گا جہاں طلبا اردو زبان کی تعلیم حاصل کرسکیں۔ اس کے ساتھ انھوں نے ادبا و شعرا کو ملنے والی امدادی رقم کو بھی دگنا کردیا ہے، وہیں مصنفین کو ملنے والی مالی امداد 5 ہزار سے بڑھا کر 20 ہزار کردی گئی ہے۔ اس سلسلے میں انجمن ہذا کی جانب سے وزیر اعلیٰ اتر پردیش کو بھیجی گئی ایک عرض داشت میں ان سے درخواست کی ہے کہ وہ ریاست میں اردو اکادمی کا کل بجٹ دہلی و آندھرا پردیش کی اردو اکادمی کی طرح سے 20 کروڑ روپے کرنے کی زحمت کریں۔ روزنامہ 'عزیز الہند' دہلی، 17 فروری 2014

آن لائن اردو سیکھنے کے لیے سینٹر

بدایوں: اتر پردیش اردو اکادمی قدر دانوں کے ہاتھ میں پہنچی تو اس کا خواب بھی پروان چڑھنے لگا۔ اردو کسی خاص فرقے کی زبان کہی جانے کے ساتھ ہی اس کی ترقی کے لیے کچھ نئی اسکیمیں تیار کی گئی ہیں۔ اس میں آن لائن اور آف لائن اردو سے ہندی انگریزی زبانوں کو آپس میں سیکھنے کے لیے سافٹ ویئر تیار کرنے کے ساتھ ہی

پورے صوبے میں 100 سینٹر کھولنے کی اسکیم کو وزیر اعلیٰ نے منظور دی ہے۔ اتر پردیش اردو اکادمی کے چیئرمین اور مشہور شاعر نواز دیوبندی ایک مشاعرے کے سلسلے میں بدایوں آئے تو انقلاب سے خاص بات چیت کی۔ انھوں نے بتایا کہ اردو کو جدید ٹیکنالوجی سے جوڑنے کے لیے وزیر اعلیٰ کو ایک تجویز دی تھی، جسے منظوری مل گئی ہے۔ اس میں اردو کے ذریعے دوسری زبانوں کو سیکھنے اور دوسری زبانوں کے ذریعے اردو سیکھنے کے مکمل انتظامات کیے جائیں گے۔ اردو سیکھنے کے لیے ایک آن لائن سسٹم تیار کیا جارہا ہے، جس سے کوئی بھی شخص کہیں بھی بیٹھ کر دوسری زبانوں (ہندی، انگریزی) کے ذریعے اردو اور اردو سے دوسری زبان سیکھ سکے گا۔ ایک سال کا اردو صحافت کا کورس بھی شروع کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ ملٹی لینگویج اکادمی بنائی جائے گی جس سے نوجوان بھی ایکسپورٹ کمپنیوں سے لے کر مختلف علاقوں میں آسانی سے روزگار حاصل کرسکیں گے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، یکم مارچ 2014

کبیر بھومی سنستھان کا اردو تعلیم پر مذاکرہ

گورکھپور: اردو زبان محبت اور شرافت سکھاتی ہے ڈسپلن اور تہذیب اسی زبان سے ملتی ہے اس لیے طلبا کو یہ زبان پڑھایا جانا بے حد ضروری ہے۔ مذکورہ خیالات کا اظہار 'کبیر بھومی سیوا سنستھان' کی جانب سے منعقد اردو زبان کی تعلیم ضروری کیوں؟ کے موضوع پر خواتین کے مجلس مذاکرہ سے خطاب کرتے ہوئے امام باڑہ گرلس کالج کی سابق پرنسپل شاہینہ خاتون نے کیا۔ مذاکرہ میں موجود خواتین سے انھوں نے اپیل کی کہ وہ اپنے بچوں کو ہر حالت میں اردو کی تعلیم دلائیں اور اس زبان کے فروغ میں اپنا بھرپور تعاون دیں۔ انھوں نے کہا کہ کسی بھی زبان کے الفاظ کا صحیح تلفظ اردو کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اس سے شخصیت میں وقار پیدا ہوتا ہے اور لوگ مرعوب ہوتے ہیں۔ ایکٹر شبانہ سرور نے اس موقعے پر کہا کہ اردو زبان سے ہماری تہذیب وابستہ ہے۔ اگر یہ زبان مٹ گئی تو ہماری تہذیب فنا ہوجائے گی۔ انھوں نے کہا کہ اردو زبان کو صرف اردو رسم الخط میں ہی ٹھیک سے پڑھا اور سمجھا جاسکتا ہے۔ مجلس مذاکرہ کی صدارت کرتے ہوئے محترمہ نسرین جمال نے کہا کہ اردو کا جادو ہمیشہ سے ہی سر چڑھ کر بولتا رہا ہے۔ معروف فلم اداکار ٹام آلٹر نے اردو کی وکالت کرتے ہوئے کہا کہ اردو کو ہماری ضرورت نہیں بلکہ اردو ہماری ضرورت ہے۔ جلسہ میں طوبیٰ پروین، ندا ارشد، شعیبہ تزئین، سامعہ نسرین، وردا انجم، شفق سمیت بڑی تعداد میں خواتین موجود تھیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 18 فروری 2013

مبارکپور میں جشن فیض

مبارکپور: اعظم گڑھ: فیض احمد فیض بین الاقوامی تھے جنھوں نے ظلم کے خلاف آواز بلند کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کی اور اسے بھی شاعری کی شکل میں ہی پیش کیا جس کی مثال دوسرے شعرا میں ملنا انتہائی مشکل ہے۔ فیض کی شاعری ایسی شاعری تھی جس سے ہر کوئی متاثر ہے وہ انقلابی آواز کو بھی عاشقانہ انداز میں پیش کرتے تھے۔ ان خیالات کا اظہار مبارکپور میونسپل بورڈ کے ذریعے منعقدہ تقریب جشن فیض سے خطاب کرتے ہوئے مہمان خصوصی ڈاکٹر شباب الدین صدر شعبہ اردو شبلی نیشنل پی جی کالج اعظم گڑھ نے کیا۔ تقریب سے خطاب کرتے ہوئے چیئرمین میونسپل بورڈ ڈاکٹر شمیم احمد نے کہا کہ الفاظ کو پیش کرنے کا ہنر اگر کسی کو آتا تھا تو وہ فیض تھے جنھوں نے اس طرح سے شاعری میں الفاظ کا استعمال کیا جسے پڑھ کر ہر کوئی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ فیض کے کلام سے دلوں کو سکون ملتا ہے اس لیے فیض کے کلام کو زیادہ سے زیادہ پڑھنا چاہیے۔ اس موقعے پر ڈاکٹر حنان، عالیہ خاتون، محمد شہاب، ابوزہید، سلیم اختر وغیرہ نے کلام فیض پیش کیا۔ پروگرام کی صدارت چیئرمین میونسپل بورڈ ڈاکٹر شمیم احمد نے کی جب کہ نظامت کے فرائض عامر فہیم نے انجام دیے۔ اس موقعے پر عمائدین شہر طلبہ و طالبات موجود تھے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 14 فروری 2014

غلام ربانی تاباں اور جاں نثار اختر صدی تقریب

الہ آباد: لوکر گنج میں مشہور شاعر و ادیب غلام ربانی تاباں اور جاں نثار اختر کی صد سالہ پیدائش کے موقعے پر ایک یادگاری جلسے کا اہتمام کیا گیا، جس کی صدارت ممتاز ترقی پسند ادیب و ناقد پروفیسر سید محمد عقیل رضوی نے کی۔ اس موقعے پر پروفیسر علی احمد

فاطمی نے کہا کہ غلام ربانی تاباں نے ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہ کر نمایاں طور پر سماجی خدمات انجام دی ہیں۔ انھوں نے اپنی شاعری کے حوالے سے زمانے کا دکھ درد بیان کیا ہے۔ وہ رومانی اور کلاسیکی کے بہترین شاعر تھے۔ ڈاکٹر فاضل ہاشمی نے 'جاں نثار سخن جاں نثار اختر' کے عنوان سے ایک مقالہ پیش کیا جس میں انھوں نے کہا کہ جاں نثار اختر سیاسی طور سے ترقی پسند تحریک کے رہنماؤں میں سے تھے۔ انھوں نے قومی یکجہتی کو فروغ دینے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ پروفیسر عقیل رضوی نے اپنے صدارتی خطاب میں پروفیسر علی احمد فاطمی اور ڈاکٹر فاضل ہاشمی کے مقالوں کا جائزہ لیا۔ شرکا میں ڈاکٹر سید اشفاق حسین، اسرار گاندھی، ڈاکٹر فخرالکریم، پروفیسر سنتوش بھدوریا، کرنل ابرار، سریندر راہی، تنویر زیدی، جاوید نظر، واقف انصاری، اقبال امیر، ڈاکٹر شہنواز عالم، عارفہ بیگم، حذیفہ صالحہ، نشاط کے علاوہ کثیر تعداد میں طلبا و طالبات موجود تھیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 18 فروری 2014

آگرہ میں غالب پر ادبی اجتماع

آگرہ: جب محبت کو آواز دینا ہو تو غالب کو یاد کر لیجیے، جب فلسفہ کی گہرائی میں جانا ہو تو غالب کو یاد کر لیجیے جب زندگی جینے کی آرزو ہو تو غالب کو یاد کر لیجیے اور جب زندگی سے اکتا جائیں تو غالب کو یاد کر لیجیے۔ غالب ہے تو زندگی ہے اور زندگی ہے

تو ہم ہیں۔ ان خیالات کا اظہار ماہرین غالب نے اے ایچ ایم اسکول چندن متھرا میں پیش کیے۔ اے ایچ ایم سوسائٹی کی جانب سے مرزا غالب کے یوم وفات 15 فروری کے موقعے پر ایک عظیم الشان ادبی اجتماع منعقد کیا گیا۔ یہ متھرا کی سرزمین پر مرزا غالب کی یاد میں پہلا پروگرام تھا۔ اے ایچ ایم سوسائٹی اینڈ اسکول کے بانی ڈاکٹر زید حسن نے پروگرام کا تعارف پیش کرتے ہوئے کہا کہ غالب سے ان کا عشق تقریباً 50 برس پرانا ہے۔ انھوں نے اپنی انگریزی ڈی لٹ مقالہ مرزا غالب اور انگریز شاعر جان کیٹس کا تقابلی جائزہ کے عنوان سے پیش کیا تھا۔ متھرا کے لیے یہ پہلا موقع تھا کہ جب اردو، ہندی، سنسکرت اور انگریزی کے ادبا، شعرا، اساتذہ، محققین اور مصنفین جمع ہوئے تھے۔ صدارت علامہ احمر جلیدی نے کی۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر وفا نقوی نے انجام دیے۔ اس موقعے پر ڈاکٹر محمد یونس، محترمہ جمن خورشید بیگم، عمرین حسن، زاہد انصاری، ڈاکٹر ابرار وغیرہ نے مہمانوں کا استقبال کیا۔

روزنامہ 'عزیز الہند' دہلی، 16 فروری 2014

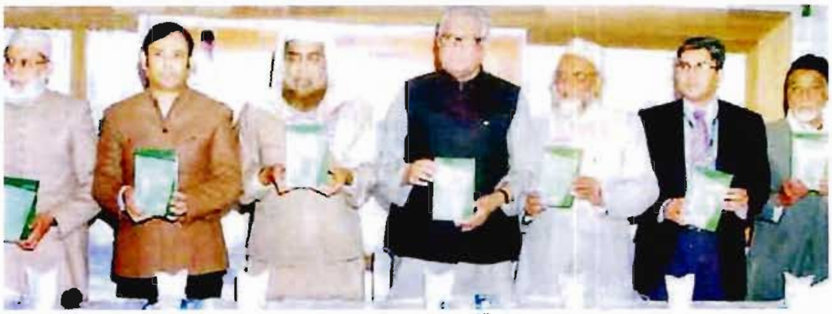

سہارنپور میں مولانا آزاد کی تعلیمی فکر پر سیمینار میں 'غبار خاطر' کے اجرا کا ایک منظر

سہارنپور میں مولانا آزاد کی تعلیمی فکر پر سیمینار

سہارنپور: امام الہند مجاہد آزادی اور ہندوستان کے پہلے وزیر تعلیم مولانا آزادؒ کے 56 ویں یوم وفات پر آواز انڈیا فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام مولانا آزاد کا تعلیمی تصور اور مسلمانوں کی تعلیم کے مسائل پر ایک سیمینار کا انعقاد کیا گیا، جس کی صدارت جامعہ مظاہر علوم کے امین عام مولانا سید شاہد الحسنی نے اور نظامت شمین زبیری اور یونس ملک نے مشترکہ طور پر کی۔ سیمینار میں ڈاکٹر عبید اقبال عاصم علیگ کی تحقیقی کتاب 'غبار خاطر' اور اس کا شعری سرمایہ کی رونمائی بھی ہوئی۔ اس موقعے پر مائنارٹی ایجوکیشن کمیشن حکومت ہند کے چیئرمین جسٹس سہیل اعجاز صدیقی نے مولانا آزادؒ کے تصور تعلیم کا احاطہ کرتے ہوئے کہا کہ مولانا آزاد اس حقیقت سے بخوبی واقف تھے کہ اسلام میں عصری و دینی علم کی تفریق نہیں ہے اور علم کے ذریعے ہی دنیا کی قیادت کی جاسکتی ہے۔ راشٹریہ سہارا اردو کے گروپ ایڈیٹر سید فیصل علی نے مولانا آزاد کے تصور تعلیم کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ مولانا آزادؒ کی فکر اس معاملہ میں واضح تھی۔ وہ عصری اور دینی تعلیم کے امتزاج کو ضروری سمجھتے تھے تاکہ دین اور دنیا کے اعتبار سے فائدہ ہوسکے۔ گوکل یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر امیر اللہ خان نے کہا کہ مولانا آزاد کا تعلیمی تصور ٹیکنیکل تعلیم اور مذہبی تعلیم کے ساتھ آرٹ، کلچر اور تمام فنون لطیفہ پر محیط ہے جس کا ثبوت ان کے قائم کردہ ادارے ہیں۔ ڈاکٹر عبید اقبال عاصم نے مولانا آزادؒ کی کتاب غبار خاطر کے 24 خطوط اور 600 فارسی اور عربی اشعار کے حوالے سے گفتگو کی اور کہا کہ مولانا آزاد کے نظریات سے اختلاف کی گنجائش ہوسکتی ہے لیکن ان کی ادبی حیثیت مسلم ہے۔ دیوبند کے سابق چیئرمین اور آل انڈیا اقتصادی کونسل کے چیئرمین حسیب صدیقی نے 'غبار خاطر اور اس کا شعری سرمایہ' کے مصنف اور کتاب کا تعارف پیش کیا۔ شرکت کرنے واظہار کرنے والی نمایاں شخصیات میں سینئر ایڈوکیٹ غیور عالم، انتخاب آزاد ایڈوکیٹ، مرزا اکبر ایڈوکیٹ، ڈاکٹر ریاض نبی، ڈاکٹر جمیل مانوی، اصغر مہدی، صفیہ صبوحی، نسرین شاہین، قاضی شوکت حسین، راحت خلیل، راؤ عبدالستار، سید وجاہت شاہ، دیوبند کے سابق چیئرمین انعام قریشی، عبداللہ عثمانی، عارف عثمانی، فہیم اختر، شاہنواز بدر، حافظ سعید احمد، ارشد علیم، حمزہ شاہد، ڈاکٹر بدر، شاہ پیر و میاں، علیم رانا، شیخ آفتاب ملی، شیخ ظہیر، پروفیسر فیاض انصاری، محمد فاروق، محسن ندوی، محمد منتظر اور مولانا زاہد شامل تھے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 26 فروری 2013

بریلی میں رضا لائبریری کا افتتاح

بریلی: شہادت گنج واقع رضا لائبریری میں ایک افتتاحی پروگرام کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت نواب ایوب حسن خاں و حاجی انجم علی ایڈووکیٹ نے کی۔ نظامت راجندر گھلڈیال نے کی جب کہ درگاہ اعلیٰ حضرت کے سجادہ نشین مولانا سبحان رضا خاں سبحانی میاں نے ربن کاٹ کر پروگرام کا آغاز کیا۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ یونیورسٹی دہلی کے سابق وائس چانسلر پروفیسر مشیر الحسن کے علاوہ

انورٹس یونیورسٹی کے وائس چانسلر امیش گوتم، نواب مجاہد حسن خاں، نبیرۂ اعلیٰ حضرت مولانا تسلیم رضا خاں، مفتی کفیل ہاشمی، ایم ایل اے ویریندر سنگھ گنگوار وغیرہ نے شرکت کی۔ مولانا تسلیم رضا خاں نے کہا کہ رضا لائبریری کا بریلی میں قیام ضروری تھا۔ انھوں نے اعلیٰ حضرت کی تعلیم وتربیت کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اعلیٰ حضرت کو ان کے علوم وفنون کی وجہ سے ہی دنیا میں جانا جاتا ہے۔ لہٰذا ان کے شہر بریلی میں اس طرح کی لائبریری کی اشد ضرورت تھی کیونکہ تعلیم سب سے اہم ہے اور کتابوں سے ہی حاصل ہوسکتا ہے۔ صدارت کرتے ہوئے انجم علی ایڈوکیٹ نے کہا کہ اعلیٰ حضرت جہاں آرام فرما رہے ہیں اس درگاہ کے آس پاس بھی غیر مسلم کی رہائش ہے اور ان پر پہلی پی ایچ ڈی بھی ایک غیر مسلم اوشا سانیال نے کی تھی۔ امام احمد رضا لائبریری کا قیام بھی ایک غیر مسلم یعنی ویریندر سنگھ گنگوار کے ہاتھوں کیا گیا۔ پروگرام کے آخر میں نواب ایوب حسن خاں نے موجودہ سبھی لوگوں کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 2 مارچ 2014

علی گڑھ نمائش میں اردو اساتذہ کا جلسہ

علی گڑھ: اترپردیش اردو ٹیچرس ایسوسی ایشن کی علی گڑھ یونٹ کے زیر اہتمام علی گڑھ نمائش کے مکت آکاش منچ پر اردو اساتذہ کے پروگرام کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت نواب مدحت اللہ خاں شیروانی نے کی۔ اس موقع پر خطاب کرتے ہوئے مہمانِ خصوصی عبداللہ گرلس ہائی اسکول کی پرنسپل آمنہ ملک نے کہا کہ اردو کسی ایک طبقے کی زبان نہیں ہے یہ وہ زبان ہے جس نے ہندوستان کو آزادی دلانے میں اہم رول ادا کیا۔ صدر جلسہ نواب مدحت اللہ خاں شیروانی نے کہا کہ اردو کے ساتھ مقامی سطح سے لے کر صوبائی سطح تک جو تفریق برتی جارہی ہے وہ سراسر غلط ہے۔ انھوں نے حکومتوں کے ساتھ ساتھ خود کو بھی اردو زبان کے گرتے گراف کے لیے ذمے دار ٹھہرایا۔ انھوں نے مزید کہا کہ حکومتیں اپنا کام کرتی ہیں لیکن ان سے کام لینا بھی ہماری ذمے داری بنتی ہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 11 فروری 2014

اتراکھنڈ:

رڑکی میں جلسۂ تقسیم اسناد کی بورڈ کو اردو کا قلم بنائیں

منگلور: شاہ ولایت گرلز ہائی اسکول کے ہال میں شاہ ولایت تعلیمی سوسائٹی کے ذریعے منعقدہ جلسۂ تقسیم اسناد برائے کمپیوٹر ڈپلوما کے موقع پر بولتے ہوئے پروفیسر ملن رانا صدر ایڈونٹسٹ کالج رڑکی نے کہا کہ آج دنیا کی ہر معلومات انٹرنیٹ پر دستیاب ہے اور انٹرنیٹ حصولِ علم کا ایک اہم ذریعہ بن گیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ یہ ڈپلوما نوجوانوں کو زندگی میں آگے بڑھنے کے لیے ایک گیٹ وے کا کام کرے گا۔ انھوں نے فارغین کو مبارکباد بھی پیش کی۔ پروفیسر تنویر چشتی (ممبر پلاننگ کمیشن) نے اپنے صدارتی خطبہ میں کہا کہ دورِ جدید کا قلم کمپیوٹر کا کی بورڈ ہے، انھوں نے مزید وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ اب کرۂ ارض پر انسانوں کی ڈیجیٹل تقسیم کا عمل شروع ہوگیا ہے۔ ایک طرف وہ لوگ ہیں جو کمپیوٹر نہیں جانتے۔ انھوں نے زور دے کر کہا کہ اب تعلیم کا تصور کمپیوٹر کے بغیر نامکمل ہے۔ انھوں نے طلبہ کو مشورہ دیا کہ وہ تمام تر مادی وسائل کو بروئے کار لاکر ترقی کریں، لیکن اخلاقی اور روحانی قدروں کو اپنا کر ہی آگے بڑھیں۔ سافٹ ویئر انجینئر تابش چشتی نے کہا کہ قومی کونسل برائے فروغ اردو نے نائٹ کے اشتراک سے ایک طرف نوجوانوں کو روزگار سے جوڑا اور دوسری طرف اردو کو آئی ٹی سے جوڑ کر محبانِ اردو پر احسان کیا۔ انھوں نے کہا کہ اردو پیڈیا اور نئے اردو فونٹس کا اضافہ کرکے این سی پی یو ایل نے اردو کو آئی ٹی کی زبان بنا دیا۔ کون بنے گا کروڑ پتی کی انعام یافتہ محترمہ فاطمہ نے فارغین ڈپلوما کی تعداد میں لڑکیوں کی خاصی تعداد پر اطمینان کا اظہار کیا اور کہا کہ جس قوم میں خواتین کی شرح خواندگی زیادہ ہوگی وہی قوم صحیح معنی میں ترقی یافتہ کہلانے کی حقدار ہے۔ مولانا آفتاب اظہر کشن گنجوی نے اپنے خطاب میں کہا کہ قرآن عظیم اور آقائے نامدارؐ کی تمام تعلیمات کا مقصد ومحور سیکھنا اور سکھانا نیز توسیع علم ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 15 فروری 2014

بہار:

پٹنہ یونیورسٹی میں صالحہ عابد حسین پر سیمینار

پٹنہ: شعبہ اردو پٹنہ یونیورسٹی کے زیر انتظام منعقدہ دوروزہ قومی سیمینار کے اختتامی اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے ناقد اور افسانہ نگار ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نے کہا کہ اس سیمینار سے صالحہ عابد حسین کی فکر، تانیثیت اور خواتین کی خدمات کو سمجھنے کی جو ایماندارانہ کوشش ہوئی ہے وہ قابل تعریف ہے۔ انھوں نے سیمینار میں طلبا وطالبات اور ریسرچ اسکالر کی شمولیت کو قابل تحسین بتایا۔ اس دو روزہ اجلاس میں ڈاکٹر جاوید حیات، ابومنور گیلانی، ڈاکٹر ریحانہ سلطانہ، ڈاکٹر اشرف جہاں نے صدارت کے فرائض انجام دیے۔ ڈاکٹر محبوب اقبال، مولانا نورالسلام ندوی اور رحمت یونس نے بخوبی نظامت کی ذمے داری نبھائی۔ ابومنور گیلانی نے کہا کہ صالحہ عابد حسین فکشن کی دنیا کا بہت بڑا نام ہے مگر اس کو نظرانداز کیا گیا۔ ان کی تخلیقات پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ "میں نے جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے" ایسی شخصیت پر یہ سیمینار اس اردو ادیبہ اور فکشن نگار کو سمجھنے میں سنگ میل ثابت ہوگا۔ سیمینار کے آرگنائزنگ سکریٹری ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی نے اپنی رپورٹ پیش کی اور دوروزہ سیمینار کی تفصیلات پیش کرتے ہوئے بتایا کہ اس میں قومی سطح کے ادیبوں اور دانشوروں کے ساتھ ساتھ ریسرچ اسکالر اور طلبا وطالبات کے تقریباً پچاس مقالات پڑھے گئے۔ انھوں نے تمام مہمانوں کا صمیم قلب سے شکریہ ادا کیا اور کہا کہ عنقریب تمام مقالات کو کتابی شکل دی جائے گی۔ ڈاکٹر صفدر امام قادری نے اپنے خطاب میں کہا کہ آخری اجلاس تک شرکا نے جس دل جمعی اور انہماک کے ساتھ جمے رہے، یہ اس بات کی علامت ہے کہ اردو زندہ ہے اور بہار اس کا مرکز ہے۔ انھوں نے شہاب ظفر اعظمی کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ آپ واقعتاً 'شہاب' ہیں۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 24 فروری 2014

دربھنگہ میں مولانا آزاد کی نثر پر سیمینار

دربھنگہ: مولانا ابوالکلام آزاد اصطلاحی معنوں میں کوئی ایسے فلسفی نہیں تھے جس نے باقاعدہ فلسفہ کا کوئی مرتب نظام وضع کیا ہو اور نہ انھوں نے فلسفیانہ موضوعات پر باقاعدہ کوئی کتاب چھوڑی ہے لیکن ان کی ادبیات کے مطالعہ سے یہ حقیقت اجاگر ہوتی ہے کہ وہ ہندوستانی قدیم علوم وفلسفہ کا گہرا درک رکھتے تھے اور ان کی تحریروں میں فلسفیانہ عناصر زریں لہروں کی طرح پوشیدہ ہیں۔ ان خیالات کا اظہار اردو کے معروف ناقد ڈاکٹر مجاہد الاسلام (لکھنؤ) نے کیا۔ ڈاکٹر مجاہد مقامی ملت کالج، دربھنگہ میں یوجی سی اور بہار اردو اکادمی، پٹنہ کے جزوی مالی تعاون سے منعقد دو روزہ قومی سیمینار مورخہ 12-13 فروری 2014 بہ عنوان 'مولانا ابوالکلام آزاد کی نثر میں فلسفیانہ عناصر' کے اختتامیہ اجلاس سے خطاب کررہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ مولانا آزاد ہمارے درخشاں ماضی کے آفتاب ہیں مگر افسوس ہے کہ ہمارا حال ان کی ضیاپاشیوں سے محروم ہیں۔ اپنے تاثراتی بیان میں پروفیسر افتخار احمد (کولکاتا) نے کہا کہ مولانا آزاد نے دنیا کے تمام علوم و فنون کو کچھ اس طرح اپنی تحریروں میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے کہ ایک کوزے میں دریا سمو دیا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کی تحریروں کو حقیقتوں کی

نقاب کشائی کے لیے ادبیاتِ آزاد کا سنجیدگی سے مطالعہ کیا جائے۔ ڈاکٹر ناصر حسین (علی گڑھ) نے کہا کہ ملت کالج کا یہ سیمینار آزاد شناسوں کے لیے ایک بیش بہا خزانہ ثابت ہوگا۔ جب مقالات کتابی صورت میں شائع ہوں گے۔ پروفیسر گوپی رمن پرساد سنگھ (دربھنگہ) نے کہا کہ مولانا آزاد کے افکار و نظریات عظمتِ انسانیت کا آئینہ ہیں کیوں کہ ان کے سماجی افکار و نظریات صالح سماج کی تشکیل میں معاون ہیں اور انسان کی عظمت کا اعتراف کرتے ہیں۔ وہ مذہب انسانیت کے پیکر ہیں اور ان کے فکری اثاثے ہمارے لیے باعثِ سکون ہیں۔ اختتامیہ اجلاس کے صدر ڈاکٹر مشتاق احمد، پرنسپل کالج ہٰذا نے تمام مقالہ نگاروں کے تئیں اظہارِ تشکر پیش کرتے ہوئے کہا کہ گزشتہ دو دنوں سے کالج میں مختلف موضوعات کے دانشوروں کا اجتماع ہمارے لیے باعثِ افتخار ہے اور ان دانشوروں نے جو خیالات پیش کیے ہیں وہ ہم لوگوں کے لیے چشم کشا ہیں۔ روزنامہ 'عزیز الہند' دہلی، 14 فروری 2014

مناظر عاشق ہرگانوی کی نئی کتاب 'لسانی لغت'

دربھنگہ: کہنہ مشق شاعر و ادیب ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کی نئی کتاب 'لسانی لغت' (غازی علم الدین کے حوالہ سے) کا اجرا ڈاکٹر عبدالمنان طرزی، پروفیسر منصور عمر، ڈاکٹر مظفر مہدی، ڈاکٹر منصور خوشتر اور ڈاکٹر شمیم احمد باردی نے مشترکہ طور پر ڈاکٹر آفتاب حسین کمپلیکس سبھاش چوک دربھنگہ واقع المنصور ایجوکیشن اینڈ ویلفیئر ٹرسٹ دربھنگہ دفتر میں ایک سادہ تقریب کے دوران کیا۔ اس موقعے پر کتاب کی خصوصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے مصنف نے بتایا کہ ہم نے اپنی کتاب میں اردو الفاظ کی تشکیل، ادائیگی الفاظ، الفاظ کی تخریج، اغلاط العوام اور لفظوں کی تاریخ جیسی چیزوں کا احاطہ کیا ہے اس لیے لسانی لغت اردو زبان و ادب کے طالب علم، اساتذہ اور فنکار تمام طبقات کے لوگ یکساں طور پر مفید ہوگی۔ انھوں نے کہا کہ عام طور پر اس وقت لوگ الفاظ کی ادائیگی میں صحت کا خیال نہیں رکھتے ہیں۔ اور پڑھے لکھے لوگ بعض فاش غلطیاں کر جاتے ہیں۔ یہ کتاب انھیں جیسے الفاظ کی رہنمائی کرے گی اور صحیح تلفظ کی ادائیگی پر راغب کرے گی۔ کتاب کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے صدرِ نشست ڈاکٹر عبدالمنان طرزی نے کہا کہ مناظر عاشق ہرگانوی ہمہ گیر شخصیت کے مالک ہیں اور انھوں نے اب تک 157 کتابیں تحریر کی ہیں۔ یہ ساری کتابیں انتہائی اہمیت کی حامل ہیں۔ لسانی لغت ان میں خاص انفرادیت رکھتی

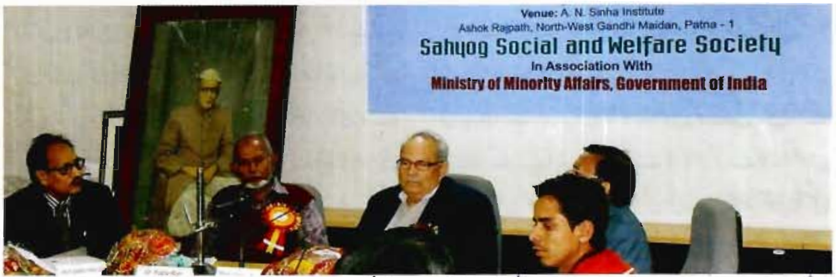

پٹنہ میں یک روزہ سیمینار میں اسٹیج پر پروفیسر قمر احسن، ڈاکٹر فضل رب، پروفیسر صفدر امام قادری و دیگر

ہے۔ اس موقعے پر مشہور ناقد ڈاکٹر منصور عمر نے اپنے تاثرات میں اعتراف کیا کہ نئی کتاب ڈاکٹر مناظر کی بے پناہ علمی کھوج بین کا حسین مرقع ہے اس کی اشاعت پر وہ بجا طور پر مبارکباد کے حقدار ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اب تک اردو زبان میں اس موضوع پر کوئی کتاب نہیں لکھی گئی تھی، مناظر عاشق ہرگانوی نے اس کمی کو دور کردیا ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ یہ نہ صرف انفرادی طور پر مراجعہ کی جائے گی بلکہ نصاب میں بھی داخل ہوگی۔ انھوں نے توقع ظاہر کی کہ یہ کتاب طلبہ و اساتذہ اور اردو زبان و ادب کے شائقین کے لیے شمع راہ ہوگی۔ روزنامہ 'قومی تنظیم' پٹنہ، 12 فروری 2014

بہار اور جھارکھنڈ میں مسلم اقلیت کی سماجی، معاشی اور تعلیمی ترقی پر ایک روزہ قومی سیمینار

پٹنہ: سہیوگ سوشل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی پٹنہ نے اے این سنہا انسٹی ٹیوٹ میں وزارت اقلیتی امور، حکومت ہند کے اشتراک سے بہار اور جھارکھنڈ میں مسلم اقلیت کی سماجی، معاشی اور تعلیمی ترقی وزارت اقلیتی امور کی اسکیموں کا اثر کے عنوان سے یک روزہ سیمینار کا انعقاد کیا۔ سیمینار کا آغاز سہیوگ سوشل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی پٹنہ کے صدر جناب ارشد ظفر خاں کے خیر مقدمی کلمات کے ساتھ ہوا، جس میں انھوں نے بہار و جھارکھنڈ کی مسلم اقلیت میں سماجی، معاشی اور تعلیمی شعبے میں بیداری کی ناگزیریت کا خلاصہ کیا۔ سابق وائس چانسلر پروفیسر قمر احسن نے افتتاحی سیشن کی صدارت کرتے ہوئے کہا کہ یہ ایک انتہائی اہم موضوع کا انتخاب کیا ہے جو وقت کی اہم ضرورت ہے۔ انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ مسلم اقلیتی طبقہ میں لیڈرشپ کی کمی ہے جس کی وجہ سے ملکی سطح پر مسلمانوں کی زبوں حالی نظر آتی ہے۔ مہمان ذی وقار کی حیثیت سے ڈاکٹر فضل رب نے شرکت کی اور اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ مسلمانوں کو حکومت پر انحصار کو ترک کرنا ہوگا اور منظم طریقے سے اپنے مسائل کے حل کی تلاش کرنی ہوگی۔ پروفیسر صفدر امام قادری نے اپنے کلیدی خطبہ میں خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ملک میں مسلمانوں کی آبادی پندرہ کروڑ بتائی جاتی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ فی الوقت مسلم اقلیتی طلبہ کی تعداد پانچ کروڑ سے زائد ہوں گے۔ لیکن ان کی حالت خاص طور پر جھارکھنڈ اور بہار میں نہایت ہی افسوس ناک ہے۔ افتتاحی سیشن کی صدارت ڈاکٹر فضل رب نے کی۔ اس اجلاس میں ڈاکٹر قاسم خورشید، ڈاکٹر علاء الدین، جناب فیروز انصاری، ڈاکٹر سید رضا اور جناب نیرج کمار نے مقالے پیش کیے۔ مقالہ نگاروں نے بنیادی طور پر مسلم اقلیت کی معاشی، سماجی اور تعلیمی پسماندگی کے اسباب و عوامل پر تفصیلی گفتگو کی اور ان کے لیے حکومت کی متعدد ترقیاتی اور فلاحی اسکیموں پر روشنی ڈالی۔ دوسرے اور تیسرے اجلاس میں جناب سید فرید احمد، ڈاکٹر سید رضا، محمد فیروز انصاری، ڈاکٹر امتیاز عالم اور ڈاکٹر ثریا جبیں سے محترمہ نشاط پروین، محمد سیف الانصاری، محترمہ نذرانہ خاتون، محمد فیروز عالم، جناب سندیپ کمار اور ڈاکٹر شاہد اختر انصاری نے اپنے مقالے پیش کیے۔ دوسرے اور تیسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر صفدر امام نے کی۔ نائب صدر ڈاکٹر شاہد اختر نے اظہارِ تشکر کے موقعے پر کہا کہ سہیوگ سوشل ویلفیئر سوسائٹی کے اس سیمینار کا مقصد ایک خاص نکتہ پر افہام و تفہیم کی راہ ہموار کرنا تھا تاکہ سماجی طور پر پسماندہ اقلیت طبقے کے پسماندگی کی وجوہات کا پتہ چلے اور اسے دور کرنے کی راہیں نکالی جاسکیں۔ پروگرام کو کامیاب بنانے میں آفاق احمد اور شکیب جمال نے اہم کردار ادا کیا۔ پروگرام کی نظامت نازیہ امام نے کی۔

پریس ریلیز، نذر الاسلام، پٹنہ، 23 فروری 2014

اردو ریسرچ اسکالرز کا تربیتی پروگرام

پٹنہ: آج ہماری توجہ اس موضوع سے ہونی چاہیے کہ ہم اپنی یونی ورسٹیوں میں تعلیم اور تحقیق کے معیار کو بلند کریں۔ اس کے بغیر ہم اپنے کھوئے ہوئے تعلیمی وقار کو حاصل نہیں کرسکتے۔ ایک معروضی نقطۂ نظر اور سائنسی فکر کو ذہن و دل کا حصہ بنائے بغیر کوئی طالب علم تحقیق کے سفر کا راہی نہیں ہوسکتا۔ انجمن ترقی اردو، بہار کے زیر اہتمام

سنٹرل انسٹی ٹیوٹ آف انڈین لینگویجز، میسور کے اشتراک سے شمالی ہندوستان کی تیرہ یونیورسٹیوں کے اردو کے ریسرچ اسکالرز کی ایک پانچ روزہ تربیتی پروگرام کا افتتاح کرتے ہوئے پٹنہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر نے مذکورہ باتیں کہیں۔ پروفیسر سیمادری نے انگریزی میں تقریر کرتے ہوئے اردو زبان کی شرینی اور مقبولیت کے بارے میں اپنے خیالات ظاہر کیے۔ انھوں نے کہا کہ اردو کے طلبہ و طالبات کو سائنس اور سماجی سائنس میں استعمال کیے جانے والے اصول وضوابط سے بھی مقدور بھر فائدہ اٹھانا چاہیے۔ انجمن ترقی اردو بہار کے سکریٹری، عبدالقیوم انصاری نے اپنے استقبالیہ خطاب میں مشرقی ہندوستان کے پچاس منتخب ریسرچ اسکالروں کے اجتماع کو دس کروڑ آبادی کا نمائندہ قرار دیا اور کہا کہ یہ سب سے ذہین اور روشن دماغ افراد ہیں اور قوم کے مستقبل کا انہی پر انحصار ہے۔ افتتاحی تقریب کی صدارت مولانا مظہرالحق عربی و فارسی یونیورسٹی، پٹنہ کے وائس چانسلر پروفیسر اعجاز علی ارشد نے کی۔ انھوں نے یونی ورسٹیوں میں اردو مضمون میں ریسرچ کے سلسلے میں گرتے ہوئے معیار پر تشویش کا اظہار کیا۔ معروف محقق، رباعی نگار اور ظریفانہ شاعر ڈاکٹر ظفر کمالی نے تحقیق کی تعریف کرتے ہوئے قاضی عبدالودود کے اقوال کا جائزہ لیا اور بتایا کہ یہ کام خاص انہماک اور ذمے داری کا ہے۔ ابتدائیہ کلمات میں پروفیسر صفدر امام قادری نے بتایا کہ اردو کے نئے تحقیقی کاروں کو دوران تحقیق متعدد طرح کے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ انھیں تحقیق کے باریک نکات اور بنیادی سوالوں سے ٹھیک طریقے سے روشناس نہیں کرایا جاتا ہے۔ اس کے سبب یونی ورسٹیوں میں معیار تحقیق مجروح ہو رہا ہے۔ اس لیے یہ تربیتی پروگرام منعقد کیا گیا ہے جس میں ریسرچ اسکالرس اپنے ماہرین سے اصولیاتِ تحقیق اور اطلاق کے مختلف پہلوؤں پر تفصیلی گفتگو کرسکیں۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی 7 فروری 2014

جموں کشمیر:

اردو کو ہندی کے برابر درجہ دینے کا مطالبہ

راجوری: اردو زبان کو ہندوستان میں ہندی کے برابر کا درجہ دینے کے حوالے سے ملک کے اہم دانشوروں سے رائے لینے کی غرض سے تحریک بقائے اردو کے وفد نے دہلی پہنچ کر غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی کے سکریٹری کے علاوہ ملک کے نامور ادبا سے ملاقات کی ہے اور اس کے علاوہ اردو کی ترقی و ترویج پر تبادلۂ خیال کیا ہے۔ تحریک کے ترجمان و مرکزی جنرل سکریٹری ذاکر ملک بھلیسی کی طرف سے جاری پریس بیان میں کہا گیا ہے کہ تحریک کے سرپرست فاروق شاہ بخاری نے حال ہی میں تنظیم کے صدر عرفان علی عارف کی سربراہی میں ایک ٹیم تشکیل دے کر دہلی روانہ کی تھی جس میں سینئر نائب صدر ڈاکٹر جاوید انور بھی شامل تھے۔ اس وفد نے دہلی میں اردو ادیبوں و دانشوروں سے تبادلہ خیال کیا۔ تحریک بقائے اردو نے ان ادبا و دانشوروں سے رائے طلب کی کہ ہندوستان میں اردو کو ہندی کے برابر کا درجہ کیوں نہیں دیا جاسکتا ہے جب کہ یہ زبان ایک ہی ماں کی بیٹیاں ہیں اور ایک ہی گھر میں پیدا ہوئی ہیں۔ عرفان عارف نے اس موقعے پر تحریک بقائے اردو کے لیے دہلی یونیورسٹی میں اپنی شاخ قائم کی جس میں ڈاکٹر علی اکبر کو سربراہ، ڈاکٹر مشتاق قادری کو صدر، بہار کے ڈاکٹر مظفر الحسن کو سکریٹری، ابرار علی شاہ کو جوائنٹ سکریٹری اور سید محمد قمر کو پروگرام منیجر منتخب کیا ہے۔ عرفان عارف نے سرپرست فاروق شاہ بخاری کا شکریہ ادا کیا ہے۔ روزنامہ 'سیاسی تقدیر' دہلی، 28 فروری 2014

کرناٹک:

بیدر میں اردو صحافیوں کے مسائل پر جلسہ

بیدر: اردو جرنلسٹ ایسوسی ایشن بیدر کا ایک ہنگامی مشاورتی اجلاس کا انعقاد عمل میں آیا۔ جس کی صدارت صدر ایسوسی ایشن شاہ سعید الحسن قادری مدیر ادبی عکاس بیدر نے کی، اس اجلاس میں ارکان عاملہ نے شرکت کرکے ایسوسی ایشن ہذا کی جانب سے اردو کے تحفظ 'حقوق' اور اس کے فروغ کے ساتھ ساتھ اردو صحافیوں کو درپیش مسائل پر تبادلہ خیال کیا گیا۔ سب سے اہم بات یہ رہی کہ ضلع انتظامیہ میں سرکاری امور کے احکامات کا اردو ترجمہ اور اردو میں درخواست لینے اور اس کا اردو میں جواب دینے کے لیے جو نمائندگی کی گئی تھی اس پر موثر عمل آوری کے لیے ضلع انتظامیہ نے منظوری دے دی ہے۔ اس کے علاوہ محکمہ پولیس میں بھی اسی طرح کی نمائندگی عمل میں آئی چنانچہ پولیس کے محکمہ پی ایس پی میں آج تک اردو اخبارات کی خبروں کے تراشے کنڑا میں ترجمہ کرکے متعلقہ اعلیٰ عہدے داروں کو روانہ کیے جارہے ہیں۔ ایسوسی ایشن ہذا نے بہ اتفاق رائے حکومتِ کرناٹک سے اظہارِ تشکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ وزیر اعلیٰ مسٹر سدارامیا نے صحافیوں کے مسائل کو محسوس کرتے ہوئے وظائف میں جو اضافہ کیا ہے قابلِ قدر اقدام ہے اور اس ضمن میں ریاستی وزیر اطلاعات آر روشن بیگ کی بھی ستائش کرتی ہے کہ جنھوں نے وزارت کا عہدہ سنبھالتے ہی اردو صحافت کے مسائل کو حل کرنے کا عہد کیا ہے اور ڈائریکٹر دفتر میں اردو سیکشن اور ضلعی دفتر میں اردو مترجم کی سہولت فراہم کرنے کے لیے انھوں نے جو وعدہ کیا ہے۔

روزنامہ 'جدید خبر' دہلی، 20 فروری 2014

بنگلور میں 'محفل نسا' کا یوم اردو

بنگلور: محفل نسا بنگلور نے 10 فروری کو جشن یوم اردو منعقد کیا۔ اس موقع پر 'اردو ستاروں کی کھوج' کے نام سے محفل کے منعقد کردہ انعامی مقابلوں کے انعامات کی تقسیم اور 'محمود ایاز ایوارڈ' برائے اردو خدمات، 'ممتاز شیریں ایوارڈ' برائے اردو فن کار اور 'روشنی ایوارڈ' برائے ابھرتے ہوئے نوخیز اردو فن کار کے لئے تقسیم انعامات کا اہتمام کیا گیا۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی سابق ڈائرکٹر ڈاکٹر فہمیدہ بیگم نے اردو زبان کی ہمہ جہت ترقی کے لیے اردو سے جڑے افراد اور اداروں کو آواز دی۔ جناب عزیز اللہ بیگ آئی اے ایس نے کرناٹکا کے اردو آبادی والے علاقوں میں اردو زبان کو دوسری سرکاری زبان بنائے جانے کی ضرورت پر زور دیا۔ یوم اردو کے اس یادگار جشن کے مہمان خصوصی عالی جناب نصیر احمد ایم، ایل، سی، نے اپنے پرمغز خطاب میں کہا کہ اہل اردو کو ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے نہ رہنے اور اپنی اپروچ کو بدلنے کا مشورہ دیا۔ محفل نسا کی صدر ڈاکٹر شائستہ یوسف نے اپنے صدارتی خطاب میں اردو سے جڑے ہر فرد اور ہر ادارے سے پرزور اپیل کی کہ یہ کام صرف ایک انجمن یا ایک فرد کا نہیں بلکہ ہر اردو والے کا ہے۔ اس تقریب کے آخر میں ڈاکٹر کوثر پردین سکریٹری محفل نسا شاخ گلبرگہ نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

پریس ریلیز، زبیدہ بیگم، نائب صدر محفل نساء، بنگلور، 15 فروری 2014

مہاراشٹر:

علامہ شبلی کی فارسی خدمات پر سیمینار

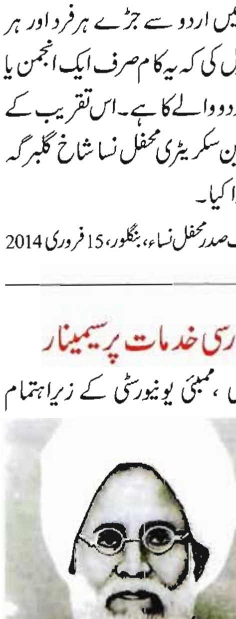

ممبئی: شعبۂ فارسی، ممبئی یونیورسٹی کے زیراہتمام علامہ شبلی نعمانی کی وفات کی صد سالہ تقریب کے موقعے پر دو روزہ قومی سیمینار 'علامہ شبلی اور ان کی فارسی خدمات' کے موضوع پر 24-25 فروری 2014 کو جے پی نائیک بھون ممبئی یونیورسٹی سانتا کروز،

ممبئی میں منعقد کیا گیا، جس میں ہندوستان کے ادبا اور دانشوروں نے شرکت کی۔ سیمینار کا افتتاحی اجلاس 24 فروری کو شروع ہوا۔ جس میں مہمان خصوصی کے طور پر پدم شری ڈاکٹر محمود الرحمٰن (سابق وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) نے شرکت کی اور اپنے خطبے میں شبلی کی فارسی تخلیقات پر بحث کرتے ہوئے کہا کہ شعرالعجم کو ہندوستان اور ایران کی فارسی ادبیات میں درجۂ اول کا مقام حاصل ہے اور اس کتاب میں شبلی شعر فہمی پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہے، جب کہ کلیدی خطبے میں پروفیسر شریف حسین قاسمی (سابق صدر شعبۂ فارسی، دہلی یونیورسٹی) نے کہا کہ شعرالعجم اردو کی واحد کتاب ہے جس کا ترجمہ فارسی زبان میں ہوا۔ انھوں نے شبلی کو انیسویں اور بیسویں صدی کی ایک عبقری اور کثیرالجہات شخصیت قرار دیتے ہوئے کہا کہ شبلی کی شخصیت کو نکھارنے میں مولانا فاروق چریا کوٹی اور پروفیسر آرگن نے اہم کردار ادا کیا اور یہ بھی کہا کہ فارسی شاعری میں شعرالعجم تنقیدی رویے کی پہلی کتاب ہے۔ پروفیسر قاسمی نے شعرالعجم کے حوالے سے شبلی کے شاعرانہ اسلوب کا ذکر کرتے ہوئے انھیں ایک مسرت بخش شاعر قرار دیا۔ پروفیسر جوگ ڈنڈ کارگزار صدر شعبۂ فارسی اور ڈین فیکلٹی آف آرٹس نے مہمانوں کی خدمت میں گلہائے عقیدت پیش کر کے ان کا استقبال کیا جب کہ ڈاکٹر سکینہ امتیاز خان (ڈائرکٹر آف سیمینار) نے مہمانوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ شعبۂ فارسی، ممبئی یونیورسٹی کو یہ اولیت حاصل ہے کہ شبلی کی صد سالہ وفات کے موقعے پر ہندوستان کی کسی بھی یونیورسٹی کے تحت ہونے والا یہ پہلا سیمینار ہے جس پر انھوں نے اپنی مسرت کا اظہار کیا۔ دوسرے دن کے اجلاس میں کل دس مقالے پڑھے گئے۔ صدور کے فرائض ابوصالح انصاری، ڈاکٹر خورشید نعمانی اور ڈاکٹر زینت اللہ جاوید نے انجام دیے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 27 فروری 2014

اردو گھر کا سنگ بنیاد

ناندیڑ: ریاست مہاراشٹر کے پہلے 'اردو گھر' (اردو کمپلیکس) کا سنگ بنیاد یہاں سابق وزیر اعلیٰ اشوک چوہان کے ہاتھوں رکن پارلیمنٹ و نامور کرکٹر اظہرالدین کی موجودگی میں ریاست کے ناندیڑ شہر میں عمل میں آیا۔ اس موقعے پر وزیر اقلیتی بہبود محمد عارف نسیم خان نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ حکومت نے ریاست کے چھ اضلاع میں اس قسم کے اردو گھر کے قیام کا فیصلہ کیا ہے اور انھیں مسرت ہو رہی ہے کہ اس کام کی پہل اردو زبان کے لیے ایک زرخیز علاقے ناندیڑ سے کی جا رہی ہے۔ نیز حکومت ریاست میں اردو کی ترقی و ترویج کے لیے ہر ممکن قدم اٹھائے گی۔ سابق وزیر اعلیٰ اشوک چوہان نے بھی اس موقعے پر سلیس اردو لہجے میں اردو کے مختلف اوصاف بیان کرتے ہوئے کہا کہ مجھے اس بات کا فخر ہے کہ میرے آنجہانی والد شنکر راؤ چوہان نے وزیر اعلیٰ کے عہدے پر فائز ہونے کے وقت ملک کی پہلی اردو اکادمی مہاراشٹر میں قائم کی تھی جب کہ ملک کے پہلے اردو گھر کا سنگ بنیاد ان کے ہاتھوں ہی رکھا جا رہا ہے۔ جو بڑی فخر کی بات ہے۔ عالمی شہرت یافتہ کرکٹر ممبر پارلیمنٹ محمد اظہرالدین نے بھی اس موقعے پر حیدرآبادی لہجہ میں تقریر کی اور ریاستی حکومت کو اردو گھر کے سنگ بنیاد رکھنے پر مبارکباد بھی پیش کی اور مسلم نوجوانوں سے درخواست کی کہ وہ اپنے فالتو اوقات کو کھیل کود میں صرف کریں تاکہ ان کی تندرستی قائم رہے۔ سابق وزیر انیس احمد، مقامی رکن پارلیمنٹ بھاسکر راؤ کھانگا، اوم پرکاش پوکر، مقامی رکن اسمبلی امرناتھ راجولکر میئر عبدالستار عبدالغفور، ذاکر چاؤس، صدر اقلیتی سیل، ایڈوکیٹ عبدالرحمٰن صدیقی، اور دیگر افراد بھی اس موقعے پر موجود تھے۔ روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 19 فروری 2014

اردو قوموں کو جوڑنے والی زبان: شنڈے

شولاپور: اردو قوموں کو جوڑنے والی زبان ہے، اس کی پرورش ہمارے ملک میں ہوئی اور یہ مہاراشٹر سمیت ملک کے ایک سے زیادہ خطوں میں پروان چڑھی اور آج اس کی شہرت اور مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ پوری دنیا میں یہ رابطے کی ایک کڑی بن کر ابھر رہی ہے۔ ان خیالات کا اظہار مرکزی وزیر داخلہ شُشیل کمار شندے اور مہاراشٹر کے شولاپور شہر میں ریاست کے اقلیتی امور وزیر نسیم نے ریاست کے دوسرے اردو گھر اور اقلیتی طالبات کے لیے گرلز ہاسٹل کے سنگ بنیاد رکھنے کے موقعے پر کیا۔ انھوں نے کہا کہ شولاپور شہر میں اردو گھر کے قیام سے ریاست میں اردو کو فروغ حاصل ہوگا اور ساتھ ہی ساتھ 100 بیڈ والے گرلز ہاسٹل قائم ہونے سے اقلیتی طلبا کو ایسے مواقع دستیاب ہوں گے کہ پرسکون ماحول میں تعلیم حاصل کر سکیں گے۔ نسیم خان نے کہا کہ اردو ملک کی تہذیب ہے۔ یہ زبان مسلمانوں میں مقبول ہے لیکن انھیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ یہ امن و امان اور قوموں کو ایک دوسرے سے جوڑنے والی زبان ہے۔ مرکزی وزیر داخلہ کی دختر اور خوب سور مقامی رکن اسمبلی پرینتی شنڈے نے شستہ اردو لہجے میں تقریر کی اور کہا کہ مجھے اس بات کا فخر ہے کہ میں شُشیل کمار شنڈے کی دختر ہوں اور اس بات کا بھی فخر ہے کہ جس زبان کی ترقی و ترویج کی عمارت کا آج سنگ بنیاد رکھا گیا ہے وہ اس ملک کی بیٹی ہے۔ مقامی رکن اسمبلی دلیپ مانے، کانگریس لیڈر چندکانت، اور اردو اکادمی کے چیئرمین خورشید صدیقی، جوائنٹ سکریٹری عین العطار اور دیگر افراد موجود تھے۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 4 مارچ 2014

مغربی بنگال:

انجمن ترقی اردو بنگال کا اردو کنونشن

کولکاتہ: سابق مرکزی وزیر و ممبر پارلیمنٹ سلطان احمد نے کہا ہے کہ اہل اردو کو اردو کی بقا کے لیے خود اپنی لڑائی لڑنی ہوگی۔ انجمن ترقی اردو ہند مغربی بنگال کی جانب سے منعقد اردو کنونشن سے خطاب کرتے ہوئے مرکزی وزیر سلطان احمد نے کہا ہے کہ ترنمول کانگریس کے اقتدار میں آتے ہی اردو کو سرکاری زبان کا درجہ دے دیا گیا اور اس کے لیے اسمبلی میں لنگویج ایکٹ میں بھی تبدیلی کر کے قانونی درجہ دیا گیا مگر اردو کے فروغ کے لیے ابھی بہت کچھ کیا جانا باقی ہے۔ انھوں نے کہا کہ صرف کاغذی سطح پر سرکاری زبان کا درجہ مل جانے سے کسی بھی زبان کا فروغ نہیں ہوتا ہے بلکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو کے فروغ کے لیے جدوجہد کرنے والے اردو کے نفاذ کے لیے عملی جدوجہد کریں۔ سلطان احمد نے اردو کے فروغ کے لیے انجمن ترقی اردو کے مطالبات کی حمایت کرتے ہوئے یہ یقین دہانی کرائی ہے کہ وہ انجمن ترقی اردو کو ہر ممکن تعاون کرنے کو تیار ہیں۔ سابق مرکزی وزیر سلطان احمد نے کہا کہ بایاں محاذ کے دور میں اردو اکادمی کا سالانہ بجٹ محض چند لاکھ تھا مگر ممتا بنرجی نے اکادمی کے بجٹ میں تین کروڑ مقرر کیا اور امید ہے کہ اگلے بجٹ میں اکادمی کا بجٹ 8 کروڑ کر دیا جائے گا۔ مغربی بنگال کے ریاستی وزیر جاوید احمد خان نے یہ اعتراف کیا کہ بنگال میں ابھی اردو کو صرف کاغذی سطح پر ہی سرکاری زبان کا درجہ ملا ہے۔ مگر عملی سطح پر ابھی بہت ہی کام باقی ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 17 فروری 2014

کلکتہ یونیورسٹی میں عربی فارسی کی اہمیت پر سیمینار

کلکتہ: اس سچائی کے یقین کے بعد کے عربی و فارسی زبانیں کوئی غیر ملکی زبانیں نہیں ہے بلکہ ان دونوں زبانوں کا ہندوستان سے تعلق ماقبل تاریخ سے ہے۔ اس لیے یو پی ایس سی سے عربی و فارسی زبان کو نکالنا ایک بڑی

ناانصافی ہے۔ کشن گنج کے ایم پی و آل انڈیا تعلیمی و ملی فاؤنڈیشن کے صدر مولانا اسرارالحق قاسمی نے کلکتہ یونیورسٹی میں 'ہندوستان میں عربی و فارسی کی شاعری' کے عنوان سے منعقد دو روزہ سیمینار کے افتتاحی سیشن میں واضح لفظوں میں کہا کہ عربی و فارسی کو غیرملکی زبان قرار دے کر اس کو ختم کرنے کی کوشش کرنے والے ہندوستانی تہذیب و کلچر سے ناواقف ہیں۔ مولانا نے کہا کہ تاریخ بنائی نہیں جاتی ہے بلکہ بنتی ہے۔ ہندوستان کی تاریخ بھی یہی ہے کہ یہاں کی زبانوں اور کلچر نے عربی و فارسی زبان سے استفادہ کیا ہے۔ آج اگر اردو زبان کو شیریں زبان کا درجہ دیا جاتا ہے تو وہ بھی عربی و فارسی کی دین ہے۔ کلکتہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر رنجن داس نے اپنے افتتاحی خطاب میں کہا کہ ہندوستانی زبانیں اور تہذیب و کلچر نے ان دونوں زبانوں سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔ ہندوستان کی کلچر کی گہرائی میں ان دونوں زبانوں کے اثرات موجود ہیں۔ کلکتہ یونیورسٹی کے سابق پروفیسر اور اردو اکادمی مغربی بنگال کے چیئرمین مناشاہ القادری نے کہا کہ عربی و فارسی کا تعلق بھی ہندوستان کی سرزمین سے ہے۔ ان دونوں زبانوں نے اس ملک کی تعمیر میں کافی اہم رول ادا کیا ہے۔ کلکتہ یونیورسٹی میں منعقد سیمینار سے پروفیسر جہانگیر اور کلکتہ یونیورسٹی کے شعبہ عربی کے صدر پروفیسر اشارت علی ملا نے بھی خطاب کیا۔ اس موقعے پر اے ایم یو اولڈ بوائز کے جنرل سکریٹری انجینئر وقار احمد خان، دارالعلوم اسراریہ سنتوش پور کے مولانا نوشیر احمد، صابر علی، عطاء اللہ خان، قاری علی مرتضیٰ، مولانا نظام الدین وغیرہ موجود تھے۔ روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 25 فروری 2014

اعزاز و اکرام:

مجیب شہزر کو شہریار ایوارڈ

علی گڑھ: علی گڑھ کے ممتاز شاعر ڈاکٹر مجیب شہزر کو ان کی ادبی خدمات کے لیے اترپردیش کے صوبائی سطح

کے باوقار ایوارڈ 'شہریار ایوارڈ 2014' سے سرفراز کیا گیا ہے۔ مجیب شہزر کو یہ ایوارڈ علی گڑھ کی تاریخی صوبائی صنعتی و زرعی نمائش کی اختتامی تقریب میں ممتاز کو ہی پدم بھوشن ڈاکٹر گوپال داس نیرج، ممبران اسمبلی ٹھاکر راکیش سنگھ، حاجی ضمیراللہ خاں، کمشنر ٹی وینکٹیش، ضلع مجسٹریٹ علی گڑھ شمیم احمد خاں نے پیش کیا۔ ایوارڈ کے طور پر ڈاکٹر مجیب شہزر کو ایک لاکھ ایک ہزار روپے کا چیک، ایک شال، توصیفی سند اور یادگاری نشان سے نوازا گیا۔ غور طلب ہے کہ ڈاکٹر مجیب شہزر کا شمار ملک کے نوجوان شعرا میں کیا جاتا ہے۔ اس سے قبل انھیں مختلف ادبی اور سماجی تنظیموں کی جانب سے 'تنویر ادب، کاویہ سمراٹ، شہزادۂ غزل اور نیر سخن' کے خطابات کے علاوہ دو درجن سے زائد ایوارڈس سے سرفراز کیا جاچکا ہے۔ روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 19 فروری 2014

مولانا ولی رحمانی کو مولانا عبدالجلیل نیشنل ایوارڈ

مونگیر: خانقاہ رحمانی مونگیر کے سجادہ نشین مفکر اسلام حضرت مولانا محمد ولی صاحب رحمانی کو ان کی دینی، تعلیمی خدمات کی بنیاد پر ایوارڈ پیش کیا گیا، یہ ایوارڈ انھیں سلچر آسام میں ندوۃ التامیر کی جانب سے دیا گیا۔ مولانا عبدالجلیل نیشنل ایوارڈ کے نام سے موسوم یہ ایوارڈ ایک عظیم الشان اجتماع میں حضرت مولانا طیب الرحمٰن صاحب امیر شریعت آسام کے دست مبارک سے دیا گیا، جس میں صوبہ آسام کے تقریباً پانچ سو مدارس اور تعلیمی اداروں کے ذمہ دار شریک ہوئے، اس موقعے پر اجلاس عام میں پچاس ہزار سے زائد کا مجمع تھا۔ یہ ایوارڈ حضرت مولانا محمد ولی صاحب رحمانی کو ان کی دینی، تعلیمی، اصلاحی خدمات کی وجہ سے دیا گیا۔ روزنامہ 'سیاسی تقدیر' دہلی، 18 فروری 2014

تحسین منور کو اعزاز

دھرادون: جرنلسٹ ایسوسی ایشن آف الیکٹرانک اینڈ پرنٹ اتراکھنڈ کی جانب سے منعقدہ ایک پروگرام میں اتراکھنڈ کے وزیراعلیٰ ہریش راوت نے معروف صحافی تحسین منور کو اردو صحافت اور میڈیا میں ان کی خدمات کے اعتراف کے طور پر مدن موہن ورما یادگاری اعزاز 2014 سے نوازا۔ اس موقعے پر لوک سوامی گروپ کے چیف ایڈیٹر جتندر سونی اور آئی اے ایس ای ڈیمڈ یونیورسٹی سردار شہر راجستھان کے چانسلر کنک مل ڈگڑ اور اتراکھنڈ میں آئی قدرتی آفت کے دوران راحتی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے والے سرکاری افسران اور دیگر شہریوں کو بھی اعزازات عطا کیے گئے۔ بعد میں 'سماج میں ہم آہنگی کے قیام میں میڈیا کے رول' کے موضوع پر ایک بحث کا بھی انعقاد کیا گیا جس میں پریس کونسل آف انڈیا کے ممبر راجیو رنجن ناگ مہمان خصوصی تھے۔ مرحوم مدن موہن کی زندگی کے ہمدرد پہلو کو دنیا کے سامنے لانے اور میڈیا اور

اتراکھنڈ کے وزیراعلیٰ ہریش راوت کے ہاتھوں مدن موہن ورما یادگاری اعزاز حاصل کرتے ہوئے صحافی و شاعر تحسین منور

سماج میں عوامی خدمت کے جذبے کو فروغ دینے کی غرض سے یہ ایوارڈ دیے جاتے ہیں۔ روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 20 فروری 2014

حکیم اجمل خاں کو بھارت رتن قرار دیا جائے: آسکر فرنانڈیز

نئی دھلی: ملک کے مسلمان متحد ہوکر جب تک اپنی ترجیحات طے نہیں کریں گے تب تک ان کی بات نہیں سنی جائے گی۔ جس دن مسلمان ایک سے دس تک اپنی ترجیحات طے کرلیں گے اس دن ان کی بات بھی سنی جائے گی اور مطالبات بھی تسلیم ہوں گے۔ مرکزی وزیر برائے اقلیتی امور کے رحمٰن خان نے انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر میں حکیم اجمل خان میموریل سوسائٹی اور ریکس ریمیڈیز کے اشتراک سے منعقد تقریب میں تقسیم حکیم اجمل خان میموریل گلوبل ایوارڈ 2013 کے موقعے پر بطور مہمان خصوصی اپنی تقریر میں کہی۔ مرکزی وزیر برائے محنت آسکر فرنانڈیز نے کہا کہ وہ اس مطالبہ سے اتفاق کرتے ہیں کہ حکیم اجمل خان کو بھارت رتن ایوارڈ سے نوازا جانا چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ حکیم اجمل خان کو یہ اعزاز طب یونانی کا اور خود ہمارا اپنا اعزاز ہوگا۔ حکیم اجمل خاں کے قائم کردہ طبیہ کالج کو یونیورسٹی کا درجہ دینے اور اسے حکیم صاحب کے نام سے منسوب کرنے کے مطالبہ پر انھوں نے کہا کہ وہ اس سمت میں پیروی کریں گے۔ انھوں نے کہا کہ وزیر صحت غلام نبی آزاد کا بھی اس میں کافی دلچسپی ہے۔ روزنامہ راشٹریہ سہارا کے گروپ ایڈیٹر سید فیصل علی نے کہا کہ حکیم اجمل خان نے ملک میں ہندو مسلم اتحاد کی جو مثال پیش کی وہ کہیں اور دیکھنے کو نہیں ملتی۔ انھوں نے کہا کہ میں اس مطالبہ کی تائید کرتا ہوں حکیم اجمل خان کو بھارت رتن دیا جانا چاہیے۔ صدارتی تقریر میں ڈاکٹر ایس فاروق نے کہا کہ حکیم اجمل خان نے نہ صرف طب یونانی کو فروغ دیا، بلکہ حب الوطنی کا پیغام بھی دیا۔ سوسائٹی کے صدر ڈاکٹر ایس پی بھٹناگر نے استقبالیہ کلمات ادا کیے، جب کہ جنرل سکریٹری نے سالانہ رپورٹ پیش کرتے ہوئے وزرا سے مطالبہ کیا کہ حکیم اجمل خان کو بھارت رتن دیا جائے اور طبیہ کالج کو

یونیورسٹی کا درجہ دیتے ہوئے اسے حکیم اجمل خان کے نام سے منسوب کیا جائے۔ اس موقعے پر انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر کے صدر سراج الدین قریشی اور نائب صدر صفدر ایچ خان کو بھی اعزاز سے نوازا گیا۔ اس موقعے پر بہت سے شخصیات کو حکیم اجمل خان میموریل گلوبل ایوارڈ سے نوازا گیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 12 فروری 2014

ٹی وی جرنلسٹ نصر الحسن کو حالی ایوارڈ

نئی دہلی: آل انڈیا اکانومی سروے ایوارڈ کونسل کی جانب سے سینئر ٹی وی جرنلسٹ نصر الحسن حالی کو شائننگ امیج آف انڈیا گولڈ میڈل ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا، اس ایوارڈ تقریب کا اہتمام دہلی کے ہوٹل کناٹ میں 23 فروری کی شام کو کیا گیا، اس موقعے پر آل انڈیا اکانومی سروے ایوارڈ کونسل کے چیئرمین ایس این سامنتا رائے، معروف فلم اداکار رضا مراد، کرن کمار، مرکزی ایگریکلچرل منسٹری کے ایڈیشنل کمشنر ڈاکٹر ایم تامل سیلون، اڈیشہ حکومت میں شعبہ سیاحت کے ڈائریکٹر مسٹر، جواہر لال ٹیکنیکل یونیورسٹی میں اسکول آف اڈیشہ ہائی کورٹ کے سابق چیف جسٹس ڈاکٹر آئی ایم قدوسی نے جہاں اکسلینس لیڈرشپ ایوارڈ 2014 کی اہمیت پر روشنی ڈالی وہیں انھوں نے نصر الحسن حالی کی پیشہ ورانہ صلاحیتوں کو بھی سراہا۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس'، دہلی، 28 مارچ 2014

شمیم دیوبندی کو شردھا ایوارڈ

دیوبند: ریاست ہریانہ کے امبالہ سے شائع ہونے والے ماہانہ رسالہ کے جنوری کے شمارے میں معروف شاعر ڈاکٹر شمیم دیوبندی کی کہانی 'صدمہ' کو پہلا مقام حاصل ہوا ہے اور اس کے لیے ڈاکٹر شمیم دیوبندی کو 'شردھا ایوارڈ' سے نوازا گیا ہے۔ اس بابت ڈاکٹر شمیم دیوبندی کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے معروف کالم نگار کمل دیوبندی نے کہا کہ ڈاکٹر شمیم دیوبندی کی تخلیقات مسلسل ملک کے اخبارات اور رسالہ میں شائع ہوتی ہیں جوان کی بہترین کاوشوں اور محنتوں کا نتیجہ ہے انھوں نے کہا کہ دیوبند کی نوجوان نسل کو قلمی میدان میں بھی آگے آنا چاہیے۔ شاعر ماسٹر شمیم کرت پوری نے کہا کہ ان کی کہانیاں سماج کی اصلاح میں ایک بہترین کوشش ہے، جس کے لیے یقیناً ڈاکٹر موصوف مبارکباد کے مستحق ہیں۔ انھوں نے کہا کہ 'صدمہ' ایک بہترین کہانی ہے جو سماج کی بہترین عکاسی کرتی ہے۔ علاوہ ازیں ڈاکٹر ایس اے عزیز، ماسٹر ممتاز نسیم انصاری ایڈوکیٹ، نجم عثمانی، ڈاکٹر صادق دیوبندی، ڈاکٹر منیش گپتا، چاند انصاری، ڈاکٹر نوشاد علی، ڈاکٹر کاشف اختر، انجم دیوبندی، معروف ادیب عبداللہ عثمانی، عبداللہ راز، ڈاکٹر فرمان علی، پشپیندر کمار، ڈاکٹر دلشاد احمد، عبدالسمیع، حسین احمد، شعیب قریشی، ڈاکٹر شارق وغیرہ نے ڈاکٹر شمیم دیوبندی کو اس بہترین تخلیق کے لیے مبارکباد پیش کی۔

روزنامہ 'عزیز الہند' دہلی، 28 فروری 2014

غلام نبی خیال کو 'خیال قلم' پر اعزاز

پٹنہ: بہار اردو اکادمی نے ریاست کشمیر کے نامور شاعر، ادیب، محقق اور صحافی غلام نبی خیال کو ان کی اردو تصنیف 'خیال قلم' کے لیے پہلے انعام سے نوازا گیا۔ بطور انعام 10 ہزار روپیہ نقد کے ساتھ توصیف نامہ بھی دیا گیا۔ واضح رہے کہ بہار اردو اکادمی ہر سال بہترین کتب کے لیے یہ انعام دیتی ہے۔ اس سال اکادمی نے تین درجن سے زائد کتابوں کو انعام کے لیے انتخاب کیا۔ خیال صاحب کو کئی زبانوں پر مہارت حاصل ہے، خصوصاً کشمیری، اردو اور انگریزی قابل ذکر ہیں۔

پریس ریلیز، غلام نبی خیال، کشمیر، 3 مارچ 2014

شمس دیوبندی کو وقار سخن اعزاز

دیوبند: دیوبند کے معروف شاعر شمس دیوبندی کے اعزاز میں منگلور چوکی پر واقع وینکٹ ہال میں ایک مشاعرہ کا انعقاد کیا گیا۔ مشاعرے کی نظامت کے فرائض گلزار جگر بیگ نے انجام دیے، اس موقعے پر شمس دیوبندی کو 'وقار سخن' ایوارڈ سے نوازا گیا، مشاعرے میں شمس دیوبندی، ارشد ضیا مظفر نگر، اسلم محسن سہارنپوری، ماہرہ سحر دہلوی، علیم واجد روڑکوی، لتا ناز میرٹھی، عبداللہ راز، افضال جھنجھانوی، ندیم شاد دیوبندی، امجد آتش کھتولوی، شمیم کرت پوری، برکت ہولٹ، مسرور اجمل، راشد کمال، چوکس دیوبندی، ولی دیوبندی، بدرالاسلام گوہر، نفیس دیوبندی وغیرہ نے اپنا کلام پیش کیا۔ آخر میں مشاعرہ کنوینر عبداللہ راز نے مہمانوں اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 14 فروری 2014

رسم اجرا:

ڈاکٹر جی آر سید کی 7 کتابوں کا اجرا

نئی دہلی: عالمی کتاب میلے میں عرشیہ پبلی کیشنز کے اسٹال پر جی آر سید کی بیک وقت 7 کتابوں کا اجرا عمل میں آیا۔ اس موقعے پر افتتاحی کلمات پیش کرتے ہوئے جامعہ ملیہ اسلامیہ انور جمال قدوائی ماس کمیونی کیشن ریسرچ سینٹر کے ڈائریکٹر عبید صدیقی نے ڈاکٹر جی آر سید کا تعارف کرایا۔ پرگتی میدان کے ہال نمبر 14 کے اسٹال نمبر 100 پر آج کی اس اجرائی تقریب میں اردو ادب کے معروف ادیب و دانشور نے شرکت کی۔ معروف فکشن نگار انکم ٹیکس کمشنر دہلی سید محمد اشرف نے کہا کہ ڈاکٹر جی آر سید کے افسانوی مجموعے نے اردو ادب میں افسانہ کی روایت کو جلا بخشی ہے۔ ان کی تحریروں میں بلا کی جاذبیت اور دوررسی ہے۔ انھوں نے جس میدان میں اپنی توجہ مرکوز کی ہے اس کا حق ادا کیا ہے۔ پروفیسر ابن کنول نے کہا کہ بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ کسی مصنف کی 7 کتابوں کا ایک ساتھ اجرا ہو۔ اس موقعے پر سید شاہد مہدی، ایس ایم خان، مشرف عالم ذوقی، اظہار ندیم، ڈاکٹر سید رضا حیدر کے علاوہ بڑی تعداد میں اردو ادب کے شائقین نے شرکت کی۔ دوسری طرف ساہتیہ منچ کے تحت اردو کے کہانی نویس (شارٹ اسٹوریز) کے درمیان ادبی تبادلہ خیال کے موقعے پر معروف بزرگ ادیب رتن سنگھ، غضنفر علی، ڈاکٹر خالد جاوید اور پروفیسر ارتضیٰ کریم شریک تھے۔ ہال نمبر 14، اسٹال نمبر 99 پر اردو کے مذہبی قارئین کی خاصی بھیڑ نظر آئی۔ امام احمد رضا اکادمی کے نام سے لگائے گئے اس اسٹال میں مذہب سے متعلق چھوٹی چھوٹی کتابوں سمیت اردو کی تحقیقی کتابیں بھی دستیاب تھیں۔ اس اسٹال کی اہم خصوصیت یہ تھی کہ یہاں اسلامی اسکالروں کی تحریر کردہ نئی کتابوں کا ایک بڑا ذخیرہ تھا۔ امام احمد رضا قادری کے کئی مخطوطے بھی نمائش کے لیے رکھے گئے تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 20 فروری 2014

سولوڈراموں کا مجموعہ 'عزازیل'

سولاپور: سولاپور کے جواں سال شاعر و ڈرامہ نگار جناب علاء الدین طالب سولاپوری کے سولوڈراموں کا مجموعہ عزازیل کی رسم اجرا بتاریخ 27 جنوری 2014 بروز پیر سوشل اردو ہائی اسکول شولاپور میں معروف شاعر بشیر پرواز، (صدر بزم غالب) کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ سوشل اردو ہائی اسکول کے زیر اہتمام جس کی صدارت مدرسۂ ہذا کے صدر مدرس جناب عبدالجبار شیخ نے کی۔ بطورِ مہمان خصوصی پرنسپل ہارون رشید باغبان، آصف اقبال، شریک تھے۔ عزازیل طالب سولاپوری کی ایسی کتاب ہے جس میں سماج میں پھیلی ہوئی ان تمام برائیوں کی داستان ہے جو ہر ایک کے خون میں سرایت کر کے عزازیل کو قوت بخش رہی ہے۔

بذریعہ ڈاک، سلطان اختر، سولاپور 27 جنوری 2014

شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ٹیگور ریسرچ اینڈ ٹرانسلیشن اسکیم کے زیر اہتمام کتابوں کا اجرا کا ایک منظر

تارے انگارے

سیانہ: گنپت میرج ہال میں ممتاز استاد شاعر جمیل مظہر سیانوی کے مجموعۂ کلام 'تارے انگارے' کے اجرا کے موقعے پر 'بلند نیوز' ٹی وی چینل کے زیر اہتمام منعقدہ عظیم الشان کل ہند مشاعرہ کی صدارت کررہے تھے۔ 'تارے انگارے' کا اجرا کرتے ہوئے شمس رمزی نے کہا کہ جمیل مظہر سیانوی نے غزل کو نئی جہت سے روشناس کرانے کے ساتھ اسے عوامی سطح پر لانے کا عظیم کارنامہ انجام دیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ جمیل مظہر نے غزل کو خواص سے نکال کر عوام کے حوالہ کیا ہے جو صرف اور صرف انھی کا حصہ ہے۔ نظامت کے فرائض انجام دیتے ہوئے اویس جمال شمسی نے کہا کہ جمیل مظہر سیانوی نے اپنی تخلیقات میں جس زبان اور جن مضامین کا استعمال کیا ہے وہ انھیں دوسرا نذیر اکبرآبادی ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں۔ پروگرام کے کنوینر اور بلند نیوز کے بیورو چیف اظہار احمد نے حاضرین کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ ان کا چینل اردو زبان وادب کے فروغ کے لیے ہمہ وقت حاضر ہے۔

روزنامہ 'جدید خبر' دہلی، 6 فروری 2014

چار ترجمہ شدہ کتابیں

نئی دھلی: ٹیگور ریسرچ اینڈ ٹرانسلیشن اسکیم کے زیر اہتمام اردو میں ٹیگور شناسی کے حوالے سے چار اہم اور تحقیقی کتابوں کی رسم اجرا کے دوران جامعہ ملیہ اسلامیہ کے کارگزار وائس چانسلر پروفیسر سید محمد ساجد نے شعبہ کے اس تحقیقی کام پر خوشی کا اظہار کیا۔ انھوں نے کہا کہ ترجمے اور تحقیق میں نہایت دلسوزی اور دقت نظر کی ضرورت ہوتی ہے۔ ترجمہ کرنا اصل متن سے کہیں زیادہ مشکل کام ہے اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کی روایت ترجمہ و تحقیق کے حوالے سے نہایت دلچسپی رہی ہے۔ ہمارے لیے باعث فخر ہے کہ شعبہ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ میں وزارت ثقافت حکومت ہند کے ذریعے مفوضہ ٹیگور ریسرچ اینڈ ٹرانسلیشن اسکیم کے زیر اہتمام ٹیگور پر ترجمہ اور تحقیق کا کام نہایت ہی منظم ڈھنگ سے انجام دیا جارہا ہے۔ شمیم طارق کی کتاب 'ٹیگور شناسی' ٹیگور کی شہرہ آفاق کتاب 'گیتانجلی (منظوم اردو ترجمہ: ڈاکٹر سہیل احمد فاروقی) پروفیسر وہاج الدین علوی اور پروفیسر شہزاد انجم کی مرتبہ کتابیں 'رابندرناتھ ٹیگور: شاعر اور دانشور' اور 'رابندرناتھ ٹیگور: فکر وفن کے ہزار رنگ' کا اجرا عمل میں آیا۔ مہمان خصوصی پروفیسر شمیم حنفی نے کہا کہ رابندرناتھ ٹیگور، مہاتما گاندھی اور علامہ اقبال انسان دوستی کے پیغامبر تھے۔ ان تینوں کے یہاں انسان دوستی کے جذبات مشترک تھے۔ ٹیگور جیتے جی لیجنڈ بن گئے۔ وہ بیسویں صدی کی تاریخ کے مکمل انسان تھے۔ ماضی اور مستقبل کو دیکھنے کا ان کا انداز اور ان کا احساس بالکل جدا تھا۔ مہمان اعزازی سید فیصل علی نے کہا کہ موجودہ علمی اور ادبی اور سیاسی اور سماجی تناظر میں رابندرناتھ ٹیگور پر ترجمہ اور تحقیق کا کام شعبہ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ میں کیا جانا لائق تحسین ہے۔ اس موقعے پر جامعہ کے پروفیسران حضرات، بڑی تعداد میں طلبہ اور ریسرچ اسکالرز بھی موجود تھے۔ روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 2 مارچ 2014

شہریار کے کلیات کا اجرا

ممبئی: شعبۂ اردو ممبئی یونیورسٹی اور اے ایم یو اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے اشتراک سے معروف جدید شاعر شہریار کے کلیات 'سورج کو نکلتا دیکھوں' پر منعقدہ سمپوزیم کے صدر ڈاکٹر محمود الرحمٰن نے کہا کہ شہریار کی شاعری میں عصری حسیت پورے آب وتاب کے ساتھ جلوہ گر نظر آتی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ زمین سے جڑے شاعر تھے۔ پروگرام میں معروف فلم رائٹر جاوید صدیقی اور انکم ٹیکس کمشنر ابرار احمد نے مہمانان اعزازی کے طور پر شرکت کی۔ جاوید صدیقی نے شہریار سے اپنے بہترین نمونہ کہی جاسکتی ہے۔ مشہور فلم ڈائرکٹر اور سماجی کارکن مہیش بھٹ نے کہا کہ شہریار کی شاعری میں عصر حاضر کے سماج کا پرتو واضح نظر آتا ہے۔ پروفیسر صاحب علی نے کہا کہ وہ ایک بیدار ذہن اور حساس انسان تھے۔ سمپوزیم میں عبدالاحد ساز، ڈاکٹر جمال رضوی اور شہزاد انجم برہانی نے مقالات پیش کیے۔ پروگرام میں شعبۂ اردو کی کارگزار سربراہ ڈاکٹر معزہ قاضی، اساتذہ ڈاکٹر عبداللہ امتیاز اور قمر صدیقی کے علاوہ ایسوسی ایشن کے صدر پرنسپل ایس این کاظمی، پروفیسر یونس اگاسکر، ایڈوکیٹ زبیر اعظمی، ڈاکٹر مسعود وغیرہ موجود تھے۔ روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 18 فروری 2014

بڑی باتیں

نئی دھلی: بھگوان داس روڈ واقع انڈین لا انسٹی ٹیوٹ میں ایم طاہر جو دہلی ایڈورٹائزنگ دنیا کی معروف شخصیت ہیں اور فی الوقت ممبئی کی ایڈورٹائزنگ ایجنسی، انٹرپبلیسٹی پرائیویٹ لمیٹڈ کی دہلی برانچ میں 'کریئیٹو ڈائریکٹر' کی حیثیت سے مصروف کار ہیں، کی دوسری کتاب 'بڑی باتیں' کا اجرا عمل میں آیا۔ جن حضرات نے اس موقعے پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ان میں پروفیسر سید ضمیر حسن دہلوی، عالم نقوی، گروپ ایڈیٹر اودھ نامہ لکھنؤ جو خاص طور سے شرکت کے لیے لکھنؤ سے آئے تھے، معروف و مشہور صحافی معصوم مرادآبادی، عارف اقبال، مدیر اردو بک ریویو شامل ہیں۔ بڑی باتیں عصری تناظر میں ذہنی کھڑکیوں کو کھولتی ایک منفرد کتاب ہے۔ خصوصاً بچوں کے لیے جنھیں روزمرہ کی ہونے والی ثقافتی تبدیلیوں سے آگاہ کرتا ہے۔ روزنامہ 'جدید خبر' دہلی، 23 فروری 2014

کلیاتِ نشاط

دیوبند: دارالعلوم دیوبند کے سابق نائب مفتی اور شعر وادب کی دنیا کے مستند شاعر مولانا مفتی کفیل الرحمٰن نشاط کے مجموعۂ کلام 'کلیاتِ نشاط' کے رسم اجرا کی تقریب کا انعقاد محمود ہال میں مولانا مدنی روڈ پر کیا گیا۔ اس موقعے پر اپنے صدارتی خطاب میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے رکن اور مفتی اعظم پنجاب مولانا فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی نے کہا کہ علم کے ساتھ عمل بہت کم لوگوں میں پایا جاتا ہے اور جو لوگ اس پر عمل پیرا رہتے ہیں وہ دونوں جہان میں کامیاب وکامران ہوتے ہیں۔ پروگرام کے مہمان ذی وقار آل انڈیا ریڈیو اور ٹی وی ڈائریکٹر انجم عثمانی نے کہا کہ مفتی کفیل الرحمٰن کا نام کئی اور حوالوں سے لائق احترام ہے۔ شاعری کے حوالے سے بھی انھوں نے گزشتہ دو دہائیوں میں ایک نمایاں مقام بنایا اور اب ان کے شاعرانہ رنگ انفرادیت کی اس منزل پر آپہنچا ہے جہاں فنکار بجا طور پر 'صاحب اسلوب' کہلانے میں حق بجانب ہوتا ہے۔ ماہنامہ ترجمان دیوبند کے مدیر مولانا ندیم الواجدی نے کہا کہ آج خوشی اور غم دونوں کا موقع ہے۔ غم اس بات کا کہ وہ آج ہمارے درمیان نہیں ہے، خوشی اس بات کی ہے ان کا مجموعہ کلام منظر عام پر آیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ مفتی نشاط نظم کے ساتھ ساتھ بہتر نثر نگار بھی تھے۔ روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 25 فروری 2014

'نیا دور' کا ترقیات نمبر

لکھنؤ: اقلیتوں کے اقتصادی، تعلیمی اور سماجی ترقی کے لیے موجود ریاستی حکومت کے ذریعہ کئی اہم فیصلہ کیے گئے ہیں۔ ریاستی حکومت کی اسکیموں اور پروگراموں کا فائدہ اقلیتی طبقہ حاصل کررہا ہے۔ ریاستی حکومت اردو زبان اور ادب کی ترقی کے تئیں بھی پرعزم ہے۔ اترپردیش کے وزیراعلیٰ جناب اکھلیش یادو کل ودھان بھون میں محکمہ اطلاعات ورابطہ عامہ کے ذریعہ شائع ہونے والا رسالہ نیا دور کے ترقیات نمبر کے اجرا کے موقعے پر اپنے خیال کا اظہار کررہے تھے۔ ودھان سبھا اسپیکر جناب ماتاپرساد پانڈے، وزیر شہری ترقیات جناب محمد اعظم خاں، وزیرتعمیرات عامہ جناب شیوپال یادو کی موجودگی میں وزیراعلیٰ نے کہا کہ ادیب وشاعر سماج کے مسائل کو اجاگر کرتے ہیں۔ روزنامہ 'جدید خبر' دہلی، 22 فروری 2014

وفیات

علی امام نقوی کا انتقال

نئی دہلی: اردو کے معروف افسانہ نگار علی امام نقوی کا ممبئی میں انتقال ہوگیا۔ وہ کچھ عرصے سے علیل تھے۔ مرحوم کے پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ 2 بیٹے اور 3 بیٹیاں ہیں۔ علی امام نقوی کے والدین اُترپردیش میں ضلع میرٹھ کے قصبہ عبداللہ پور کے رہنے والے تھے۔ ان کے والد نوجوانی میں ہی ممبئی چلے گئے تھے، لہٰذا

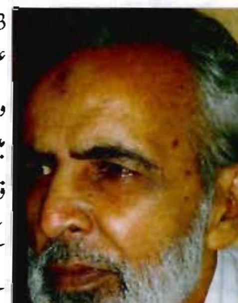

علی امام نقوی کی تعلیم ہی ہوئی۔ علی امام نقوی نے ستر کی دہائی میں افسانہ نگاری شروع کی اور ان کا پہلا افسانوی مجموعہ 'نئے مکان کی دیمک' 1980 میں ممبئی سے شائع ہوا تھا۔ 1985 میں نئے اردو افسانے کی شناخت کے سلسلے میں جب پروفیسر گوپی چند نارنگ نے دہلی میں ایک عظیم الشان سیمینار کا انعقاد کیا تو اُس میں بھی علی امام نقوی نے اپنے ممبئی کے کئی افسانہ نگار ساتھیوں کے ساتھ شرکت کی تھی۔ علی امام نقوی کا دوسرا افسانوی مجموعہ 'مباہلہ' 1988 میں شائع ہوا۔ 1991 میں علی امام نقوی کا پہلا ناول 'تین بتی کے راما' منظرعام پر آیا۔ ان کا تیسرا افسانوی مجموعہ 'گھٹتے بڑھتے سائے' 1993 میں شائع ہوا اور اس کے بعد چوتھا افسانوی مجموعہ 'موسم عذابوں کا' 1998 میں اِسی ادارے سے شائع ہوا۔ علی امام نقوی کا دوسرا ایک اہم ناول 'بساط' 2000 میں اور پانچواں افسانوی مجموعہ 'کہی ان کہی' دہلی سے شائع ہوئے۔ ان کے انتقال سے نہ صرف اردو افسانے میں ایک خلا پیدا ہوگیا ہے بلکہ پورے اردو ادب میں ان کی کمی کو ہمیشہ محسوس کیا جاتا رہے گا۔ روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 11 مارچ 2014

امرکانت کا انتقال

الٰہ آباد: ہندی اردو کے صفِ اول کے افسانہ اور ناول نگار امرکانت کا 89 برس کی عمر میں آج انتقال ہوگیا۔ وہ

متعدد افسانوی مجموعے اور ناول کے خالق تھے۔ ان کو پہلے سویت یونین کا ایوارڈ اور اس کے بعد ملک کا سب سے بڑا ایوارڈ گیان پیٹھ سے نوازا گیا تھا۔ وہ انجمن ترقی پسند مصنّفین سے وابستہ تھے اور پریم چند کے افسانوی روایت کے امین تھے۔ وہ اردو اور ہندی دوستی کے علمبردار تھے۔ ان کے انتقال سے نہ صرف ہندی کے ادیب بلکہ اردو دنیا کے ادیبوں میں رنج وغم کی لہر دوڑ گئی ہے۔ امرکانت اپنے پیچھے دو بیٹے ارون وردھن، اروند بندو اور بیٹی سندھیا سمیت بھراپورا کنبہ چھوڑ گئے ہیں۔ پروفیسر علی احمد فاطمی نے ان کے انتقال پر رنج وغم کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ پریم چند اسکول کا آخری چراغ بھی گل ہوگیا۔ سابق ایڈووکیٹ جنرل ایس ایم کاظمی نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ امرکانت ہندوستانی تہذیب وادب کے بہترین نمائندہ تھے۔ ڈاکٹر فخرالکریم نے کہا کہ وہ زندگی میں جس قدر سادہ تھے۔ روزنامہ 'انقلاب' دہلی 18 فروری 2014

شاہ فدائی دہلوی

نئی دہلی: دہلی کے بزرگ ومعروف شاعر محمد ادریس شاہ فدائی دہلوی کا کل دیررات طویل علالت کے بعد 87 کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ وہ گزشتہ کافی عرصے سے سانس کے مرض میں مبتلا تھے۔ کل دیررات انھوں نے اپنے مکان چھتہ چوہیا میم، فراش خانہ دہلی میں آخری سانس لی۔ ان کی پیدائش 1925 میں دہلی میں ہوئی تھی۔ انھیں لڑکپن کی عمر سے ہی شاعری کا شوق تھا۔ ان کے کئی شعری مجموعے 'آواز کی لکیریں' اور 'شعلہ جاں' منظرعام پر آئے اور ایک دیوان بھی شائع ہوا۔ انھیں بہت سے اعزازات سے نوازا جاچکا ہے۔ دہلی اردو اکادمی نے بھی انھیں بہترین شاعر کے ایوارڈ سے نوازا گیا۔ پسماندگان میں 7 بیٹے شامل ہیں۔ روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 12 فروری 2014

ڈاکٹر طاہر رزاقی

سنبھل: قومی سطح کے شہرت یافتہ شاعر وادیب ڈاکٹر طاہر رزاقی طویل عرصے سے برین ٹیومر کی وجہ سے زیرعلاج تھے، پیر کی صبح ان کا انتقال ہوگیا، وہ 58 برس کے تھے۔ ان کی تدفین آبائی قبرستان میں عمل میں آئی۔ ان کے جنازہ میں شہر کی سیاسی، ادبی اور علمی شخصیات نے شرکت کی۔ واضح ہو کہ مرحوم محلہ سرائے ترین واقع مدرسہ ضیاءالعلوم میں مدرس تھے۔ ڈاکٹر طاہر رزاقی کے انتقال پر مصور سبزواری ادبی سوسائٹی اور ڈاکٹر عندلیب شادانی اردو اکادمی میں تعزیتی میٹنگ کا انعقاد ہوا، جس میں شہزاد احمد، شمیم فاطمہ ایڈووکیٹ، شفیق برکاتی وغیرہ نے شرکت کی۔ ان کے انتقال کی خبر ملتے ہی سرائے ترین کے کئی اسکول و کالجوں میں تعطیل کا اعلان کردیا گیا، جب کہ سابق وزیر عقیل الرحمٰن خان اور سابق اردو اکادمی چیئرپرسن ترنم عقیل بھی اظہار تعزیت کے لیے پہنچے۔ اس کے میموریل ڈگری کالج کے شعبہ اردو میں بھی تعزیتی اجلاس کا انعقاد کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 25 فروری 2014

خراج عقیدت

نفیس سنبھلی پر ادبی جلسہ

سنبھل: ایم جی ایم کالج میں اردو محکمہ کی طرف سے ایک روزہ سیمینار کا انعقاد کیا گیا جس میں نفیس سنبھلی کے افسانوں کا جائزہ لیا گیا۔ نفیس سنبھلی فن اور فنکار موضوع پر منعقد سیمینار کا آغاز بی اے کی طالبہ ریشہ بیگم نے نعت کے ساتھ کیا، طالبہ صدرہ شمیم نے نفیس سنبھلی پر تحقیقی مقالہ پیش کیا۔ ڈاکٹر عزیز اللہ خاں نے اپنے تحقیقی مقالے میں نفیس سنبھلی کی زندگی اور شخصیت پر روشنی ڈالی، فرقان سنبھلی نے بتایا کہ پریم چند کی طرح نفیس سنبھلی نے دیہی الفاظ کو بھی خوبصورت طریقے سے پیش کیا ہے، کشمیر یونیورسٹی سے آئے ڈاکٹر راشد عزیز نے روہیل کھنڈ کے جغرافیائی منظرنامے پر روشنی ڈالی، انتظامی کمیٹی کے چیئرمین سنجے اگروال نے نفیس سنبھلی کو سنبھل کا اعزاز بتایا۔ کلیدی مہمان ڈاکٹر تسنیم فاطمہ نے کہا کہ نفیس سنبھلی کی کہانیاں ذہن کو بیدار کرنے کی اچھی کوشش ہے، پروگرام کی صدارت کررہے ڈاکٹر عابد حسین حیدر نے کہا کہ اس سیمینار سے سنبھل کے قصہ نگاروں کو الگ شناخت ملے گی۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 27 فروری 2014